قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

www.urducouncil.nic.in

اکتوبر 2013، قیمت -/15

ماہنامہ

اُردو دُنیَا

دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:15، شمارہ:10، اکتوبر 2013

مدیر: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا
انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: منظر سبحانی

قیمت-/15 روپے، سالانہ -/150 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
(شعبۂ ادارت: 49539009)

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in
email: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7
آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 26109746
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 1-5، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات — 2

خطوط
آپ کی بات — قارئین کے خطوط — 3

انٹرویو
علامت لفظ کی معراج ہے: حسین الحق — شاہد اختر — 8

کور اسٹوری
اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان (بین الاقوامی اردو کانفرنس کی روداد) — عبدالحی — 11
معاملاتِ اردو — سید محمد اشرف — 16
قرارداد بین الاقوامی اردو کانفرنس — ادارہ — 20
بین الاقوامی مشاعرہ — ادارہ — 23

زبان و تعلیم
قانون حق تعلیم اور ہمارا سماجی رویہ — ریاض احمد — 25

ادبی مباحث
ادب اور اساطیر — سیدہ جعفر — 28
ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تیسرا اجلاس — منظر اعجاز — 31
سرسید کی تاریخ نگاری — معظم الدین — 34
مرثیہ کی خواندگی کا فن — مرزا شفیق حسین شفق — 37

خراج عقیدت
لطف الرحمٰن کا نظریۂ شعر و ادب — مشتاق احمد — 39

شخصیت
مخمور سعیدی کی شخصیت — رام پرساد مینا — 42

مشاہیر ادب/نظم
میرزا یگانہ چنگیزی — ادارہ — 44
انتخاب یگانہ چنگیزی — 45

مشاہیر ادب/نثر
ساجد رشید — ادارہ — 48
راکھ — ساجد رشید — 49

ہم نے جنھیں بھلا دیا
حکیم اجمل خاں شیدا کی ادبی خدمات — خالد انجم عثمانی — 52

ہماری مطبوعات
ہندوستان میں عدلیہ کا تاریخی پس منظر — خواجہ عبدالمنتقم — 54

کریئر گائڈ
اپنے کریئر کا کریں انتخاب — سید فخر امام — 57

دوسری زبانوں سے
دھواں (گجراتی افسانہ) — ایلا مہتہ — مترجم: الطاف فاطمہ — 59

ماحولیات
ہماری واٹر پالیسی — جمال نصرت — 63

صحت
اختناق الرحم — مشرف علی — 65

فلم
خواجہ احمد عباس کی فلمیں — نثار احمد صدیقی — 68

سائنس
اسحاق نیوٹن: حیات اور کارنامے — شرجیل احمد خاں — 70

فکر و فلسفہ
مسلم فلسفہ اور اس کی اہمیت — علی مہدی — مترجم: شیبا حسن افتخار — 73

کتابوں کی دنیا
تبصرہ و تعارف — 75

اشتہار
مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن — 83

اردو کیمپس
یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں — ادارہ — 84

عالمی اردو نامہ
عالمی خبریں — ادارہ — 86

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 87

ہماری بات

4 ستمبر 2013 کے دن کو قومی اردو کونسل کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس روز نہ صرف یہ کہ کونسل نے اپنی پہلی بین الاقوامی اردو کانفرنس کا اہتمام کیا بلکہ افتتاحی جلسے میں حکومت کی بھرپور نمائندگی اور حصے داری کا وہ خوش نما منظر بھی دیکھنے کو ملا جو اس سے پہلے کبھی اردو کی کسی تقریب میں نہیں دیکھا گیا تھا۔ تین دن چلنے والی اس کانفرنس کا افتتاح کرنے کے لیے ہماری درخواست پر وزیر خارجہ حکومت ہند عالی جناب سلمان خورشید تشریف لائے، فروغ انسانی وسائل کے مرکزی وزیر عزت مآب ڈاکٹر ایم ایم پلّم راجو نے تقریب کی صدارت فرمائی، مہمان ذی وقار کے طور پر اسی وزارت کے جواں سال اور نہایت فعال وزیر مملکت عالی مرتبت جتن پرساد تشریف فرما رہے۔ انسانی وسائل کے فروغ کی وزارت کے سکریٹری عالی جناب اشوک ٹھاکر اور جوائنٹ سکریٹری محترم امنت کمار نے صرف اپنے منصب کی رعایت سے نہیں بلکہ ذاتی دل چسپی اور حوصلہ افزائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس شاندار کانفرنس کی کامیابی کو یقینی بنایا اور ڈائس پر موجود رہے۔

اردو زبان کے ایک اجتماع میں مرکزی حکومت کی اس غیر معمولی بھاری بھرکم موجودگی کا خوش گوار احساس سبھی کو ہوا اور بعض مقررین نے اپنی تقریروں میں بھی اس کا برملا اظہار کیا۔ ہندوستان کے علاوہ ایک درجن ملکوں سے آئے ہوئے، دنیا کے چار براعظموں، ایشیا، افریقہ، یوروپ اور امریکہ کی نمائندگی کرنے والے مہمان حیرت بھری خوشی سے اس منظر کو دیکھ رہے تھے کہ جس زبان کو وہ ہندوستان کی سب سے معتوب زبان سمجھتے آئے ہیں اس کی ترقی اور فروغ میں ملک کی حکومت کی دل چسپی کا یہ عالم ہے کہ جو وزیر بھی اظہار خیال کے لیے مائک پر آ رہا ہے وہ تالیاں بجوانے کے لیے اردو کی شیرینی اور مٹھاس کے قصیدے پڑھنے کی بجائے، اس زبان کی بنیادی تعلیم کو توسیع دینے کی تجویزوں اور منصوبوں پر بات کر رہا ہے! اس کے اساتذہ کے مسئلوں پر توجہ دے رہا ہے۔ اس کے سیکولر مزاج کو انڈر لائن کر رہا ہے اور اگر مقررین اردو زبان کے مستقبل کے بارے میں اپنے بعض تحفظات کا بھی بیان کر رہے ہیں تو حکومت کے یہ نمائندے سب کے سامنے کھلی دعوت دے رہے ہیں کہ آئیے، اپنی تجویزیں ہمیں دیجیے، ہماری خامیوں کی نشان دہی کیجیے اور ہمیں بتائیے کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے ہم اور بھی بہتر طریقے سے کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ یقین کیجیے، اس افتتاحی جلسے میں، جو جلسہ کم اور اردو کی کہکشاں زیادہ محسوس ہو رہا تھا اور جس میں مشرق و مغرب اور شمال و جنوب کی ساری سمتیں جگمگا رہی تھیں، خود ہم میزبانوں کی دلی کیفیات بھی سرخوشی و ممنونیت کے جذبات سے روشن تھیں۔ اس سہ روزہ کانفرنس میں کن موضوعات پر گفتگو ہوئی، کس نے کیا کہا، کس قسم کی تجاویز سامنے آئیں، مختلف ملکوں میں اردو کے تعلق سے کیا کچھ ہو رہا ہے، ادب کس سمت میں جا رہا ہے، اردو کے مقامی اور قومی مسئلوں پر کس کی کیا رائے ہے، یہ سب آپ اس شمارے کی کور اسٹوری میں تحریروں اور تصویروں کی زبانی تفصیل سے پڑھ سکیں گے۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا مقصود ہے کہ جس اردو کانفرنس کا ہم ان سطور میں ذکر کر رہے ہیں وہ کوئی نشستند و گفتند و برخواستند نہیں تھی۔ اس کانفرنس میں جو قراردادیں منظور ہوئیں وہ حکومت کے سامنے رکھی گئی ہیں ان پر جو بھی کارروائی ہوگی اسے باقاعدہ مانیٹر کیا جائے گا اور کوشش کی جائے گی کہ کم سے کم وقت میں ہم زیادہ سے زیادہ کام بہتر سے بہتر طور پر اردو زبان و ادب کے فروغ اور توسیع و ترویج کے لیے کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کانفرنس سے قومی اردو کونسل اور بھی طاقتور بن کر ابھری ہے، اور اس نے حکومت اور اردو والوں کے بیچ ایک پل کی نہیں بلکہ نئے منصوبوں کے لانچنگ پیڈ کی حیثیت اختیار کر لی۔ چنانچہ حقیقت یہ بھی ہے کہ کونسل کی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو گیا ہے، جن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کونسل کمربستہ ہے۔ اردو کانفرنس کے اختتام کو کئی ہفتے گزرے لیکن اس کی کامیابی سے جو خوشی کونسل کے سبھی کارکنوں کو ملی ہے وہ ابھی تک تازہ ہے اور ہمیں پورا بھروسہ ہے کہ آنے والے دنوں میں ہم اردو کے بڑھتے اور پھیلتے ہوئے کارواں کے اور زیادہ کام آسکیں گے۔

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

آپ کی بات

حسین الحق
سرسید کالونی، نیو کریم گنج، گیا

'اردو دنیا' کا تازہ شمارہ حسبِ سابق دیدہ زیب اور قابلِ مطالعہ ہے آپ لوگوں نے رسالے کو 'زندہ رسالہ' بنا دیا ہے۔ ایک پورا لسانی، تخلیقی، سائنسی اور ثقافتی منظرنامہ سامنے آجاتا ہے۔ 'نظریہ ارتقائے حیات'، 'سول سروسیز کے لیے نیا پیٹرن'، 'سنیما میں مردانہ بصری تسکین' اور 'ماحولیاتی آلودگی ایک بڑا مسئلہ' ایسے عنوانات ہیں جو آج کی پیچیدہ اور تکثیری دنیا میں خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ مشاہیر ادب کا ہر شمارے میں آپ تعارف کرا رہے ہیں یہ بھی ضروری اور قابلِ استقبال عمل ہے۔ اصغر علی انجینئر کی فکر کو خصوصی طور پر اور تفصیل سے متعارف کرانے کی ضرورت ہے۔ خصوصی طور پر ہندوستان کے اردو سماج کو اصغر علی انجینئر کے موقف اور روایت سے روشناس کرانا انتہائی ضروری اور صائب عمل ہے۔ ادبِ اطفال پر جو کوششیں اور پیش رفت قومی اردو کونسل سے ہو رہی ہیں یہ اردو زبان کی تاریخ میں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں۔ آپ لوگ اردو سماج کی نیو کو بچانے کا کام کررہے ہیں اور یقیناً یہ پہلا خواب خواجہ محمد اکرام نے دیکھا مگر اب تو ہم سب اس خواب کی تعبیر کے تمنائی ہیں۔

عارف اقبال
(ایڈیٹر 'اردو بک ریویو'، نئی دہلی)

ماہنامہ 'اردو دنیا' اپنے منفرد مشتملات کے سبب میرا پسندیدہ اردو رسالہ ہے۔ اس کی نئی شکل نے اس کے صوری حسن میں بھی بے پناہ اضافہ کردیا ہے۔ اس وقت میرے پیش نظر دو باتیں ہیں جس کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔ اول یہ کہ اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کا پندرہواں کل ہند میلہ (14 تا 22 ستمبر 2013) بنگلور میں منعقد ہونے کو ہے۔ افسوس کہ تازہ 'اردو دنیا' میں اس کتاب میلے کے سلسلے میں کوئی اعلان یا اشتہار نہیں ہے۔ حالانکہ NCPUL کے اس ترجمان میں اس بات کا خصوصی اہتمام ہونا چاہیے تھا کہ اس کے قارئین اس اہم event سے بروقت واقف ہوسکیں۔ دوسری بات یہ کہ اس موقر رسالے میں 'اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں' کے کالم میں جو خبریں شامل کی جاتی ہیں انھیں ایڈٹ نہیں کیا جاتا اور اخبارات کے حوالے سے خبروں کو جوں کا توں رسالے میں شامل کردیا جاتا ہے۔ اس سے رسالے کا وقار مجروح ہوتا ہے کیوں کہ موجودہ روزنامہ اخبارات کی زبان، اسلوب اور املا توجہ طلب ہے۔ خاص طور سے 'وفیات' کے کالم میں تحقیق کے بغیر اخباری تراشوں کو من وعن شائع کرنا استناد کے اعتبار سے درست محسوس نہیں ہوتا۔ اس طرح کی خبروں کی ایڈیٹنگ ناگزیر ہے۔ مثال کے طور پر ستمبر 2013 کے شمارے میں 'نفیس الرحمٰن' کے انتقال کی خبر روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے حوالے سے اس طرح شائع کی گئی ہے ''نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ میتھ میٹکس کے لیکچرار نفیس الرحمٰن کا جمعہ کو اسکارٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔'' اس خبر میں مرحوم کی اردو خدمات پر معلومات نہیں ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جمعے کے روز کون سی تاریخ تھی اور نفیس الرحمٰن صاحب کا انتقال کس مہینے میں ہوا۔ ان کی تاریخ پیدائش کیا تھی؟ نیز اردو کے لیے ان کی خدمات کو بھی اجاگر کیا جانا ضروری تھا۔ بہر حال ماہنامہ اردو دنیا کا وقار متقاضی ہے کہ یہ رسالہ علمی و ادبی اعتبار سے 'اردو دنیا' کی حقیقی نمائندگی کرے۔

عارف صاحب کا یہ کہنا غلط ہے کہ خبریں ایڈٹ نہیں کی جاتیں۔ انتقال کی خبر کے سلسلے میں انھوں نے ذرا سی زحمت اٹھائی ہوتی تو معلوم ہوجاتا کہ خبر کی تاریخ اشاعت (27 جولائی 2013) سے ایک دن پہلے جمعہ تھا اور جمعے کو 26 جولائی تھی۔ بالعموم وفیات کی خبروں میں باقاعدہ تاریخ وفات دے دی جاتی ہے لیکن کسی وجہ سے چوک ہوجائے تو اخبار کے نام اور تاریخ اشاعت کے حوالے اسی لیے دیے جاتے ہیں کہ حقیقت معلوم ہوسکے۔ (مدیر)

فخرالدین عارفی
محمد پور، شاہ گنج، پٹنہ

'اردو دنیا' کا ستمبر 2013 کا شمارہ اچھا اور معیاری ہے۔ 'علاقائی زبان وادب اور اردو' کے موضوع پر یہ شمارہ خاص اہمیت کا حامل ہے۔ رفیعہ شبنم عابدی سے غضنفر اقبال کی گفتگو کافی معلوماتی ہے۔ 'بنگلہ اور اردو' کے موضوع پر ف س اعجاز نے کافی پر مغز مقالہ قلم بند کیا ہے۔ کرشن بھاوک نے اردو اور پنجابی کے عنوان سے اچھا مضمون سپردِ قلم کیا ہے۔ کرامت علی کرامت، ستار ساحر، کے مضامین نے بھی متاثر کیا۔ سید یحییٰ نشیط کا مقالہ بہت وسیع ہے۔ اردو کے شہرہ آفاق افسانوں کی اشاعت کا سلسلہ بہت اچھا ہے۔ اس سلسلے کے تحت کرشن چندر کا افسانہ 'پیشاور ایکسپریس' پڑھا۔ اچھا لگا۔ 'قوالی کی روایت' کے عنوان سے رضی شہاب کا مضمون بھی اچھا ہے۔ خواجہ محمد اکرام صاحب اردو زبان کے فروغ کے لیے کافی اچھا کام کررہے ہیں، ان کے دور میں اردو کونسل کی سرگرمیوں میں اضافہ ہوا ہے۔

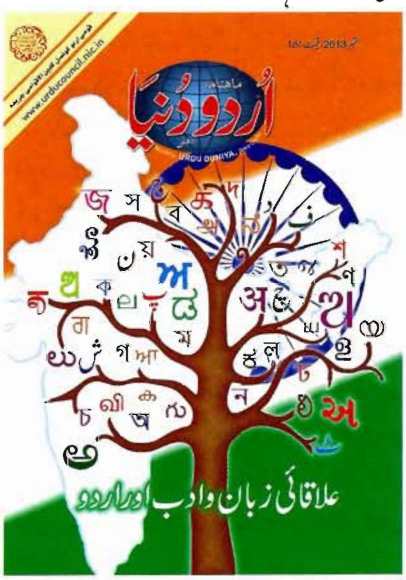

صدیقی ابوبکر قاضی
پارپرلی ضلع بیڑ مہاراشٹر

'اردو دنیا' اور 'بچوں کی دنیا' یہ دونوں رسالے بہت پسند آئے۔ ستمبر کے شمارے میں اردو ٹولز اور اردو کی فونٹس سی ڈی کی مفت تقسیم کے بارے میں جانکاری ملی۔ قومی کونسل اردو زبان وادب کی نہایت سنجیدگی سے خدمت کررہی ہے۔

محمد شکیل خان شکیل سہسرامی
یو ایس بی ایل سی پٹنہ 15

ماہ ستمبر 2013 کا اردو دنیا بخت نواز ہوا۔ اردو زبان کے ساتھ دیگر معروف زبانوں کا باہمی ارتباط شمارے کا ایک خوبصورت اختصاص ہے۔ ہر بار مشمولات کی خوبی وخامی

کا ذکر بر سبیل مراسلہ لازمی امر میں نہیں سمجھتا ہوں مگر بغیر اس کے مراسلے کا حق بھی ادا نہیں ہو پاتا۔ قدیم شعرا کی مختصر سوانح اور ان کا نمونہ کلام قاری کو اپنا گرویدہ کیے دیتا ہے۔ ماہ ستمبر 2013 کی 'ہماری بات' اردو سے بے پناہ محبت کے ساتھ ساتھ نہایت معلوماتی بھی ہے۔

رفیعہ شبنم عابدی نے آج اور کل کے طالب علموں میں جو فرق بتایا ہے وہ واقعی اتفاق کے قابل ہے۔ بنگلہ اور اردو کا مطالعاتی سفر انتہائی دلچسپ ہے اس کے لیے ف س اعجاز کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ لسانی یکجہتی سے قومی یکجہتی فروغ پاتی ہے۔ قاسم صاحب کی کاوش لائق ستائش ہے۔ لئیق صلاح کے مضمون کے حوالے سے یہ کہنا صحیح ہے کہ انگریزوں نے ہندو مسلمان کو تو لڑایا ہی اردو اور ہندی کو بھی لڑا کر چلے گئے۔ خالد ندیم نے اختر حسین رائے پوری کے اسلوب سے بھرپور روشناس کرایا ہے۔ مشتاق احمد وانی کی اطلاع ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ عبدالرحمٰن مباحث کی روشنی میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ میں اس قسم کے مباحث کو ترجیح نہیں دیتا۔ جناب عبدالستار دلوی نے مایہ ناز شخصیت کا انتخاب فرمایا ہے طبیعت خوش ہوگئی۔ ادارے نے کرشن چندر کو یاد کر کے قارئین پر ایک احسان حسین کیا ہے حالانکہ یہ سلسلہ متواتر جاری و ساری ہے۔ صفحہ نمبر 52 اور 54 کی تصویروں نے خون کے آنسو رلا دیے۔ صفحہ نمبر 56 کی تصویر فرسودہ ہمارے ماضی کی یاد دلاتی ہے۔ 'تاج الدین فیروز' کی بابت یہ میرا پہلا مطالعہ ہے جو اچھا اور پر اثر ہے۔ لِسں کا انجام آغاز سے کہیں بہتر ہے۔ رضی شہاب نے ایک معدوم ہوتی روایت کو زندہ رکھنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ اسرار کائنات نے ذہن کو دھکا مارا۔ یہ کمال کا ہی کمال ہے۔ کمان کے تبصرے نے جی خوش کر دیا۔ جہان غالب ہر زمانہ میں بے مثال رہنے والا جہان ہے۔ ڈنمارک کا اردو سفر اچھا لگا۔ صفحہ نمبر 87 کی خوشی میں بھی تہہ دل سے شامل ہوں اور ہر فرد و بشر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

ایم راگھو راؤ
ساؤتھ سول لائنس، چھندواڑا (مدھیہ پردیش)

ستمبر 2013 کا شمارہ ملا۔ اس بار آپ کا اداریہ دلچسپ ہے۔ زبانوں کا اپنا ایک حیاتیاتی نظام ہوتا ہے۔ وہ اپنے بولنے والوں کے تہذیبی مزاج، رسم و رواج اور سماجی حالات سے پیش آنے والی ضرورتوں، فکر و فلسفہ و ادبی تخلیقات کا اثر قبول کرتی ہے۔ اردو اپنے ارتقا کی ایک ہزار سال کی تاریخ کے دوران کی گئی چھیڑ چھاڑ کے بعد بھی آج ایک جیتی جاگتی زبان کے طور پر موجود ہے۔ علاقائی زبانوں اور ان کے ادب پر اردو کا خاصا اثر ہوا ہے۔

اختر حسین کا اسلوب اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ ان کے مدنظر محض ادبی حسن اور فنی چابکدستی ہی نہیں بلکہ اجتماعی زندگی میں تبدیلی کا خواب بھی تھا۔ وہ شعرا جو شاعری میں انفرادی جذبات و خیالات کے اظہار کے حامی تھے حلقے کے زیر اثر آتے گئے۔ کرشن چندر کی مقبولیت ان کی رومانیت کی وجہ سے تھی۔ ان کی رومانیت حسن پرستی، جذباتیت فطرت سے بے پناہ لگاؤ نے مل کر ان کے افسانوں میں ایسی کشش پیدا کر دی کہ دل بے ساختہ ان کی طرف کھنچتا تھا۔

عبدالسلام صدیقی
پرنسپل (ریٹائرڈ) ممتاز کالج، ماتھر کمپاؤنڈ، جگت نرائن، روڈ لکھنؤ

میں خالد حسین خاں کا مضمون 'اعتبار الملک دل شاہ جہاں پوری' نظر نواز ہوا۔ دل شاہ جہاں پوری کے تین دیوان نغمۂ دل، ترانۂ دل اور یادگارِ دل کے علاوہ نثر میں ایک ناول 'دردِ دل' متروکاتِ دل اور مکتوبات دل شامل ہیں۔ 'گل کدۂ عزیز لکھنوی' پر تنقید و تبصرہ لکھا۔ غزلیات پر تبصرہ 'جدید رنگِ تغزل' کے علاوہ رضا لکھنوی کی فرمائش پر چھ سات سو غیر معروف محاورات اور ضرب الامثال بہت خوبی سے نظم کیے۔ شعرائے لکھنؤ کے لیے ان کا کہنا تھا کہ ایک وقت تک کے کلام کا حاصل 'واہ واہ' تھا، بعد میں انقلاب زمانہ سے اثر پذیر ہوکر 'آہ آہ' بھی کرنے لگے۔ ان کے رنگِ تغزل میں تصوف اور عرفان کی جھلک ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ صوفی نہ ہوتے ہوئے بھی صوفیانہ رنگ سے آشنا ضرور تھے۔ باوجود اِس حقیقت کے کہ وہ لکھنؤ اسکول سے تعلیم یافتہ تھے انھوں نے 'دہلوی رنگ' کو فوقیت عطا کی۔ ان کے نام سے پہلے جو خطابات دیکھے گئے ان میں 'لسان الدہر' بھی شامل ہے۔ ان کے دادا کا نام جمال الدین عرف قدرت علی خاں تھا۔ اساتذہ میں مولوی سید محمد علی خاں مرادآبادی، مولوی عبدالباری خاں شاہ جہاں پوری اور مولوی حکیم محمد شامل ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ منشی امیر احمد امیر مینائی (1901 - 1828) سے شاعری میں شاگردی کا سلسلہ 'بذریعہ مراسلت' رہا لیکن دل شاہ جہاں پوری نے بعد میں اپنے استاد سے رام پور میں ملاقات کی اور شرف نیاز حاصل کیا۔

محمد ہاشم قدوائی
سابق ممبر راجیہ سبھا، نئی دہلی

کئی روز ہوئے ڈاک سے ماہ نامہ 'بچوں کی دنیا' کا پہلا شمارہ موصول ہوا۔ باعث صد شکر گزاری ہوا۔ نہیں کہہ سکتا کہ اس پرچے کو پڑھ کر کتنی زیادہ خوشی ہوئی بلاشبہ ادب اطفال میں یہ امتیاز حاصل کرے گا۔ 'اردو دنیا' اگست 2013 کا شمارہ اپنی امتیازی خصوصیتوں یعنی حسن طباعت و نفاست کے ساتھ گراں قدر اور معلوماتی مضامین سے آراستہ موصول ہوا۔ حسب ذیل مضامین ہندوستانی کی ترقی کے 66 سال، عصر جدید میں ترجمے کی افادیت، تلوک چند محروم کی شاعری، نذیر بنارسی کے شخصی مرثیے، تاریخی شہر بڑودہ وغیرہ۔

معین الدین عثمانی
264، شاہو نگر، جلگاؤں، مہاراشٹر

ماہ اگست 2013 کا شمارہ پیش نظر ہے۔ شمارہ ہر زاویے سے لائق مطالعہ اور معیاری ہے۔ میری نظر میں یہ ایک ایسا رسالہ ہے جو گھر کے ہر فرد کی پسند ہی نہیں ضرورت بھی ہے۔ ادب سے وابستہ افراد کے لیے تو یہ کسی نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ اس کے کلاسیکی ادب والے حصے کا تو جواب ہی نہیں۔ ویسے اس کے لیے آپ کے انتخاب نظر کی جتنی داد دی جائے کم ہے۔ اس مرتبہ فکشن سے متعلق احمد صغیر کا عبدالصمد سے لیا ہوا انٹرویو خاصے کی چیز ہے۔ جناب محمد بشیر مالیر کوٹلوی کا مضمون 'افسانے میں مکالمہ کیسے لکھا جائے' عنوان کا احاطہ کرتے ہوئے بڑی محنت سے لکھا شہ پارہ ہے کہ مبتدی حضرات اس کے مطالعے سے روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ مکالمے سے متعلق باریک سے باریک بات کی طرف نشاندہی بشیر مالیر کوٹلوی کے عمیق تجربے کی غماز ہے۔ ایک مشورہ عرض ہے کہ نئی نسل کے نمائندہ فنکاروں کا ایک تعارفی سلسلہ شروع کیا جائے تو اِس کے حلقے میں مزید اضافہ ہوگا اور میرے خیال سے دونوں فریق کے حق میں یہ بات سودمند ثابت ہوگی۔ امید ہے کہ آپ اس پر غور فرمائیں گے۔

عبدالواجد خاں
موظف معلم، #633، نواں کراس، راجیو نگر II اسٹیج، میسور 19

'اردو دنیا' اگست 2013، آپ کی بات میں جاوید اختر لکھنؤ سے اپنے خط میں 'بچوں کی دنیا' کے لیے فال نیک کے چند کلمات لکھے ہیں:

...بڑوں کی دنیا میں گھومتے پھرتے 35-30 برس گزر گئے۔ اب جی چاہتا ہے، 'بچوں کی دنیا' کی سیر کی جائے اور اپنے آپ کو وقت سے پہلے بوڑھا ہونے سے بچایا جائے۔ یہ قدم بہت مبارک ہے کہ آپ نے بڑوں کے ادب کے ساتھ ساتھ بچوں کے ادب کو بھی آگے بڑھانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ بچوں کی دنیا کا پہلا شمارہ

'پہلا قدم' اِس کی جیتی جاگتی تعبیر ہے۔ ہم خود بھی صاحبِ موصوف کے ہم عمر ہیں۔ اردو دنیا اور بچوں کی دنیا کے دونوں رسالے ایک ساتھ ملے۔ بچوں کی دنیا کی ورق گردانی کی اور پایا کہ صاحبِ موصوف نے ہمارے خیالات کی نمائندگی کی ہے تو سوچا کہ کیوں نہ اس خط کو انھیں کے اس آخری جملے پر ختم کیا جائے۔ ''خدا آپ کو اِس میدان میں بھی سرخ رو رکھے۔ آمین ثم آمین!''

سید علی حیدر
221، پریتم نگر، سلیمان سرائے، الہ آباد

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست 2013 نظر نواز ہوا۔ اردو زبان و ادب کی تبلیغ و اشاعت میں جس تندہی اور دیانت داری سے 'اردو دنیا' کام کر رہا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اداریہ فکر انگیز و ذہن رسا ہے۔ آپ کا یہ خیال کہ مرکزی اور کئی ریاستی حکومتیں اقلیتوں کی تعلیم کے فروغ کے لیے سنجیدہ ہیں۔ بات بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن جناب ان سرکاروں کے عملے اس میں رخنہ ڈالتے ہیں جس پر سرکاروں کی پکڑ بہت کمزور ہے۔ اس لیے لاکھ چاہنے پر بھی کام ہو نہیں پاتا۔ اس کی نمایاں مثال سرِ دست الہ آباد یونی ورسٹی کا اقلیتی تربیتی مرکز (M.T.C) ہے جہاں سب کچھ سرکار نے دے رکھا ہے مگر یونیورسٹی انتظامیہ کی نظر میں یہ کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے لہٰذا وہاں کے اساتذہ کو دو برس سے تنخواہ نہ ملنے کے سبب ٹیچرس نے پڑھانا بند کر دیا اور وہ مرکز جو ہر سال چار چھ طلبا و طالبات NET اور TET میں نکالا کرتا تھا اُس سے غریب اردو والے محروم ہو گئے اس طرح یہ اسکیمیں صرف کاغذ پر رہ جاتی ہیں۔

رسالے کے دیگر مشمولات میں عبدالصمد سے، احمد صغیر کا انٹرویو بصیرت افروزی کا نمونہ ہے جو درک و آگہی سے لبریز ہے۔ اس کے علاوہ ادبی مباحث کے موضوعات اور مشاہیر ادب نثر و نظم سب وقیع ہیں۔ وحید اختر و اشفاق احمد پر مضامین جوش کے مرثیے و منٹو کی کہانیوں کا پس نو آبادیاتی مطالعہ، خاصے کی چیزیں ہیں۔ البتہ جوش کے مرثیے میں عارف حسین جونپوری اعداد و شمار کرانے میں ایک مرثیہ کی ڈائری مار گئے ہیں یعنی تیسرے مرثیہ کے بعد صفحہ 30 پر لکھتے ہیں جوش کا پانچواں مرثیہ 'طلوعِ فکر' تو چوتھا کہاں گیا حضور، اور اس کے بعد چھ سے نو تک کے اعداد پورے کر دیتے ہیں یعنی بتاتے آٹھ ہیں اور گنتے نو ہیں۔

اسی طرح ستمبر 2013 کا 'اردو دنیا' کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ سرورق پُر معنی اور قابلِ تعریف ہے۔ یہ شمارہ عالمانہ اور محققانہ مضامین کے لحاظ سے معیاری ہے۔ تمام مشمولات ایک گراں قدر ادبی سرمایہ ہیں۔ اداریہ میں آپ نے اردو زبان کی نرم مزاجی اور دوسروں کو اپنانے کی دلکش ادا پر اچھی گفتگو کی ہے۔ بلاشبہ اردو کا دامن 'تین تر بنی کی انجمن' نہیں بلکہ پانچ سات کی ہے۔ کور اسٹوری کے تحت سارے مضامین مواد کے لحاظ سے بھرپور، معلوماتی اور خوب ہیں۔ مشاہیر ادب، میں زہر عشق کا اقتباس ایک مخصوص ثقافت کی پیش کش ہے جو اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود انسانی برتری، آپسی بھائی چارہ اور تہذیب و شائستگی کا پاسدار ہے۔ زیر نظر شمارے میں ایک کہانی 'لمس' اڑیہ کہانی کا ترجمہ از رشدہ خاتون ہے۔ اس ضمن میں معروضہ ہے کہ کسی بھی زبان کی کارکردگی، اس کی اپنی مخصوص ثقافت کی رو سے ہی نمایاں ہوتی ہے اور زبان و ادب میں نت نئی تخلیقیت اور معنی خیزی کا عمل اس کی اپنی مخصوص ثقافت کی رو سے ہی ممکن ہوتی ہے۔ اڑیا زبان کی یہ بلند پایہ کہانی، اردو زبان و ادب کی مخصوص ثقافت سے پرے کی چیز ہے ہمیں اس کو ہضم کرنے کے لیے ابھی وقت درکار ہے۔ اردو ادب کی جمالیات ابھی اپنے مخصوص ثقافتی حصار میں ہے۔

ایس ایس علی
اکولہ (مہاراشٹر)

اگست 2013 کے شمارے میں اعجاز احمد اعجاز کا مضمون 'جدید وسائل اور نظم و غزل کی تدریس' نظر سے گزرا۔ مضمون کافی عرق ریزی سے لکھا گیا ہے اور موضوع کے ساتھ کافی حد تک انصاف کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون کو کالج کی جماعتوں تک ہی محدود رکھا ہے۔ امید ہے آئندہ وہ ابتدائی، ثانوی اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں کی تدریس کو بھی اپنا موضوع بنائیں گے۔ اعجاز احمد اعجاز کے مضمون میں ایک بات جو مجھے سب سے زیادہ پسند آئی وہ یہ ہے ''ہمیں ضرورت کے مطابق اکتسابی تجربات کرتے رہنا چاہیے۔'' معلمین کے لیے خواہ وہ کسی بھی شعبے سے متعلق ہوں، یہ tip ایک master key ہے جس کے ذریعے وہ اپنے کریئر میں کامیابی کے دروازوں کو کھول سکتے ہیں، پیشہ تدریس کے ساتھ انصاف کر سکتے ہیں اور بلندیوں کو چھو سکتے ہیں۔ میری مخلصانہ گزارش ہے اس موضوع پر مزید مضامین شائع کرتے رہیں۔

ڈاکٹر رضوانہ پروین
ایچ او ڈی، شعبۂ اردو، جودھ پور، ویمن کالج

اگست 2013 کا ماہنامہ 'اردو دنیا' نظر نواز ہوا۔ خوش رنگ تصاویر سے مزین اردو دنیا کا ہر شمارہ توجہ طلب اور حرف حرف مطالعے کا متقاضی ہے۔ اداریہ ہمیشہ کی طرح علمیت سے بھرپور اور آپ کے ادبی ذوق کی غمازی کرتا رہا ہے۔ جشن آزادی کے موقع پر اس رسالے کا بروقت موصول ہونا بھی ایک امر خاص ہے کہ موقع و محل کی مناسبت سے قبل از وقت موصول ہوتا رہا ہے۔ 'اردو دنیا' اردو کے طلبا و طالبات ہی نہیں تمام تر قارئین کو شعوری طور پر اردو ادب، سائنس، دیگر زبانوں، فلمی دنیا اور عالمی اردو خبرناموں سے بیدار کرتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے منجمد ماحول کو تغیر بخشا اور ساکت و جامد حیات و کائنات میں ارتعاش پیدا کرنا ہی فن، جدوجہد، سعی پیہم اور مسلسل کاوشوں سے ہی نظام حیات و ادب میں تبدیلی لائی جا سکتی ہے، انھیں افکار کے تحت میں نے یونیورسٹی گرانٹ کمیشن کی جانب سے عطا کردہ Minor-Project Research کا موضوع 'اردو ادب کی مزاحمتی آوازیں' منتخب کیا ہے۔ اس تحقیق کی اولین شرط یہ ہے کہ اس کا ایک باب کسی بین الاقوامی رسالے میں شائع کرایا جائے اور اس کی کاپی UGC کو مع سالانہ رپورٹ کے ارسال کی جائے۔ اس اعتبار سے اپنی تحقیق کا ایک باب 'مزاحمت-ایک تعارف' آپ کی علم نوازی کی نذر کر رہی ہوں۔ میری محنت پسند آئے تو کسی قریبی شمارے میں شائع کرنے کی زحمت گوارا کریں گے اور اس ضمن میں اپنے خیالات سے نوازیں گے۔

ڈاکٹر کرشن بھلاوک
A-201، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، پٹیالہ (پنجاب)

''اگست کا شمارہ حسبِ معمول مکمل آب و تاب سے متفرق مضامین سے آراستہ و مزین ہمدست ہوا۔ یہ مختلف وجوہ

سے بیش قیمت ٹھہرتا ہے۔ مزید قومی اردو کونسل نئی دہلی نے وزارتِ مواصلات کے اشتراک سے نہ صرف اردو زبان کے 13 فونٹس کا اجرا کر دیا ہے، بلکہ مزید ڈیسک ٹاپ، لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ اور اینڈ رائڈ ونڈوز فون پر بھی اردو کے استعمال کرنے کی راہیں ہموار کر دی ہیں۔ بے حد شیریں زبان اردو کے ارتقا و فروغ کے لیے ان اقدامات سے اردو سے محبت کرنے والے لوگ کس حد تک استفادہ کر سکتے ہیں، اس کے بارے میں 'پوت کے پاؤں گھوارے میں ہی نظر آ جاتے ہیں' کا ضرب المثل صادق آ رہا ہے۔ ملک کیا دنیا بھر کے عوام کو اس کے لیے وزارت کا اظہارِ تشکر کرنا درکار ہے۔ اگست کے اس شمارے میں اعجاز احمد کے 'نظم و غزل کی...' مضمون میں نظم و غزل سے متعلق نہایت واضح طریقے سے تدریس کی گئی ہے۔ اس سبق سے تو فاصلاتی تعلیمی نصاب (Lesson of Correspodence Course) کے سبق کی مانند ہی قارئین وغیرہ گھر بیٹھے ہی مستفید ہو سکتے ہیں۔

واصف احمد

ایسوسی ایٹ پروفیسر و صدر شعبہ عربک، پرشین، اردو اسلامک اسٹڈیز، بھاشا بھون، وشوا بھارتی یونیورسٹی، شانتی نکیتن، ویسٹ بنگال

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا ہر شمارہ حسب معمول موصول ہو رہا ہے۔ شعبے کے تمام اساتذہ کرام بہت دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں اور پُر مغز مضامین سے مستفید ہوتے ہیں۔ واقعی اردو دنیا کا معیار بہت بلند ہوا ہے۔ سرورق حسین رنگوں کے امتزاج سے مزین ہوتا ہے جو بے حد دیدہ زیب اور دلکش ہوتا ہے۔ مضامین میں جو تنوع ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ خاص طور سے 'دوسری زبانوں سے' کے تحت جو دوسری زبانوں کے مضامین کے ترجمے کا کام انجام دیا جا رہا ہے وہ قابل تحسین ہے۔ اس عمل سے قاری کو دوسری زبانوں کے ادب کے خزانہ سے مستفیض و مستفید ہونے کا موقع ملے گا اور ان کے علم اور وسیع النظری میں اضافہ بھی ہوگا۔

معین الدین شمسی

اسلامیہ مڈل اسکول، گریڈیہہ

ماہ جولائی 2013 و اگست 2013 دونوں شمارے ایک ساتھ دیکھنے کو ملے۔ سرورق پر 'ادب مذہب اور اردو' اور اگست 2013 کے سرورق پر 'اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے سفارشات' نیز انگریزی میں یہ عبارت بھی ہے۔ Report of the standing commetee of the National Monitoring Committee for Minorities Education (NMCME) April 2013 دیکھا بہت خوب ہے۔ ہماری بات کے تحت ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے بجا فرمایا کہ اردو اس ملک کی واحد زبان ہے جس نے ماضی کے تقریباً ایک ہزار برسوں میں اپنے ارتقا کی منزلوں کا سفر اسی اصول کی روشنی میں طے کیا ہے۔ چنانچہ کوئی اگر یہ کہے تو غلط نہیں ہوگا کہ اردو کا دوسرا نام سیکولرزم ہے اور سیکولرزم کا دوسرا نام اردو۔ ایک ہی سکے کے دو رخ یعنی سیکولرزم بچا رہا تو اردو بھی بچی رہے گی اور اردو کو طاقت ملے گی تو سیکولرزم بھی مضبوط ہوتا جائے گا اور سیکولرزم مضبوط ہوگا تو پھر دیش بھی مضبوط ہوگا۔ تخلیقی ادب پینل کی پہلی میٹنگ میں دو اہم فیصلے (1) قومی اردو کونسل کا تخلیقی ادب کا سرمایہ رسالہ جاری کیا جائے اور دوسرا (2) تخلیقی ادب اور بدلتے منظرنامے میں ادب کی مختلف اصناف اور جہات کو سمجھنے کے لیے کونسل ناول، شاعری، ڈرامے، افسانے، فکشن اور نان فکشن پر جلد ہی ہفت روزہ ورکشاپ منعقد کرے گی جو قابل صد ستائش قدم ہے۔ وسیم بریلوی، ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام اور دیگر ارکان کونسل کو ڈھیروں مبارکباد!

ناظمہ خاموش

بھنڈاری ڈیہہ، گریڈیہہ

بلاشبہ اردو زندہ و جاوید زبان ہے۔ اس کے پڑھنے والوں کا مستقبل تاریک نہیں بلکہ روشن ہے۔ قومی کونسل کی جانب سے اتنا خوبصورت ماہنامہ 'اردو دنیا' وہ بھی ادب کے ساتھ نت نئی عصری دنیا کا مواد محض 15 روپے میں کیا کہنا۔ ایسے مفید رسالے کو ہر ہندوستانی اردو داں کو خرید کر پڑھنا چاہیے۔ جولائی 13 کے شمارے میں بلقیس بانو کا 'غذا اور ہماری صحت' خوب ہے۔ بقول عبدالواسع مغلوں نے ہندوستان کو تین نایاب تحفے دیے تھے: (1) اردو (2) تاج محل (3) لال قلعہ۔ افسوس کا مقام ہے کہ یہ تحفے گرد آلود ہو رہے ہیں اور Pollution کا شکار ہیں۔ ان کا فطری حسن کم سے کم تر ہوتا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تحفوں اور نئی نسل کو اردو ادب و زبان سے دوری ہونے سے بچائے اور سارے لوگوں کو اردو ادب سے محبت عطا فرمائے، آمین!

علی عباس 'امید'

صدر قلم کار پریشد، بھوپال

چند دنوں قبل 'اردو دنیا' (ماہ اگست 2013) موصول ہوا، یاد آوری کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ پرچے نے بے حد متاثر کیا۔ اس میں شک نہیں کہ مجموعی طور پر اس نے اپنے نام کی روشنی کو قائم رکھا ہے اور اسے دھندلا نہیں ہونے دیا ہے۔ اس سے ادارہ نیز اس کے منصوبوں کو بہتر طور پر سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ مشمولات خوب ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ادارہ کی بہتر کارکردگی کا مظہر ہے۔ یقین ہے کہ بہتر آئندہ بہترین ہوگا۔

شاہد دلکش

آریہ سماج کانکی نارہ، مغربی بنگال

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے تازہ شمارے (اگست 2013) کے سرورق پر لکھا ہوا 'اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے سفارشات' اور اس سے متعلق خوب صورت و جاذب دید تصاویر نے دل پر اس قدر اثر کیا کہ گھنٹوں اسے پڑھنے میں محو ہو گیا۔ خاص کر 'ہماری بات' میں قومی اردو کونسل کے مدیر نے بارہویں پانچ سالہ منصوبے کے تجویز نامے کے دسویں پیراگراف کے حوالے کے ساتھ ملک کی مذہبی اقلیتوں کے تعلیمی مسائل سے متعلق اعداد و شمار کے ساتھ قیمتی اور موقر معلومات فراہم کی جو نہایت ہی قابلِ مطالعہ وستائش ہے۔ عزت مآب کپل سبل (مرکزی وزیر مواصلات و انفارمیشن ٹکنالوجی) کی پہلی اور قومی اردو کونسل کی انتھک کاوشوں کا ثمرہ ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی تاریخ ساز پیش قدمی ہمارے سامنے ہے جس کے باعث اب اہل اردو اسمارٹ فون پر اردو میں بھی ایس ایم ایس بھیج سکتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈیسک ٹاپ، لیپ ٹاپ، ٹیبلیٹ اور اینڈ رائیڈ ونڈوز فون پر بھی اردو کا استعمال شروع ہو چکا ہے۔ اردو کو انفارمیشن ٹکنالوجی سے جوڑنے کے دیگر اقدامات بھی قابلِ تحسین ہیں جس سے واقعی اردو کو روزگار سے جوڑنے کی سعی کو عملی جامہ پہنایا جا رہا ہے۔

سید عظمت اللہ بیابانی

RT، 288/2 وجے نگر کالونی، حیدرآباد 500057

'اردو دنیا' سے معلوم ہوا کہ اردو کتابوں کی موبائل وین حیدرآباد آئی اور چلی بھی گئی۔ اس کی تشہیر میں کمی تھی۔ اردو 'فونٹ' اور 'کی بورڈ' کا اجرا ہونا ایک فالِ نیک ہے۔ اس کے ساتھ اردو میں ایس ایم ایس سونے پہ سہاگہ، عربک ویب سائٹ کا جاری کرنا ایک اہم کام ہے جو عربک ٹیچرس اور اسکالرس نے انجام دیا۔ 37 ویں ایگزیکیوٹیو بورڈ میٹنگ کے ایجنڈے میں کارآمد مواد کا ذکر ہے۔ یہ باتیں قومی اردو کونسل سے وابستہ حرکیاتی کارگزاری کی نشاندہی کرتی ہیں۔ 'اردو دنیا' میں بہت عمدہ طریقے سے مضامین کو گلدستے کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ایک مضمون مذہب پر بھی ہو قارئین کے لیے کارگر ثابت ہوگا۔ میں آپ کا شکرگزار ہوں کہ آپ نے 'بچوں کی دنیا' کا پہلا شمارہ ارسال فرمایا۔ یہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے بچوں کے لیے ایک عمدہ تحفے سے کم نہیں۔

نور محمد جنیدی

133، سدیشورنگر 4، مجرے واری، سولاپور

ماہنامہ 'اردو دنیا' اگست کا شمارہ دیکھا۔ 'ہماری بات' پڑھ کر ہی جان میں جان آگئی۔ جب میں نے محترم مدیر کی 'ہماری بات' کا مطالعہ کیا تو ملک کے تعلیمی حالات اور خود ہمارے معاشرے پر کافی رنج بھی ہو رہا تھا کہ آج اقلیتی طبقہ تعلیم کے میدان میں پچھڑ چکا ہے۔ مگر تعلیم ہی ایک ایسا عمل ہے جس سے ہم دوبارہ اقتدار سنبھال سکتے ہیں۔ مضامین بھی خوب سے خوب تر ہیں۔ بات انٹرویو کی کروں تو محترم عبدالصمد صاحب نے آخر میں کہا کہ ''اس وقت بے شمار رسالے نکل رہے ہیں (ص نمبر 8 لائن نمبر 6 نیچے سے) یہ بات کہاں تک درست ہے کہ بے شمار لکھنے والے ہیں۔ بے شمار پڑھنے والے اب کہاں ہیں؟ کتابیں کتب خانوں میں مٹی اور دھول کے ذرات میں دبی جا رہی ہیں پڑھنے والا اس دور میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا ہے۔

رؤف خیر

9-11-137/1، موتی محل، قلعہ گولکنڈہ، حیدرآباد

'اردو دنیا' جیسا خوب صورت رسالہ اپنی تاریخ بنا رہا ہے۔ صوری و معنوی اعتبار سے خوب ہے۔ احمد صغیر کا انٹرویو عبدالصمد سے خوب ہے۔ ارشاد نیازی کا مضمون بہت ہے۔ ترجمے دو زبانوں ہی کو نہیں بلکہ دو تہذیبوں کو بھی ایک دوسرے سے قریب لاتے ہیں۔ جوش و نذیر بنارسی کے مراثی کا اچھا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی اسی سلسلے کو وحید اختر نے بھی آگے بڑھایا تھا۔ وحید اختر نے نظم و نثر میں اپنے آپ کو منوایا ہے۔ تبصرے تو 'اردو دنیا' میں بڑے اہتمام سے شائع کیے جاتے ہیں۔

رشید اختر خان

22 لوکو بازار، گومو، دھنباد (جھارکھنڈ)

دو تین برسوں پہلے اردو دنیا ضرور دیکھتا رہا ہوں اس کے بعد تو موذی مرض نے ایسا گھیرا کہ 'آگئی ہے نزد ساحل کشتی عمر رواں' کو بالکل قریب محسوس کرنے لگا۔ اللہ کا شکر ہے دل و دماغ سلامت رہے۔ اخبار و رسائل کے مطالعے کا سلسلہ شروع ہوا اور جینے کا حوصلہ بڑھ گیا۔ گزشتہ دنوں اردو دنیا ماہ جولائی 13 دیکھا جی خوش ہو گیا کئی دن تک دیکھتا رہا اور محسوس کرتا رہا کہ ایسا خوشنما و خوب سیرت رسالہ دیکھنے کے لیے اللہ نے توانائی دے دی۔ اگست کا شمارہ ایک عزیز سے فون کر کے رانچی سے منگوایا آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ مبارکباد قبول کیجیے۔ موجودہ دور میں آپ جیسے نوجوان قلمکاروں نے اردو کو خوب سنوار کر سنبھالا دے رہے ہیں۔ ایک طرف آجکل میں ابرار رحمانی اور فکر و تحقیق اور اردو دنیا میں ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین خوب سے خوب تر کے لیے سرگرداں ہیں۔ اگست کے شمارے میں آپ کا اداریہ حقائق پر مبنی ہے زبان اتنی اچھی کہ دل کو لگ گئی۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی

پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج موڑتاڑ ضلع نظام آباد اے پی

احمد صغیر نے عبدالصمد سے جو انٹرویو لیا ہے اس میں کئی ادبی و تنقیدی حقائق سے آشکار ہوئے ہیں اور ادبی معلومات کا خزانہ ہے۔ اس طرح کے کالم کو برقرار رکھیں تاکہ اردو دنیا کے قاری کو نئی اور جدید معلومات انٹرویو کے ذریعے حاصل ہوں اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے سفارشات ایسی رپورٹ ہے اس پر حکومت عمل پیرا ہو جائے اور ان سفارشات کے عامل بن جائیں تو اقلیتیں اعلیٰ تعلیم سے مزین ہوں گی۔ زبان و تعلیم میں نظم و غزل کی تدریس اہم مضمون ہے۔ ادب کے اساتذہ اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ عصر جدید میں ترجمے کی افادیت بہت خوب ہے ترجمے ہی سے زبان و علوم میں وسعت پیدا ہوتی ہے زبان مالا مال ہوتی ہے ترجمے کے عمل کو جاری رکھا جائے ادبی مباحث کے تحت مشتملات بھی اہم ہیں لیکن نذیر بنارسی کے مرثیے جو قومی رہنما و عمائدین پر ہیں معلومات اور ان کی زندگی شخصیت و فکر سے پر ہے اب کہ ہندوستانی فلمیں اور امراض مضمون انفرادیت لیے ہوئے ہے اس میں انھیں فلموں کو بتایا گیا ہے جس میں امراض کا باقاعدہ اظہار ہوا ہے تو اس سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔

نور لکھمنیاوی

بیگوسرائے، بہار

قومی کونسل کا بین الاقوامی جریدہ 'اردو دنیا' (شمارہ جولائی 2013) پیش نظر ہے۔ اردو زبان و ادب کے اس دور انحطاط میں ایسے مختلف الموضوع علمی رسالے کا ہونا جو صوری لحاظ سے نہایت دیدہ زیب اور معنوی اعتبار سے ہر مکتب فکر کے قاری کے ذوق کی تسکین کرتا ہو نہایت حوصلہ بخش اور اہم ہے۔ زیر نظر شمارے میں مذہبیات کے تحت لکھے گئے تمام مضامین قابل احترام اور معلوماتی ہیں۔ البتہ راقم 'نئی نسل اور اردو زبان و ادب' کے بارے میں بغیر کسی تکلف کے کچھ عرض کرنا ہے۔ پورا مضمون عمومیت اور سہل پسندی کا شکار ہے۔ جگہ جگہ زبان و بیان کی لکنت ہے اور عنوان کے تحت جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہ عصری حقائق سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔

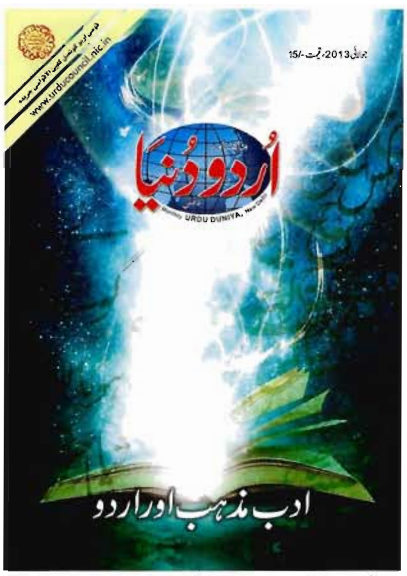

اس کی وضاحت کے لیے تھوڑی طوالت درکار ہے۔ مضمون نگار رقمطراز ہیں: ''زبان تہذیب کی پروردہ ہوتی ہے۔'' عجیب الٹی بات ہے۔ ہر زبان اپنی تہذیب اپنے ساتھ لاتی ہے اور اثر انداز ہوتی ہے معاشرے کے 'خد و خال' پر۔ اور یہی اثرات تہذیب سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ شعر و شاعری، علم و ادب، موسیقی و مصوری، زبان کا معیار حسن اس کی لسانی جمالیات بولنے اور لکھنے والوں کے کردار و عمل پر اثر انداز ہوتی ہے اور اچھی یا بری تہذیب کی تشکیل کرتی ہے۔ زبان بگڑتی ہے تو تہذیب بگڑتی ہے۔ بری شعر و شاعری معاشرے کو کرپٹ کرتی ہے۔ (ملاحظہ کیجیے مقدمہ شعر و شاعری کی تقریظ)۔

راقم الحروف کی زندگی میں یہ پہلا 'حادثہ' ہے کہ وہ کسی مضمون کی قبولیت یا نا قبولیت پر اظہار خیال کا ارتکاب اپنی علمی و تہذیبی، وضع داری کے خلاف کر رہا ہے۔

پروفیسر موصوف اپنے مضمون میں اردو کی زبوں حالی اور نئی نسل کے لوگوں میں زبان سے عدم توجہی کے لیے جو اسباب بیان کیے وہ ثانوی ہیں۔ اس کی اصل وجہ سیاسی ہے جس کی بنیاد بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں پڑ چکی تھی۔ (اس کا ذکر نہایت دلخراش اور طویل ہے)

نور صاحب نے جس توجہ سے مذکورہ شمارہ ملاحظہ کیا اس کے لیے شکریہ۔ ان کا اصل مراسلہ بے حد طویل ہے اور اس میں پروفیسر صاحب کے مضمون پر جو اعتراضات انھوں نے کیے ہیں ان سے پوری طرح اتفاق کرنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے غیر متعلقہ امور پر بھی اظہار خیال فرما دیا ہے۔ اس لیے یہ سبھی حصے بلا وجہ بدمزگی پیدا ہونے کے اندیشے سے حذف کر دیے گئے ہیں۔ مجموعی طور پر اس مضمون سے وہ تاثر پیدا نہیں ہوتا جس کا ذکر نور صاحب نے کیا ہے۔ (مدیر)

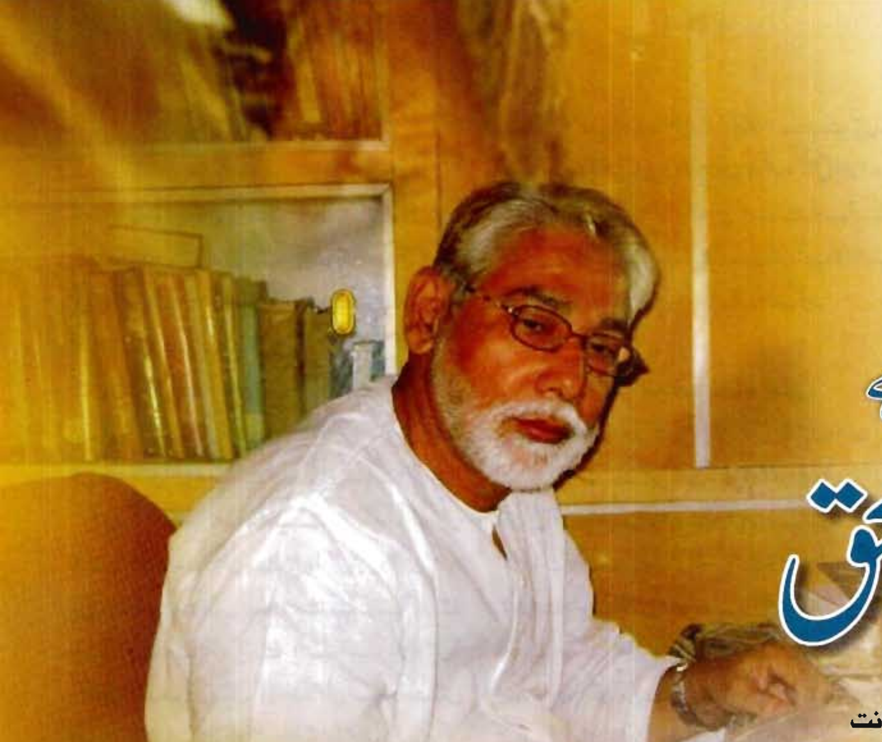

شاہد اختر انصاری

علامت لفظ کی معراج ہے

حسین الحق

بہت سنبھل کر، بہت ٹھہر کر، پوری ذمے داری، بے حد سنجیدگی اور بڑی متانت سے اردو افسانہ لکھنے والوں میں، اور موجودہ اردو فکشن کو آگہی و عرفان کی نئی بلندیوں تک لے جانے والوں میں جناب حسین الحق کا نام کافی اوپر ہے۔ وہ بہت کم لکھتے ہیں اور بہت اچھا لکھتے ہیں۔ ادب کی دنیا میں نہ انھوں نے کسی طرح کا شور مچایا، نہ علامتی و تجریدی انداز بیان کا حامی ہونے کے باوجود ادب پڑھنے والو ں کو ناقابل فہم عبارت آرائی سے چونکایا نہ کوئی زبردستی کا تنازعہ تخلیق کرکے قارئین کو اپنی جانب متوجہ کیا.. اطمینان سے ثابت قدم اور ثابت قلم رہ کر اردو افسانے کا مقدر سنوارتے رہے۔ آج وہ جدید اردو فکشن کی دنیا میں اس مقام پر ہیں جہاں بڑے بڑے ایوارڈ بھی ان پر رشک کرتے ہیں۔ 'اردو دنیا' کے لیے ڈاکٹر شاہد اختر انصاری کے چند معصومانہ سوالوں کا بھی انھوں نے جس سنجیدگی، صفائی اور ادبی علم میں اضافہ کرنے والی حقیقت بیانی سے جواب دیا ہے اس سے اردو فکشن کا پورا منظرنامہ جزئیات کے ساتھ سامنے آجاتا ہے۔.........................(ادارہ)

شاہد اختر انصاری: سب سے پہلے گزارش ہے کہ اپنی تعلیم اور ادبی زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ بتائیں۔

حسین الحق: بتاریخ 10 محرم بمطابق 2 نومبر 1949 سہسرام میں پیدا ہوا، بسم اللہ جد اور دادا پیر وصی الاولیا حضرت وصی الحق مسکین اصدقی نے کرائی، ابتدائی تعلیم والد و مرشد حضرت مولانا محمد انوارالحق شہودی نازش سہسرامی کے زیرنگرانی ہوئی۔ مدرسہ خانقاہ کبیریہ سہسرام سے عالم تک درس و تعلیم مکمل کی۔ آرہ ضلع اسکول سے میٹرک کیا، ایس پی جین کالج سہسرام سے 1969 میں اردو آنرس کیا اور یونیورسٹی میں اول پوزیشن حاصل ہوئی۔ 1971 میں پٹنہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور ایم اے میں بھی اول پوزیشن حاصل ہوئی۔ 1974 میں مگدھ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن پر رہا، 1985 میں 'اردو افسانوں میں علامت نگاری' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کیا۔ 1972 میں بحیثیت لکچرر پہلی تقرری گروگوبند سنگھ کالج پٹنہ سٹی میں ہوئی۔ مگدھ یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو رہا، یونیورسٹی پروکٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ یونیورسٹی میں سینٹر، سنڈیکیٹ کا ممبر بھی رہا، نالندہ اوپن یونیورسٹی (پٹنہ) اور سنٹرل یونیورسٹی (گیا) کی نصاب کمیٹی کا ممبر بھی رہا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، کلکتہ یونیورسٹی، الہ آباد یونیورسٹی، بنگال پبلک سروس کمیشن، یوپی پبلک سروس کمیشن اور جھارکھنڈ پبلک سروس کمیشن کے پرموشن اور تقرری وغیرہ کے مختلف مراحل میں بحیثیت ایکسپرٹ شامل رہا، بہار اردو اکادمی کی مجلس عاملہ کا رکن رہا، فی الحال قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کے تخلیقی پینل کا رکن ہوں۔

ادبی معاملہ یہ ہے کہ 1959 میں پہلی کہانی لکھی (یہ مخطوطہ ہنوز محفوظ ہے)، 1965 میں پہلی کہانی شائع ہوئی۔ 1969 میں پہلا ادبی مضمون (اردو شاعری پر گاندھی جی کے اثرات) شائع ہوا۔ اب تک کم از کم 200 افسانے، 200 مضامین، 200 سے زائد شعری اظہار کے نمونے منصۂ شہود پر آچکے، 7 افسانوی مجموعے اور دو ناول شائع ہوچکے، اس کے علاوہ مذہب، تصوف، تاریخ، سوانح تذکرہ، سیاست، معاشرت مختلف پہلوؤں پر سیکڑوں مضامین لکھے، افسانہ و ناول کے علاوہ چھ کتابیں اس رخ پر بھی ہیں، غالباً چھ کتابوں کی تالیف کی، بیس پچیس خالص تحقیقی مضامین بھی لکھے ناول اور افسانے کی کتابیں نصاب میں بھی شامل رہیں اور ہیں۔ پانچ چھ افراد مجھ پر تحقیقی کام کرنے کی خواہش کے ساتھ مجھ سے ملے اور میں نے بہت سخت اور صاف لہجے میں یہ کہا کہ میں ان کی کوئی مدد نہیں کروں گا، پھر بھی سنا کہ حیدرآباد، جموں اور دہلی وغیرہ میں کچھ لوگوں نے مجھ پر تحقیقی کام کیا ہے اور کررہے ہیں۔

ش ا: علامتی اور تجریدی افسانوں کے سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ کیا اِس رجحان نے اردو افسانے کو نئی جہت اور فنی لہجہ دیا ہے؟

حسین الحق: علامت اور تجرید دونوں دو رویے ہیں۔ جب تک ان دونوں رویوں کو ان کے صحیح سیاق و سباق میں نہیں سمجھا جائے گا۔ ان رویوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا جائے گا۔

علامت ایک طرف اِس پوری کائنات کا اظہاری شعار ہے، دوسری طرف علم بلاغت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے، تیسری طرف لفظ کی معراج ہے اور چوتھی طرف ادھ کچرے ترقی پسند ادیبوں (مثلاً مہندر ناتھ، خواجہ احمد عباس، ذکی انور، اویس احمد دوراں اور بابا نیاز حیدر وغیرہ) کے سپاٹ بیانیہ اور Loud Thinking کے برعکس ایک تخلیقی سرگوشی، ایک پراز معانی جامع بیان، اور ایک طرح کے تخلیقی بدل کی تلاش کے اضطراب کا نمونہ ہے جس نے ہمارے اکابر ادبی اسلاف سے یہ کہلوایا کہ سخن سادہ دِلم رانہ فریبد غالب۔ غالب تو اِس بارے میں اتنے سخت تھے کہ نہ سہی گرمرے اشعار میں معنی نہ سہی پر بھی قانع ہوگئے۔ اِس لیے علامت کی مخالفت غیر ادبی حرکت اور گندی سیاست ہے اور علامت کا انکار ادبی جہالت ہے۔ البتہ ہر تحریک اور رجحان میں جب بوالہوس حسن پرستی شعار کرنے لگتا ہے تو نتیجہ غلط اور مضحکہ خیز دونوں برآمد ہونے لگتا ہے، وہ ہوا، اُس سے انکار نہیں مگر اس کے باوجود علامت کی اہمیت سے انکار نہیں اور اُس کے ترک کے لیے بندہ تیار نہیں۔ جس علامت نے بازگوئی، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، ہزار پایہ جیسے درجنوں افسانے اردو ادب کو دیے اُس کا انکار ادب اور ادبی روایت کے تئیں دشمنی کی علامت ہے۔ ابھی گزشتہ سالوں جو ناول، غلام باغ، آیا ہے، وہ اِس بات کا بھی ثبوت ہے کہ علامت ہنوز زندہ ہے اور مقبول ہے۔

رہی بات تجریدی افسانوں کی، تو اردو میں تجریدی افسانے لکھے ہی کتنے گئے۔ تجرید و تفرید کا مسئلہ خاصا فلسفیانہ ہے اور یہ انٹرویو غالباً کسی تفصیلی فلسفیانہ گفتگو کا متحمل نہیں ہے، ویسے بھی اردو میں اس کی کچھ مثالیں بلراج مین را، احمد ہمیش، اکرام باگ اور علی امام کے یہاں ملتی ہیں مگر یہ ایسا اسکائی لیب ہے جو خلا میں گیا اور لوٹا نہیں۔ اب اسے ڈھونڈھ چراغِ رخ زیبا لے کر۔

ش ا: بحیثیت ایک افسانہ نگار 1980 کے بعد کے افسانے کی سمت و رفتار سے متعلق کیا کہیں گے؟

حسین الحق: 1980 کے بعد کا منظرنامہ بہت خوب صورت اور اطمینان بخش ہے۔ سلام بن رزاق، ذکیہ مشہدی، زاہدہ حنا، احمد داؤد، منشا یاد، اسد محمد خاں، شوکت حیات، شموئل احمد، عبدالصمد، شفق، طارق چھتاری، سید محمد اشرف، غضنفر، اچھے اور کامیاب افسانوں اور افسانہ نگاروں کی ایک کہکشاں سی بکھری ہوئی ہے۔ آپ 1980 سے 90-1985 کے درمیان کے رسائل کا مطالعہ فرمائیں، میری بات کی تصدیق ہوجائے گی۔ مزید برآں مذکورہ بالا فنکاروں کی فنکاری کی یہ روایت اتنی مضبوط اور نامیاتی تھی کہ اِسی روایت نے آگے چل کر ساجد رشید، آصف فرخی، محسن خاں، مشرف عالم ذوقی، خالد جاوید، شاہد اختر، قاسم خورشید اور صدیق عالم وغیرہ کی گویا کہ ادبی رہنمائی کی نتیجتاً آج جو رحمان عباس، صغیر رحمانی، احمد صغیر، نورالحسنین، اُدھر پاکستان میں علی اکبر ناطق وغیرہ دکھائی دے رہے ہیں، اِس سارے خوب صورت منظرنامے کی زیبائش 1980 سے 1990 کے درمیان سامنے آنے والی مذکورہ بالا سینئر افسانہ نگاروں کی فنی کوشش کا نتیجہ ہے۔

ش ا: تقسیم ہند کے دوران لکھے گئے افسانوں کی طرح اب افسانے کیوں نہیں لکھے جارہے ہیں؟

حسین الحق: افسانے تو اب سجاد حیدر یلدرم کی طرح بھی نہیں لکھے جارہے ہیں، پریم چند کی طرح بھی نہیں لکھے جارہے ہیں، رجحانِ جدیدیت کے دورِ شباب کی طرح بھی نہیں لکھے جارہے ہیں معاملہ یہ ہے کہ تقسیم ہند کے آگے پیچھے فنکاروں کی تخلیقی سائیکی جس انجذابی عمل سے گزر رہی تھی اور اقدار کی جس شکست و ریخت کو جھیل رہی تھی آج وہ سیاق و سباق موجود ہی نہیں ہے۔ آج باپ بیٹی کے ساتھ زنا بالجبر کررہا ہے، شموئل احمد نے مہاماری میں سیاسی عہدہ پانے کے لیے عورتوں کو استعمال کرتے دکھایا ہے، سروگیٹ ماں بیٹے کا رشتہ سامنے آگیا ہے۔ ورچوئل ریئلٹی نے حاضر اور غائب کی ساری منطق الٹ دی ہے۔ عاشق و معشوق کے درمیان کا مقدس پیار مذاق کا موضوع بن گیا ہے۔ پہلے زمانے میں جنسی طور پر لوگ خود مکتفی ہوا کرتے تھے۔ آج کی عصمت چغتائی کو 'لحاف' کی ضرورت نہیں ہے۔ عورتیں علی الاعلان ایک دوسرے کے لیے کفایت کررہی ہیں۔ Homo Sex جو کبھی بہت ناپسندیدہ تھا۔ اب جائز بن چکا۔ اخلاقی، ثقافتی اور ذہنی سطح پر اتنا بدلاؤ آچکا ہے کہ اگر کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور سعادت حسن منٹو (بفرضِ محال) دوبارہ جنم لیں تو وہ بھی تقسیم ہند کے دوران لکھے گئے افسانوں کی طرح افسانے نہیں لکھ پائیں گے۔

ش ا: موجودہ فکشن اور اس کے لکھنے والوں پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

حسین الحق: موجودہ فکشن کا کوئی ایک چہرہ نہیں ہے اور میرے خیال میں یہ اچھی بات ہے آج ادب پر نہ تو ترقی پسندی کا غلبہ ہے نہ جدیدیت اور نہ ہی مابعد جدیدیت کا یہ دور امتزاجی ادب کا دور ہے۔ آج کا اچھا ادب سماجی سروکار اور انسانی سروکار دونوں کا حامل ہے۔ بیانیہ نہ تو سپاٹ ہے اور نہ ہی مغلق و مہمل۔ علامت کی پذیرائی کم ہے مگر ادب میں تشبیہی نظام سے مفر کہاں ہے؟ مطالعے کا دوسرا رخ یہ ہے کہ ان دنوں ادب میں بھی جمہوریت کی پذیرائی ہے۔ ترقی پسند بھی اپنی بول بول رہے ہیں، جدید ادبا و شعرا بھی جلوے دکھا رہے ہیں اور مابعد جدید ادب کی نفیری بھی سنائی دے رہی ہے۔ میں ذاتی طور پر شاہد اختر (شاعر اور افسانہ نگار دونوں)، مشرف عالم ذوق، قاسم خورشید، صدیق عالم، ترنم ریاض، شائستہ فاخری، احمد صغیر، صغیر رحمانی، رحمٰن عباس اور افسانہ نگار خالد جاوید کو شوق سے اور غور سے پڑھتا ہوں۔ انھیں پڑھ کر اکثر و بیشتر خوشی ہی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی الجھن کا شکار بھی ہوجاتا ہوں۔ مگر ایسی الجھن تو کبھی کبھی مجھے خود اپنے آپ سے بھی ہوجاتی ہے۔

ش ا: کیا تنقید نے تخلیقیت کو نقصان پہنچایا ہے؟

حسین الحق: تنقید نے تخلیقیت کو کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ تخلیق اور تخلیقیت کو نقصان پہنچانا تنقید کا کبھی ہدف رہا ہی نہیں۔ البتہ کچھ ناقدوں نے کچھ تخلیق کاروں کو نقصان ضرور پہنچایا اور یہ نقصان مخالفت کرکے یا تخلیق کار کو رد کرکے نہیں پہنچایا گیا بلکہ یہ نقصان ان کی حمایت کرکے، ان کو قبول کرکے اور ان کی بہت زیادہ تعریف کرکے پہنچایا گیا۔ گیان سنگھ شاطر اور ناول نگار صلاح الدین پرویز اس کی نمایاں مثالیں ہیں— اب یہی مخالفت اور دشمنی شموئل احمد کے ساتھ کی جارہی ہے کہ ان کے اچھے ناول 'ندی' کو پس پشت ڈال کرکے ان کے کمزور ناول 'مہاماری' کی تعریف کی جارہی ہے۔

ش ا: اردو ادب میں گروپ بندی کی پرانی روایت ہے، کیا اب بھی اس کی پاسداری ہورہی ہے؟ اگر ہاں تو اس کے اسباب اور اثرات پر اظہارِ خیال فرمائیں۔

حسین الحق: یقیناً گروپ بندی کی پرانی روایت ہے اور اب بھی اس کی پاس داری ہورہی ہے مگر یہ کوئی انوکھی اور بری بات نہیں ہے۔ انسان سماجی جانور رہے، جتھے میں رہنا اس کی عادت اور ضرورت دونوں ہے۔ ہر دور میں ہم خیالوں اور ہم نواؤں کا الگ الگ حلقہ ہوتا ہے۔ آج بھی اگر ہے تو کوئی بری بات نہیں ہے۔ ہر حلقے والا اپنے حلقے والے کا خیال کرتا ہے، آج بھی کوئی اگر اپنے حلقے کا ساتھ دے رہا ہے تو یہ بھی کوئی بری بات نہیں

ہے بلکہ اچھی ہی بات ہے مگر اس حلقہ بندی کے سبب اپنے حلقے کے چور کو شاہ قرار دیا جائے۔ پیادہ کو فرزیں بنا دیا جائے اور لئیموں کو خسروی دے دی جائے۔ حلقہ بندی اور گروپ بندی کا یہ غلط اثر ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔

ش ا: کیا آپ اس بات سے اتفاق رکھتے ہیں کہ ہندوستان میں اردو زبان و ادب کا مستقبل روشن ہے؟

حسین الحق: ہندوستان میں اردو زبان کا مستقبل یقینی طور پر روشن ہے۔ 'ہندوستانی زبان' (اردو+ ہندی) کے وسیع خاندان کا ایک حصہ ہونے کے سبب 'بولی' کے طور پر اور عربی فارسی کے مشابہ ہونے کے سبب زبان (رسم الخط) کے طور پر یہ زبان ابھی کئی صدیوں تک اپنے جلوے بکھیرے گی۔ اردو زبان کے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے البتہ ایک مرتبہ پھر (اگر موجودہ صورتِ حال برقرار رہی تو) اردو زبان اپنا علاقہ بدلنے کے موڈ میں ضرور نظر آ رہی ہے۔ شاید بہار، یوپی اور مدھیہ پردیش سے یہ زبان دکن، مہاراشٹر اور کشمیر کی طرف ہجرت کر جائے۔

اب رہی بات ادب کی تو یہ معاملہ ذرا مشکل ہے، میں ابھی فیصلہ نہیں کر پا رہا ہوں مگر ادب اور صحافت کی سرحدیں جس طرح مٹ رہی ہیں، جدیدیت کی مخالفت میں تخلیقیت سے جس طرح جان چھڑائی جا رہی ہے، طالبانی اور سنگھی ذہنیت کے غلبے کے سبب 'سیکولر ذہانت' کو جس طرح کچلا جا رہا ہے، کیفیت پر صورتِ حال کو جس طرح غالب کیا جا رہا ہے، علامت دشمنی کے سبب ننگے مادر زاد برہنہ بیانیہ کو جس طرح گھر میں بٹھایا جا رہا ہے۔ یہ سارا مرحلہ ادب دشمنی کا مرحلہ ہے۔ اللہ ادب کو ادیب نما پہلوانوں کی اِس پہلوانی سے بچائے۔

ش ا: اردو کو روزگار سے جوڑنے کی بات آپ کس حد تک صحیح مانتے ہیں؟ اس سلسلے میں آپ کا لائحہ عمل کیا ہوگا؟

حسین الحق: میں اصولی طور پر علم و ادب اور زبان کو معاش کا ذریعہ ماننے اور بنانے کا قائل نہیں مگر عملی طور پر ایسے مواقع پیدا ہو جائیں یا حاصل ہو جائیں تو اچھی بات ہے۔ معاش اور روزگار کا اصل ذریعہ ہنر ہے علم نہیں۔ ہنر کے مختلف علومیوں (faculties) کی تعلیم اگر اردو زبان میں ہو تو یہ بھی بہت اچھی بات ہے مگر اس کے لیے اردو والوں کو پہلے وہ ماحول بنانا ہوگا جس میں اردو کے ذریعے تعلیم پایا ہوا نوجوان خود کو اجنبی نہ محسوس کرے۔

ش ا: اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے قومی اردو کونسل کی جانب سے اٹھائے گئے اقدامات پر آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

حسین الحق: اردو زبان و ادب کی تاریخ میں قومی اردو کونسل کی خدمات سنہرے حرفوں سے لکھی جائیں گی کیوں کہ (1) کلاسیکی ادب کی اشاعت (2) نصابی ضروریات کی تکمیل (3) قومی علمی سرمائے کی حفاظت (4) سائنس، تکنالوجی، عمرانیات، ثقافت و معاشرت اور کمپیوٹر سائنس سے متعلق کتابوں کی اشاعت (5) کمپیوٹر کی دنیا سے اردو والوں کو مکمل طور پر جوڑنے کی کوشش (6) سیمینار، کانفرنس، ورکشاپ، مشاعرے اور مختلف علمی و تکنیکی پروجیکٹوں کی معاونت کے ذریعے قومی اردو کونسل بیش بہا خدمات انجام دے رہی ہے۔ ایک کمی تخلیقی سطح پر محسوس ہو رہی تھی، گزشتہ دنوں اس کی بھی تلافی کی گئی، تخلیقیت کو فروغ دینے کے لیے ایک خاص ادبی و تخلیقی رسالہ نکالنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور یہ بھی طے کیا گیا ہے کہ تخلیقی تحرک کی زیادہ سے زیادہ ہمت افزائی کی جائے گی ان تمام صائب اقدامات کے لیے بطور خاص پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین اردو والوں کے شکریے کے مستحق ہیں۔

ش ا: اردو کی نئی نسل کو کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

حسین الحق: (1) اپنے گھروں میں بچوں کا ایک رسالہ اور ایک اردو اخبار ضرور منگوایئے (2) انٹر یا کم از کم میٹرک تک اردو ضرور پڑھیے (3) مذہبی ضرور بنیے مگر دوسرے مذہب والوں کو اپنے سے کمتر اور برا مت سمجھیے اور اللہ کی مخلوق سے محبت کیجیے، اپنے اندر سے نفرت کا جذبہ ختم کیجیے (4) زندگی میں ادبی رویہ اپنایئے اور یہ جاننے کی کوشش کیجیے کہ ادبی رویہ کیا ہے (5) اپنے ریزلٹ اور اپنی صلاحیت کے درمیان بہت فرق مت پیدا ہونے دیجیے یعنی اگر آپ چاہتے ہیں کہ زندگی کے ہر میدان میں آپ اول مقام پر رہیں تو اِس کے لیے آپ خود اپنے آپ کو اوّل درجے کی صلاحیت کا مالک بنایئے یعنی پیروی، پیسہ اور 'باہوبل' سے کچھ مت حاصل کیجیے۔ کوشش کیجیے کہ آپ کو جو حاصل ہو وہ آپ کی صلاحیت کے سبب آپ کو ملے۔

ش ا: تقسیم ہند کے وقت لکھا گیا فکشن اردو میں تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے؟

حسین الحق: پریم چند سے منسوب یہ خیال اگر صحیح ہے کہ ''تاریخ میں سب جھوٹ ہوتا ہے سوا نام کے اور ادب میں سب سچ ہوتا ہے سوا نام کے'' تو یقیناً تقسیمِ ہند کے وقت لکھا گیا فکشن تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ بات ہر عہد کے ادب کے بارے میں کہی جا سکتی ہے، بس اتنے سے فرق کے ساتھ کہ تاریخ میں واقعات بیان کیے جاتے ہیں اور ادب میں واقعات محسوس کیے جاتے ہیں اور چوں کہ بیان میں مصلحت، تعصب اور کذب کا امکان موجود ہے اس لیے تاریخ کی صداقت پر سوالیہ نشان کھڑا ہو جاتا ہے مگر ادب احساسات کی دنیا کا منظر نامہ ہے اور تخلیق کار اپنے احساس کے ساتھ مخلص رہتا ہے، اگر 100 فی صد نہیں تو 90 فی صد ضرور۔

ش ا: 'اردو دنیا' کے قارئین کے لیے آپ کیا کہیں گے؟ اس سلسلے میں آپ کا کیا پیغام ہوگا—؟

حسین الحق: (1) قومی کونسل کے رسائل و کتب پڑھیے اور خرید کر پڑھیے۔ (2) قومی اردو کونسل کے مختلف پروگراموں سے خود کو جوڑیے (3) اپنی تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعے قومی کونسل کی حمایت جاری رکھیے۔ (4) پروفیسر وسیم بریلوی اور خواجہ محمد اکرام کی محنتوں کی پذیرائی کیجیے (5) محکمۂ فروغ انسانی وسائل کو بھی اِس کا احساس دلایئے کہ ان کی کوششوں اور ارادے کے آپ حامی اور معترف ہیں (6) اگر کوئی ضرورت یا کمی محسوس ہو تو قومی کونسل کے ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام سے ذاتی طور پر اور بالمشافہ گفتگو کے ذریعے اس کا حل نکالنے کی کوشش کیجیے۔ میرا یقین ہے کہ اردو والے ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کو کافی خلیق، معاون اور متحرک پائیں گے۔

■

Shahid Akhtar,38/7, Noor Nagar, Jamia Nagar, New Delhi - 110025

Husainul Haque,Sir Syed Colony, New Karim Gunj, Road No 6, Gaya 823001 (Bihar)

حسین الحق

نام: حسین الحق

تاریخ پیدائش: 2 نومبر 1949

والد کا نام: مولانا محمد انوار الحق

دادا: وصی الحق

تعلیم: ابتدائی تعلیم خانقاہ کبیریہ سہسرام سے عالمیت
- ضلع اسکول آرہ، میٹرک
- ایس پی جین کالج سہسرام بی اے اردو آنسر 1969
- پٹنہ یونیورسٹی ایم اے اردو 1971
- مگدھ یونیورسٹی ایم اے فارسی 1974
- پی ایچ ڈی اردو میں 1985

تصانیف: ان کے مشہور ناول 'فرات'، 'بولو مت چپ رہو"۔ **افسانے کے مجموعے:** پردۂ شب، صورت حال، جانا انجانا، مطلع، سوئی کی نوک پر، رُکا لمحہ۔

عبدالحی

قومی اردو کونسل کی پہلی

بین الاقوامی اردو کانفرنس

اکیسویں صدی میں اردو : فروغ اور امکان

4 سے 6 ستمبر تک جے این یو آڈیٹوریم، نئی دھلی میں جاری رھنے والی سہ روزہ اردو کانفرنس کی رو داد

اکیسویں صدی میں تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی بہت سارے نئے چیلنجز درپیش ھیں۔ کونسل فروغ اردو مشن کے تحت متعدد اسکیموں کے علاوہ اردو زبان کے مسائل اور اس کی اھمیت اور ترقی کے موضوع پر ملک کے مختلف علاقوں میں سیمینار و سمپوزیم وغیرہ کا بھی انعقاد کرتی آئی ھے اور اب کونسل نے پھلی دفعہ عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا ھے تاکہ قومی اور بین الاقوامی تناظر میں اردو زبان کے فروغ کے امکانات کو تلاش کیا جاسکے اور اس کی ھمہ جھت ترقی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا جاسکے۔ اردو خالصتاً آریائی زبان ھونے کے ساتھ ساتھ عالمی رابطے کی بھی زبان ھے اور آج یہ زبان امریکہ، کناڈا، برطانیہ، روس، مصر، ترکی، ایران، ماریشس جیسے ممالک میں بھی مقبول ھوتی جارھی ھے۔ اردو کی نئی بستیوں سے اردو زبان و ادب کو ایک نئی جھت ملی ھے اور بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد اسی پس منظر میں کیا گیا ھے۔ کانفرنس کا موضوع 'اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان' رکھا گیا تھا۔ جواھر لال نھرو یونیورسٹی کے کنونشن سینٹر میں 4سے 6 ستمبر 2013 تک چلی اس کانفرنس میں اردو زبان ادب کے مسائل، ترجمے کے چیلنجز، رسم الخط، جدید ٹکنالوجی، اردو کو روزگار سے جوڑنے و اردو ذریعہ تعلیم رائج کرنے سے متعلق موضوعات پر ملک و بیرون ملک کے دانشوروں، محققوں، اور اسکالروں نے تبادلہ خیال کیا۔ کانفرنس کے آخری دن کئی تجاویز اور سفارشات پیش کی گئیں جنھیں حکومت ھند کے سامنے رکھا جائے گا تاکہ اردو زبان و ادب کو نئی اونچائیوں سے ھمکنار کرایا جا سکے۔ آئندہ صفحات پرملاحظہ کریں اس کانفرنس کی روداد:

قومی اروو کونسل برائے فروغ اردو زبان کو ہندوستانی حکومت نے پورے ملک میں اردو زبان وادب کی ترویج و ترقی کے لیے قومی نوڈل ایجنسی کا درجہ دیا ہے اور یہ وزارت ترقی انسانی وسائل حکومت ہند کا ایک خود مختار ادارہ ہے۔ کونسل پر اردو زبان وادب کے فروغ کے ساتھ ساتھ فارسی وعربی زبانوں کے فروغ میں تعاون کرنے کی بھی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ اپنے قیام کے بعد سے ہی قومی اردو کونسل اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے مختلف سطحوں پر کام کر رہی ہے اور آج کونسل کا دائرہ کار پورے ملک میں پھیل چکا ہے۔ کونسل اردو کی اشاعت وترویج کا نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا کا سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس ادارے نے جہاں نایاب کتابوں کی اشاعت وتشہیر کا فریضہ انجام دیا ہے وہیں کتابوں کی اشاعت میں مالی تعاون، سیمینار و ورکشاپ، تربیتی کورسز اور اردو کو جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے میں بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔

قومی اردو کونسل نے اردو زبان و ادب کی مختلف جہات پر کام کرنے کے علاوہ اردو زبان کو عصری ضروریات ووسائل سے ہم آہنگ کرنے کی بھی کوشش کی ہے اور ہزاروں طالب علموں کو کمپیوٹر وگرافک ڈیزائن کورس کی تربیت دی ہے جو آج مختلف اداروں میں کام کر رہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں تمام زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی بہت سارے نئے چیلنجز درپیش ہیں۔ کونسل فروغ اردو مشن کے تحت متعدد اسکیموں کے علاوہ اردو زبان کے مسائل اور اس کی اہمیت اور ترقی کے موضوع پر ملک کے مختلف علاقوں میں سیمینار وسمپوزیم وغیرہ کا بھی انعقاد کرتی آئی ہے اور اب کونسل نے پہلی دفعہ عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا ہے تاکہ قومی اور بین الاقوامی تناظر میں اردو زبان کے فروغ کے امکانات کو تلاش کیا جاسکے اور اس کی ہمہ جہت ترقی کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا جاسکے۔ اردو خالصتاً آریائی زبان ہونے کے ساتھ ساتھ عالمی رابطے کی بھی زبان ہے اور آج یہ زبان امریکہ، کناڈا، برطانیہ، روس، مصر، ترکی، ایران، ماریشس جیسے ممالک میں بھی مقبول ہوتی جارہی ہے۔ اردو کی نئی بستیوں سے اردو زبان وادب کو ایک نئی جہت ملی ہے اور بین الاقوامی اردو کانفرنس کا انعقاد اسی پس منظر میں کیا گیا ہے۔ کانفرنس کا موضوع 'اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان' رکھا گیا تھا۔ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے کنونشن سینٹر میں 4 سے 6 ستمبر 2013 تک چلی اس کانفرنس میں اردو زبان ادب کے مسائل، ترجمے کے چیلنجز، رسم الخط، جدید ٹکنالوجی، اردو کو روزگار سے جوڑنے و اردو ذریعہ تعلیم رائج کرنے سے متعلق موضوعات پر ملک وبیرون ملک کے دانشوروں، محققوں، اور اسکالروں نے تبادلہ خیال کیا۔ کانفرنس کے آخری دن کئی تجاویز اور سفارشات پیش کی گئیں جنھیں حکومت ہند کے سامنے رکھا جائے گا تاکہ اردو زبان و ادب کو نئی اونچائیوں سے ہمکنار کرایا جا سکے۔ کانفرنس سے قبل پریس کلب آف انڈیا میں ایک پریس کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جس میں کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے صحافیوں ونامہ نگاروں سے گفتگو کرتے ہوئے کانفرنس کے تعلق سے تمام معلومات فراہم کیں۔ کانفرنس میں دنیا کے مختلف ممالک کے شعرا، ادبا و ناقدین نے شرکت کی۔

جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کے وسیع اور کشادہ کنونشن سنٹر میں اس کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے عالی جناب مرکزی وزیر خارجہ جناب سلمان خورشید نے اردو کو مشترکہ تہذیب کی مستحکم علامت بتایا، انھوں نے کہا کہ اردو زبان ہندوستان کی جمہوری اقدار کی پاسدار ہے۔ انھوں نے قومی اردو کونسل کے مختلف منصوبوں، پروگراموں اور سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ کونسل نے اردو زبان کے فروغ کی کوششوں سے قومی بھائی چارے اور اتحاد و اتفاق کی مشعل روشن کر رکھی ہے جس سے ملک کی بڑی آبادی فیضیاب ہورہی ہے۔ اردو زبان اپنی مسحور کن خصوصیات کی بنا پر پوری دنیا میں اپنی منفرد شناخت رکھتی ہے۔ قومی اردو کونسل نے اردو زبان کو نہ صرف روزگار سے جوڑنے میں اہم کردار ادا کیا ہے بلکہ جدید ٹکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے میں بھی کونسل کی کوششوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کونسل نے اردو وکی پیڈیا، اردو کی بورڈ، اردو فونٹ، اردو ٹولس بھی لانچ کیے ہیں جن سے موبائل فون اور کمپیوٹر، لیپ ٹاپ میں اردو کا استعمال ممکن ہوسکا ہے۔ کونسل کا یہ قدم بے حد خوش آئند ہے۔ کونسل نے حال ہی میں مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، وزارت برائے اقلیتی امور کے ساتھ ایک مفاہمت نامے پر بھی دستخط کیے ہیں جس کے تحت اقلیتوں کے کثیر آبادی والے اضلاع اور بلاک میں ہر سال کمپیوٹر کی تربیت کے لیے CABA-MDTP کے 100 مراکز کھولے جائیں گے۔ اس کے علاوہ اقلیتوں کی تربیت سے متعلق ایک نئی اسکیم کا آغاز بھی کیا جائے گا۔ وزیر خارجہ نے امید ظاہر کی کہ اس بین الاقوامی کانفرنس سے ہر سطح پر اردو کی مزید ترقی کے لیے ایک روڈ میپ ابھر کر سامنے آئے گا۔

اس موقع پر مرکزی وزیر برائے ترقی انسانی وسائل ڈاکٹر ایم ایم پلم راجو نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ اردو برصغیر میں رابطے کی سب سے مضبوط اور بڑی زبان ہے۔ یہ زبان برصغیر سے باہر جا بسے تمام لوگوں کی ثقافتی اور تہذیبی ترجمانی کرتی ہے۔ اردو زبان دنیا کی چوتھی سب سے بڑی زبان ہے۔ یہ زبان کسی خاص مذہب اور فرقے کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ اپنی شیریں بیانی کی وجہ سے دلوں کی زبان بن چکی ہے۔ یہی زبان فلموں اور تفریحی پروگراموں میں سب سے زیادہ استعمال کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ خلیجی ممالک، مشرق وسطیٰ، مغربی یورپ اور شمال مغربی یوروپی ممالک اور امریکہ و کناڈا وغیرہ میں قیام پزیر برصغیر کی آبادی کی تہذیب کی زبان ہے۔ ''بین الاقوامی کانفرنس کے مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے وزیر موصوف نے بتایا کہ یہ کانفرنس

تینوں وزرا، پروفیسر ایس کے سپوری، پروفیسر وسیم بریلوی اور ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین کے ہمراہ کانفرنس ہال میں تشریف لا رہے ہیں۔

حکومت ہند کے ذریعے ہندوستانی زبانوں خصوصاً اردو کے فروغ کے لیے کی جارہی کوششوں وسرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے ایک طرح کا محاسبہ ہے تاکہ ہم اکیسویں صدی میں درپیش چیلنجوں سے نبرد آزما ہوسکیں۔ ڈاکٹر پلم راجو نے کہا کہ قومی اردو کونسل ایک خودمختار ادارہ ہے جو وزارت برائے ترقی انسانی وسائل کے تحت اردو زبان وادب کے فروغ واشاعت کی سمت میں قومی نوڈل ایجنسی کے طور پر کام کرتا ہے۔ انھوں نے این سی پی یو ایل کی کوششوں کی ستائش کی اور کہا کہ ادارے کی اطمینان بخش کارکردگی کو دیکھتے ہوئے حکومت نے حال ہی میں اس کا بجٹ 29 کروڑ سے بڑھا کر 60 کروڑ کردیا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ آنے والے دنوں میں قومی اردو کونسل کے دائرہ کار میں مزید توسیع ہوگی۔

وزیر مملکت برائے ترقی انسانی وسائل عالی جناب جتن پرساد نے کونسل کی عالمی کونفرنس میں اپنی شرکت کو باعث فخر بتایا اور کہا کہ دنیا کے مختلف ممالک سے تشریف لائے ہوئے معروف اسکالرز، ماہرین تعلیم، شاعروں، ناقدین، اور فنکاروں سے سجی اس کہکشاں میں میری شرکت میرے لیے انتہائی مسرت کی بات ہے۔

اس موقعے پر معروف فکشن نگار جناب سید محمد اشرف نے کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے کونسل کی کارگزاریوں کی ستائش کی، ساتھ ہی عربی اور فارسی کو یو پی ایس سی جیسے امتحانات سے نکالنے کو حکومت کے غیر دانش مندانہ فیصلے پر محمول کیا۔ انھوں نے ارباب اقتدار سے اردو زبان کی مزید ترقی کی سمت میں سنجیدہ ہونے کی گزارش کی۔

اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب پروفیسر وسیم بریلوی نے بین الاقوامی کانفرنس کو ملک کی تاریخ کا ایک اہم باب قرار دیتے ہوئے کہا کہ آج دنیا کی مختلف اردو بستیوں سے تشریف لائے شعرا و ادبا کی کہکشاں آباد ہے۔ ہم نے انھیں یہاں اس لیے جمع کیا ہے تاکہ اردو زبان کے فروغ سے متعلق مستقبل کا لائحہ عمل مرتب کیا جاسکے۔ انھوں نے اردو کو محبت کی زبان سے تعبیر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے امید ہے کہ اس کانفرنس سے زبان کے فروغ میں نئے نکات سامنے آئیں گے اور نئی سمتیں متعین ہوں گی۔

قومی اردو کونسل کی مختلف کارکردگیوں پر روشنی ڈالتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ کونسل کی اس کانفرنس کے موضوعات موجودہ عہد میں اردو کی جمہوری اقدار کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے سرکاری سرپرستی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ حکومت کی مدد کے بغیر عالمی کانفرنس کا انعقاد ممکن نہیں تھا۔ جواہر لعل نہرو یونیورسٹی کی جانب سے پروفیسر ایس کے سپوری نے استقبالیہ کلمات ادا کیے اور جے این یو کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے اردو کو دل کی زبان قرار دیا۔

اخیر میں جوائنٹ سکریٹری (لینگویجز) وزارت برائے ترقی انسانی وسائل جناب اننت کمار سنگھ نے اظہارِ تشکر کیا۔ اس پروگرام میں جناب اشوک ٹھاکر (سکریٹری، وزارت برائے ترقی انسانی وسائل)، جناب انیس انصاری (وائس چانسلر، خواجہ معین الدین چشتی اردو عربی فارسی یونیورسٹی) کے علاوہ ملک و بیرون ملک سے تشریف لائے محبانِ اردو نے شرکت کی۔ افتتاحی اجلاس کے بعد شام غزل کا انعقاد کیا گیا جس میں ممبئی کی مشہور گلوکارا پوجا چرن گونٹڈے نے اپنی مسحورکن آواز میں غزلیں سنا کر سامعین کو محظوظ کیا۔

اردو رسم الخط کی ترویج وتربیت آج اردو زبان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ اس شاندار زبان کو نئی ٹیکنالوجی سے جوڑنے میں قومی اردو کونسل نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ صحیح معنوں میں آج دنیا میں اردو کو فروغ دینے والا سب سے بڑا ادارہ بن چکا ہے۔ ان خیالات کا اظہار بین الاقوامی اردو کانفرنس کے دوسرے دن 5 ستمبر کے اجلاس میں کیا گیا۔ یہ کانفرنس نہ صرف کونسل کی تاریخ میں اہمیت کی حامل ہے بلکہ اردو زبان و ادب کی تاریخ میں بھی اسے سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔

’اکیسویں صدی میں اردو: فروغ اور امکان‘ کے موضوع پر قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ذریعے منعقد کی گئی بین الاقوامی کانفرنس میں پہلے سیشن کا موضوع ’اردو کے فروغ میں سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کا کردار‘ تھا، جس میں نسیم عارفی، خوشتر نورانی اور پروفیسر عبدالحق نے اپنے وقیع مقالات پیش کیے۔ نسیم عارفی نے مقالے میں حیدرآباد کے تناظر میں اردو زبان و ادب کی تعلیم وتربیت سے متعلق مسائل پر اظہار خیال کیا، خوشتر نورانی نے اپنے مقالے میں مدارس کے حوالے سے گفتگو کی جبکہ پروفیسر عبدالحق نے اردو زبان کی مختلف جہتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے طبی کالجوں کی اردو خدمات کا بھی تذکرہ کیا اور حکومت سے ایسے اداروں کے قیام اور ترقی پر توجہ دینے کی درخواست کی۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا ولی رحمانی، پروفیسر وبھوتی نرائن رائے سابق وزیر مملکت محمد علی اشرف فاطمی اور پروفیسر وسیم بریلوی نے کی جبکہ نظامت پروفیسر اعجاز علی ارشد نے انجام دی۔

چائے کے وقفے کے بعد سیشن کے دوسرے اجلاس میں کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کونسل کی تمام کارگزاریوں پر مشتمل ایک پاور پوائنٹ پریزینٹیشن پیش کیا۔ پاکستان کے معروف کالم نگار جناب عطاء الحق قاسمی نے کونسل کی خدمات کی ستائش کی اور کہا کہ کونسل واقعی اردو کی خدمت کررہی ہے۔ انجمن ترقی اردو کے جنرل سکریٹری جناب اطہر فاروقی نے انجمن ترقی اردو ہند کی خدمات کا جائزہ لیتے ہوئے انجمن کے دائرہ کار کی توسیع پر زور دیا۔ ڈاکٹر ظفر محمود نے اپنے مقالے میں ہندوستانی آئین کی مختلف دفعات کا حوالہ دیتے ہوئے ملک میں اردو کی صورتحال بیان کی اور ملکی و عالمی سطح پر اردو کے فروغ کا ایک منظم و مربوط لائحہ عمل مرتب کرنے کی درخواست کی۔ انھوں نے حکومت کی اسکیموں کا جائزہ لیا اور کہا کہ اردو والوں کو بھی اپنا محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے

سلمان خورشید، وزیر خارجہ حکومت ہند

ڈاکٹر ایم منگاپتی پلم راجو، مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند

جتن پرساد، وزیر مملکت برائے فروغ انسانی وسائل، حکومت ہند

کہ ہم خود اردو کے فروغ کی کتنی سنجیدہ کوششیں کر رہے ہیں۔اس اجلاس میں معروف ادیب جناب غلام نبی خیال نے جموں وکشمیر کے وزیراعلی عمر عبداللہ کا اس کانفرنس کے لیے خصوصی پیغام بھی پڑھ کرسنایا۔اپنے پیغام میں وزیراعلیٰ نے کونسل کی ستائش کرتے ہوئے کانفرنس کی کامیابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

مجلس صدارت میں شامل سابق مرکزی وزیر مملکت جناب علی اشرف فاطمی نے صدارتی کلمات میں کہا کہ اردو ہندوستان کی ملٹی نیشنل زبان ہے،اسے عالمی زبان کا درجہ حاصل ہے۔قومی اردو کونسل کو بنیادی تعلیم پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے اوراس ادارے کوانٹرمیڈیٹ کی سطح پر سی بی ایس سی کے اردو اسکولوں کے قیام کی سمت میں کوششیں کرنی چاہئیں۔مجلس صدارت کے دوسرے رکن مہاتما گاندھی انتر راشٹریہ ہندی وشو ودیالیہ کے وائس چانسلر جناب وبھوتی نرائن رائے نے کہا کہ اردواور ہندی کا غم ایک جیسا ہے،ہمیں مل جل کران زبانوں کے فروغ کی کوششیں کرنی ہوں گی۔ ہندوستان اردو کے بغیر سیکولر ہو ہی نہیں سکتا۔معروف عالم دین اور سماجی کارکن ولی رحمانی نے صدارتی کلمات میں کہا کہ جمہوریت میں زبان کی سب سے بڑی قیمت ہے اگر سرکار ہماری بات نہیں سنے گی تو ہم مضبوطی سے اپنا احتجاج درج کرائیں گے۔ حکومتوں کے کندھوں پر زبانیں چلا کرتی ہیں، زندہ نہیں رہتیں۔علم کو دل اور دماغ سے جوڑ دیا جائے تو علم پر نکھار آئے گا۔کونسل کے وائس چیئرمین اور مجلس صدارت کے رکن پروفیسر وسیم بریلوی نے مختصراً اس سیشن میں پڑھے گئے 6 مقالوں کا جائزہ لیا اور کہا کہ ان مقالوں میں دردمندی تھی اور ہمیں اردو کے فروغ کی سمت میں مزید سنجیدہ کوششیں کرنے کی ضرورت ہے۔

سیمینار کے دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر تقی عابدی ، عطاء الحق قاسمی، پروفیسر عبدالحق اور پروفیسر وسیم بریلوی شامل تھے۔نظامت پروفیسر ابن کنول نے کی۔اجلاس کا موضوع تھا 'اردو کا عالمی تناظر تہذیب و ادب کے حوالے سے'۔سیشن کا پہلا مقالہ ماریشس کے ڈاکٹر احمد رحمت علی نے پڑھا۔انھوں نے ماریشس میں اردو زبان و ادب کی تعلیم وتربیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے بتایا کہ وہاں حکومت اردو کی تشہیر و اشاعت اور فروغ کے لیے ٹیلی ویژن چینلوں اور دیگر ذرائع ترسیل کی مدد لیتی ہے۔زبان اور تہذیب کے درمیان گہرہ رشتہ ہے۔وہی زبان زندہ رہتی ہے جو تہذیب کی پاسداری کرتی ہے۔ قاہرہ سے آئے ڈاکٹر احمد محمد احمد عبدالرحمٰن نے اپنے وقیع مقالے میں خلیجی ممالک میں اردو کے استعمال پر روشنی ڈالی اور یہ بتایا کہ وہاں عرب لوگ بھی اپنی بات چیت میں اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مصر ہی نہیں بلکہ تمام خلیجی ممالک میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔ اِس سمت میں یہاں کے اداروں کو وہاں کی درس گاہوں میں کتابوں کی فراہمی کو یقینی بنانا چاہیے۔

پاکستان کی مجلس ترقی ادب لاہور کے ڈائرکٹر اور معروف ادیب و ناقد ڈاکٹر تحسین فراقی نے مجلس ترقی ادب لاہور کی خدمات پر گفتگو کی اور کہا کہ مجلس نے ادب کے ساتھ دیگر موضوعات پر ہزاروں کتابیں شائع کی ہیں۔انھوں نے مقالے میں جمیل جالبی کی تاریخ ادب اردو کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ چار جلدوں میں اس کتاب کا مجلس ترقی ادب سے شائع ہونا ایک اعزاز ہے۔ پاکستان کے معروف کالم نگار اور شاعر عطاء الحق قاسمی نے اپنے شگفتہ انداز میں برصغیر میں اردو کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی۔انھوں نے پاکستان اور ہندوستان میں اردو کی حقیقی صورتحال کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ آج یہ زبان اردوئے معلیٰ نہ ہوکر اردوئے محلّہ ہوگئی ہے۔ماسکو سے تشریف لائی ڈاکٹر لدمیلا واسیلیوا نے روس میں اردو زبان کے آغاز وارتقا پر اظہارِ خیال کیا۔استنبول کے ڈاکٹر خلیل طوقار نے ترکی میں اردو کی صورتِ حال پر روشنی ڈالی اور کہا کہ زبان کو ختم کرنے کے کئی مجرب نسخے ہیں جنھیں آج برصغیر میں آزمایا جارہا ہے۔ اِس سمت توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

مجلس صدارت کے رکن معروف ناقد و محقق ڈاکٹر تقی عابدی نے پڑھے گئے مقالوں پر مختصراً اظہارِ خیال کرتے ہوئے اردو کی تاریخ پر خوبصورت نثریہ شاعری کی اور اردو کے رسم الخط کے تحفظ، بنیادی تعلیم، اردو کو جدید ٹیکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے، اردو ریڈرشپ کی توسیع اور اردو کتابوں کو اغلاط سے پاک کرنے کے لیے اردو میں پروف ریڈنگ کورس تشکیل دینے پر زور دیا۔انھوں نے کونسل کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ قومی اردوکونسل نے پوری دنیا سے اردو پرستاروں کو جمع کر کے عظیم کارنامہ انجام دیا ہے تاکہ یہ اسکالرس یہاں بیٹھ کر اردو کی ترقی کی سمت میں غور وخوض کرسکیں۔دوسرے دن شام میں ایک بین الاقوامی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔

بین الاقوامی کانفرنس کے تیسرے اور آخری دن پہلے سیشن کا موضوع 'اردو کے فروغ میں فلم اور میڈیا کا کردار' تھا۔ جس میں جلال حفناوی (قاہرہ)، آصف اعظمی، مشرف عالم ذوقی اور شکیل شمسی نے اپنے مقالات پیش کیے۔مصر میں اردو کی صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے جلال حفناوی نے مصر اور ہندوستان کے تجارتی لین دین میں اردو کو ایک مضبوط میڈیم بتایا۔ساتھ ہی اردو کی کتابوں کے عربی تراجم کا حوالہ بھی دیا۔اردو کا فروغ اور ہندوستانی ماس میڈیا پر گفتگو کرتے ہوئے آصف اعظمی نے اردو کو قومی وراثت قرار دیتے ہوئے اردو رسم الخط کو ثقافت کا بے حد اہم حصہ قرار دیا۔ انھوں نے اردو کی روح اور اس کے ورثے کو سامنے رکھ کر نئے چینل اور صحافتی ادارے کے قیام پر بھی زور دیا۔اردو کے تئیں امید کا اظہار کرتے ہوئے مشرف عالمی ذوقی نے بتایا کہ اردو کمیونٹی کے سامنے تشخص کا مسئلہ ہے۔سوتیلے رویے کے باوجود اردو زندہ ہے۔ بنیادی تعلیم کو قدیم روش سے ہٹا کر جدید ٹیکنالوجی سے قریب کرنے کی ضرورت ہے۔انھوں

سید محمد اشرف

پروفیسر وسیم بریلوی

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

پروفیسر ایس کے سپوری

نے خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ اب ای بک E-Book اور دیگر ٹیکنالوجی کا سہارا لیا جارہا ہے۔ انھوں نے آن لائن آف لائن ڈکشنری، اردو ٹولس، اردو میڈیا، اردو فونٹس، اردو کی بورڈ اور کمپیوٹر ٹیکنالوجی پر مبنی روزگار سے جڑی مختلف اسکیموں اور کورسز کے لیے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کوششوں کو قابل ستائش بتایا۔ آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد فلمی صنعت میں اردو زبان کے وسیع تر استعمال پر گفتگو کرتے ہوئے شکیل حسن شمسی نے اردو کو فلمی صنعت کی بقا کے لیے ناگزیر قرار دیا۔ سیشن کے اختتام پر ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کونسل کی کوششوں کو سراہتے ہوئے 'عالمی قلم کار ایسوسی ایشن' کے قیام کی تجویز رکھی اور درخواست کی کہ اس نوعیت کے پروگرام چھوٹے شہروں میں بھی منعقد کیے جانے چاہئیں۔ ڈاکٹر ناشر نقوی نے پنجاب کے حوالے سے اردو میلے کے انعقاد کی تجویز رکھی اور یونیورسٹی آف پنجاب اور حکومت پنجاب کی جانب سے جملہ تعاون فراہم کرنے کی پیش کش کی۔ پروفیسر مظفر شہ میری نے درسی اور عام بول چال کی زبان میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی خاطر ورکشاپ یا کانفرنس کی ضرورت پر زور دیا۔ ڈاکٹر اطہر فاروقی نے صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے مختلف مقالات پر اظہارِ خیال کیا اور میڈیا اور فلم کے حوالے سے مختصراً گفتگو کی۔ مجلس صدارت کی دوسری رکن محترمہ کامنا پرشاد نے بے حد حسین الفاظ کا سہارا لیتے ہوئے کم وقت میں اپنی بات رکھی۔ معروف صحافی زاہد علی خان نے صدارتی خطبے میں قومی اردو کونسل کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اردو کونسل نے اس کانفرنس کا انعقاد کرکے اردو والوں کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ انھوں نے اپنے روزنامہ 'سیاست' کی ویب سائٹ کے حوالے سے یہ خوشگوار اطلاع بھی فراہم کی کہ دنیا کے ایک سو بیالیس 142 ممالک اور تین ہزار پانچ سو چوبیس 3524 شہروں میں اردو پڑھنے والے موجود ہیں اور انٹرنیٹ کے ذریعے ہر مہینے تقریباً پندرہ لاکھ لوگ روزنامہ 'سیاست' پڑھتے ہیں۔ کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی نے اپنے صدارتی خطاب میں مقالات کا مختصراً جائزہ لیا اور تجاویز وسفارشات پر بھی اظہارِ خیال کیا۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کے خوش آئند مستقبل کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہا کہ اردو نہ کبھی ختم ہوئی تھی اور نہ کبھی ختم ہوگی۔ انھوں نے ڈاکٹر خواجہ اکرام کی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ آج کونسل کا ڈائرکٹر ایک ایسا شخص ہے جو عہد حاضر کی تمام ضروریات سے ہم آہنگ ہے اور رات دن بغیر تھکے اور رکے اردو کی خدمت میں لگا رہتا ہے۔

دوسرے سیشن کی مجلس صدارت میں پروفیسر عتیق اللہ، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر اسلم آزاد، پروفیسر وسیم بریلوی اور عابدہ انعام دار شامل تھیں۔ تاجکستان سے تشریف لائیں مالاخوا زیب النسا نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو زبان نے ہندوستان اور تاجکستان کے درمیان ایک تہذیبی و ثقافتی رابطہ قائم کیا ہے۔ تہران یونیورسٹی کی استاد ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی نے غالب اور نظیر کی شاعری میں انسان دوستی کے عناصر کی نشان دہی کی جب کہ پاکستان سے آئے پروفیسر جمیل اصغر نے اقبال بحیثیت انسان دوست شاعر کے موضوع پر مقالہ پیش کیا۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے اردو افسانے میں انسان دوستی کے عناصر پر اپنی گراں قدر رائے سے سامعین کو فیض یاب کیا۔ اعظم کیمپس پونے کی نائب صدر محترمہ عابدہ انعام دار نے صدارتی کلمات میں ہندوستان کے آئین میں تعلیم اور تعلیمی اداروں کے قیام سے متعلق دفعات کی جانکاری دی اور کہا کہ ہمیں ان کا سہارا لیتے ہوئے اپنے حقوق کے لیے آواز بلند کرنے اور اردو کی بنیادی تعلیم کی سمت میں پیش رفت کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے حکومت کی جانب سے چلائی جارہی اسکیموں اور پروگراموں کی جانکاری دی اور یہ مشورہ بھی دیا کہ کونسل ان اسکیموں کے نفاذ میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔ پروفیسر اسلم آزاد نے بہار میں اردو کی صورت حال پر روشنی ڈالی۔ جب کہ پروفیسر عتیق اللہ نے اردو قواعد اور زبان سے متعلق بڑی عالمانہ گفتگو کی۔

'سفارشات اور تجاویز' پر مبنی اختتامی اجلاس میں عطاء الحق قاسمی نے امریکی اور یوروپی ممالک کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اور پاکستان کو بھی اسی طرح مل جل کر اتحاد و اتفاق سے رہنا چاہیے بلکہ ان دونوں ممالک کے درمیان ویزے کی شرائط میں نرمی دینے کی ضرورت ہے۔ سید محمد اشرف نے اپنے اختتامی کلمات میں اردو کی ترقی سے متعلق بہت اہم نکات پر روشنی ڈالی۔ انھوں نے اس تین روزہ بین الاقوامی کانفرنس کی جملہ کارگزاریوں کا اجمالی خاکہ پیش کیا اور کانفرنس کو نہایت کامیاب بتایا۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے اردو، عربی اور فارسی کی تعلیم و تدریس اور ترویج و ترقی سے متعلق اردو والوں کی طرف سے حکومت ہند کے لیے تجاویز کی ایک لمبی فہرست پیش کی جس پر مزید غور و خوض کے بعد مرکزی حکومت کے روبرو پیش کرنے پر اظہارِ اتفاق کیا گیا۔

■

Abdul Hai

سامعین کا منظر

سامعین کا منظر

دائیں سے وبھوتی نرائن رائے، وسیم بریلوی، علی اشرف فاطمی، اعجاز علی ارشد اور خواجہ محمد اکرام الدین

سید محمد اشرف

کلیدی خطبہ — بین الاقوامی اُردو کانفرنس

4 ستمبر 2013

معاملاتِ اُردو

کسی بھی زبان سے متعلق اگر عالمی پیمانے پر کانفرنس کا انعقاد ہو رہا ہو خصوصاً اردو کا جس کے چاہنے والے دنیا کے گوشے گوشے سے آج حضرتِ دہلی میں آن جمع ہوئے ہیں تو پورے ماحول میں مسرت، سرشاری اور شادمانی کا ہونا بالکل فطری بات ہے۔ میں بھی اس شادمانی اور سرشاری میں خود کو شریک پاکر بہت مسرور ہوں اور قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کے اربابِ حل وعقد کے تئیں سراپا سپاس ہوں کہ کلیدی خطاب کے لیے مجھے ہدایت دی گئی۔

معزز خواتین وحضرات! قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان کی کارکردگی کے تئیں میں چند اعترافات کرنے پر مجبور ہوں:

1. NCPUL فی الوقت دنیا کا سب سے بڑا اُردو کا اشاعتی ادارہ ہے۔
2. NCPUL نے اُردو کو آج کی جدید کمپیوٹر ٹکنالوجی سے بخوبی وابستہ کردیا ہے اور دھیرے دھیرے اس منزل کی طرف رواں دواں ہے جہاں کمپیوٹر اور موبائل پر انگریزی کی طرح اُردو میں کوئی بھی کام کیا جاسکے گا۔
3. NCPUL کو ووکیشنل کورسز کی بزبانِ اُردو توسیع کا مینڈیٹ مل چکا ہے اور اس لیے اس میں ضروری اقدامات کیے جاچکے ہیں۔
4. کیلی گرافی اور اس سے متعلق دیگر نفاستوں کی روایت کو محفوظ کرنے کا کام بھی NCPUL شروع کرچکی ہے، وہ بھی اس طرح کہ اس سے روزگار کے مواقع بھی حاصل ہوں۔
5. عام طور پر کتاب کا شوقین کتب فروشوں کے پاس جاتا ہے لیکن NCPUL نے یہ وضع اختیار کی ہے کہ کتابیں لے کر خود اصحابِ ذوق اور خریداروں کے پاس جاتی ہے۔ صرف دہلی میں نہیں بلکہ ہندوستان کے دور دراز گوشوں میں بھی—

یہ تمام کام اور اُردو کے فروغ کے ایسے بہت سے کام ممکن نہیں ہوتے اگر وزیر کابینہ برائے فروغ انسانی وسائل عزت مآب ڈاکٹر ایم ایم پلّم راجو کی محبت اور رغبت اُردو اور NCPUL کو حاصل نہ ہوتی اور اگر وزیر مملکت محترم جتن پرساد کی مستقل نگرانی، توجہ اور ترغیب نہ میسر ہوتی۔

پروفیسر وسیم بریلوی اُردو دنیا کے معروف ترین شاعر ہیں لیکن NCPUL کی سربراہی اور اس کے کاموں میں ان کی گہری دلچسپی نے خدا جانے ان کے کتنے مشاعروں کا خون کیا ہوگا۔ وہ اُردو کے فروغ کے زمینی مسائل سے کماحقہٗ واقف ہیں۔ غالباً خوبصورت شعر کہنے سے زبان میں بھی ایسی مؤنی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ بہت جلد غیروں کو اپنا لیتے ہیں اور اپنا کر اپنا ہم زبان بنا لیتے ہیں۔ ان کے لیے NCPUL کے کاموں کو جس شخص نے پانی بنا دیا ہے اور جس کی دیانت، شرافت، لیاقت او رمحنت کی قسمیں کھائی جاسکتی ہیں وہ ہیں NCPUL کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین جو ہمہ وقت NCPUL کے کاموں اور اردو کے فروغ میں تیزی لانے کے لیے مصروف رہتے ہیں۔ ان سب کے لیے دل سے دعا نکلتی ہے۔ اور جب تک یہ اُردو کے فروغ کے کاموں میں خلوص کے ساتھ مصروف رہیں گے ہم سب اُن کے لیے دعائیں کرتے رہیں گے۔

شعبۂ اعلیٰ تعلیم کے سکریٹری جوائنٹ سکریٹری اور عملے کے دیگر افراد بھی۔ NCPUL کے کاموں کو لال فیتہ شاہی کے پھندے میں نہیں پھنسنے دیتے۔

حضرات! مجالس میں پہلے فضائل بیان ہوتے ہیں۔ پھر مصائب کا ذکر آتا ہے۔ فضائل ہو چکے— اب مصائب سن لیجیے:

آج ہم اپنی پریشانی حالت اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں اب دیکھیے کیا کہتے ہیں

— اور اس سے بھی پہلے یہ کہنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اُردو کو لشکر کی زبان نہ سمجھا جائے۔ اس سے بہت خلط مبحث پیدا ہوتا ہے۔ چلتی ہوئی تلواریں، گرتی ہوئی لاشیں، تاراج ہوتی ہوئی عمارتیں، جلتی ہوئی فصلیں، بے آبرو ہوتی ہوئی عورتیں، غلام بنتے ہوئے مرد — بھلا اُردد کا ان باتوں سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟ یہ تو اُس تہذیب کی زبان ہے جس کے لیے میر انیس نے کہا تھا:

خیالِ خاطر احباب چاہیے ہر دم
انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

آج سے ڈھائی سو سال پہلے کا میر امّن شہادت دیتا ہے کہ یہ زبان کس طرح مقرر ہوئی۔

''جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تو چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی اس خاندانِ لاثانی کی سن کر حضور میں آکر جمع ہوئے لیکن ہر

عطاء الحق قاسمی، لاہور

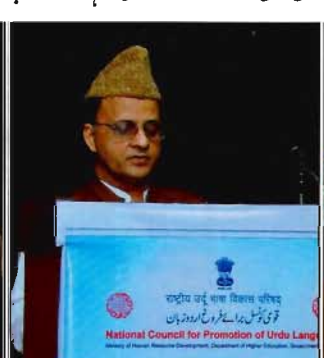

ڈاکٹر ظفر محمود

مولانا خوشتر نورانی

سابق وزیر مملکت علی اشرف فاطمی

ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی۔ اکھٹے ہونے سے آپس میں لین دین، سودا سلف، سوال جواب کرتے اور ایک زبان اُردو کی مقرر ہوئی.... جب حضرت شاہجہاں صاحب قراں نے قلعہ مبارک اور جامع مسجد اور شہر پناہ تعمیر کرایا اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا تو یہ شاہجہاں آباد کے نام سے مشہور ہوا... پھر اس کے بازار کو اُردوئے معلّٰی کا خطاب دیا۔''

ملاحظہ فرمائیے کہ میر امن شہر کے بازار کو اُردوئے معلّٰی کہہ رہے ہیں۔ شہر پناہ کے باہر بسے ہوئے لشکری کیمپوں کو اُردوئے معلّٰی نہیں کہا جارہا ہے اور یہی بازار تھا جس کی ایک راہ دربارِ شہنشاہ تک جاتی تھی اور دوسری راہ صوفی کی خانقاہ تک— اردو زبان شاہی دربار، خانقاہ اور بازار میں بولی جانے والی زبان تھی۔ نواحِ دہلی اور دہلی میں پیدا ہونے اور پلنے بڑھنے والی زبانِ اُردو ان ہی تین اداروں کی مرہونِ منّت تھی۔ ہندو اور مسلمان سب کو ان تینوں اداروں میں یکساں رسائی حاصل تھی۔

آج کی تاریخ میں اُردو کا مسئلہ بے حد پیچیدہ ہے۔ میرے ذہن میں جس طرح اس کی پیچیدگی کی وجہیں صاف ہیں اسی طرح اس کے روشن مستقبل کا لائحہ عمل بھی واضح ہے۔ غالبًا کہنے کی ضرورت نہیں کہ اردو کا روشن مستقبل ان تسامحات کے تدارک میں مضمر ہے جو خود اُردو والوں سے سرزد ہوئے— اپنا احتساب اکثر بگڑے کام بنا دیتا ہے۔ دوسروں کو الزام دیتے رہنا کسی مسئلے کا حل نہیں۔ اُردو کے پیچیدہ مسئلے کو سمجھنے کے لئے ایک تمثیل شاید کارگر ہو۔ اس طرح ممکن ہوگا کہ ہم اُردو کے پیچیدہ معاملے اور اُردو کے مختلف مظاہر کو بہتر طور پر سمجھ سکیں اور صحیح پس منظر اور تناسب میں دیکھ سکیں۔

اُردو ایک چھتنار، مضبوط تنے والے درخت کی طرح ہے جس میں پھل اور پھول بھی ہیں اور پتّے بھی۔ اس کی جڑ بھی ہے لیکن جڑ نگاہوں سے پوشیدہ رہتی ہے۔ اس درخت کی جڑ تعلیم و تدریس ہے— اس کا مضبوط تنا اُردو تہذیب ہے جسے ہم گنگا جمنی تہذیب کہتے ہیں۔ اس کے خوش رنگ پھول اور پتّے دراصل ادب اور دیگر فنونِ لطیفہ ہیں۔ اس کا پھل اُردو سے وابستہ روزگار کے وسائل ہیں۔ اس کی کھاد خود اُردو والوں کی اُردو سے محبت اور اُردو کی ترقی و ترویج کی کوشش ہے۔ جڑوں کو دیا جانے پانی حکومت کی اُردو سے رغبت اور سرپرستی ہے— اس درخت کے پھل، پھول اور پتّے تبھی بہار دیں گے اور اس کا تنا تبھی استادہ رہ سکے گا جب اس کی جڑ میں مناسب مقدار میں کھاد اور پانی مستقل لگتا رہے۔ ادب اور فنونِ لطیفہ — یہ غزل کی شامیں، یہ مشاعروں کی راتیں، یہ داستان سرائیاں، یہ نقد و نظر کے بازار— اور گنگا جمنی تہذیب تبھی تک موجود ہے جب تک اُردو کی تعلیم و تدریس میں اُردو والے اور حکومت کھاد او رپانی لگاتے رہیں۔ مضبوط سلطنتیں، بڑی تہذیبیں اور زندہ زبانیں آناً فاناً ختم نہیں ہوتیں، مغلیہ سلطنت کو عروج پانے میں ڈیڑھ سو سال لگے اور مکمل زوال میں بھی ڈیڑھ سو برس کا وقت لگا— اردو پر نظر ڈالئے تو بڑا دل خوش کن منظر نظر آتا ہے۔ مشاعروں کے جلسے، کہانیوں کی شامیں، غزلوں کی راتیں، سیمینار، سمپوزیم، فلموں اور سیریلوں اور فلمی گانوں میں اس کے الفاظ اور محاورے کا استعمال اور جانے کیا کیا— پھول، پتّے اپنی اپنی بہار دے رہے ہیں اور پھل بھی نظر آرہے ہیں۔ لیکن جڑوں کی طرف دیکھیے تو سوکھ کر تارِ عنکبوت بن گئی ہیں۔ ساری طاقت، تہذیب و ثقافت کے تنے میں جمع شدہ غذا اور نمی کو چوس کر حاصل کی جارہی ہے۔ مگر تابکے۔ یہ چراغِ سحری کی وہ بھڑک ہے جس کے بعد چراغ خاموش ہونے والا ہوتا ہے— مایوسی کفر ہے اس لیے عرض کرتا ہوں کہ یہ مناسب ترین موقع ہے کہ جڑوں کی طرف نگاہ کی جائے۔ اُردو کی صحیح اور وافر تعلیم و تدریس پر مکمل خلوص، منصوبہ بندی، مفید مطلب اور بامعنی انداز سے توجہ دے کر جڑوں کو مضبوط کیا جائے۔

ماضی کے تسامحات:

اُردو کی موجودہ صورتحال کے لیے خصوصاً دو محرک ذمہ دار ہیں۔ اوّل تقسیم ہند سے پیدا شدہ صورتِ حال میں ریاست کا رویہ اور دوم ریاست کے اُس رویے اور پاکستان کے قیام کے سبب اردو کے مسلمانوں کی زبان بن جانے پر خود مسلمانوں کا منفعل رویہ۔ یہ دہرانے کی قطعاً ضرورت نہیں ہے کہ اُردو صرف مسلمانوں کی زبان کبھی نہیں تھی اور اُردو میں غیر مسلم خصوصاً ہندو اہل قلم کی کہکشاں اردو زبان و ادب کی تاریخ کا زرّیں باب ہے۔ میں غیر مسلم اُردو ادیبوں، شاعروں کی طویل فہرست نہیں گنواؤں گا بس یہ سمجھ لیجیے کہ بقول حالی:

چپے چپے میں ہیں یہ گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز

اُردو کا ماضی یہ ہے کہ فرقہ پرست مسلم قوتوں نے اس کے اسلامی تشخص پر ضرورت سے زیادہ اصرار کر کے اسے قیامِ پاکستان کی تحریک میں مرکزی حیثیت دے دی۔ اتنا ہی نہیں ان ہی قوتوں نے قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ہی مشرقی پاکستان پر جبراً اُردو تھوپ دی جہاں اکثریت بنگلہ زبان بولنے والے مسلمانوں کی تھی۔ بنگلہ دیش کا حوالہ میں نے اس لیے دیا کہ اُردو کو مسلمانوں کی زبان کہنا نہ صرف اُردو اور مسلمان دونوں کے ساتھ زیادتی ہے بلکہ یہ خود اُن مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں جن کی زبان اُردو سے مختلف ہے۔ بھلا بنگلہ دیش کا دیہی مسلمان کیا جانے کہ اُردو کیسے لکھی اور پڑھی جاتی ہے۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ جب فرقہ پرست مسلم سیاست نے اُردو کا استحصال کیا تو وہ صورتحال ہندو فرقہ پرست سیاست کے لیے وردان بن گئی۔ تقسیم ہندوستان کے بعد نہرو جیسے قدآور لیڈروں کے لیے صوبائی سطح پر اسکولی نظام سے اُردو کا اخراج روکنا ممکن نہیں ہو سکا۔ دراصل اسکول کے نظام سے اُردو کا اخراج ہی اُردو کے زوال کا اصل سبب بن گیا۔ جب تک اسکول کے نظام میں اُردو کا احیا نہیں ہوتا، قومی زندگی میں اُردو کا احیا ممکن

وبھوتی نرائن رائے

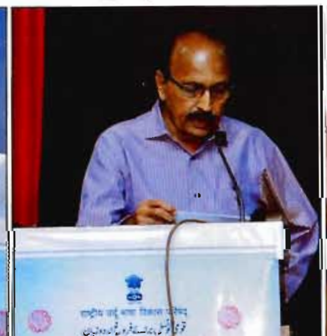
نسیم عارفی

ڈاکٹر تحسین فراقی، لاہور

ڈاکٹر لدمیلا واسیلیوا، ماسکو

ہی نہیں ہے۔ ہندوستان کے منظرنامے پر جتنی زبانیں زندگی کی زبانیں ہیں اور جو کبھی اپنے زوال کا شکوہ نہیں کرتیں وہ سب اپنے اپنے علاقوں کے تعلیمی نظام کا لازمی جز ہیں۔ صوبوں کی تقسیم نے اردو کے سر پر ظالم آسمان تو قائم رکھا، نیچے زمین کوئی نہیں چھوڑی۔ انگریزی کی تمام تر سیاسی مخالفت کے باوجود اس کے سر پر بادشاہت کے تاج کا اہم ترین سبب انگریزی میڈیم اسکولوں کا طاقت ور نیٹ ورک ہے۔ زبانوں کی ہمہ جہت ترقی کا یہ مسلمہ اُصول ہے کہ اسکول کے نظام میں کسی بھی زبان کی ترقی معاشرے میں ہر سطح پر اُس زبان کے فروغ میں ریڑھ کی ہڈی کا کام کرتی ہے۔ میرا ذہن اس امر میں بالکل صاف ہے کہ جب تک ہندوستان کے اسکولی نظام میں نہ صرف ذریعہ تعلیم بلکہ اُردو مادری زبان والے بچوں کو پہلی زبان کے طور پر اُردو پڑھنے کا موقع نہیں ملے گا اُردو کا کھویا ہوا مقام تو چھوڑیے وہ ہندوستان کی ایک علاقائی زبان کے شانہ بہ شانہ بھی کھڑی نہیں ہو سکے گی۔

یہاں اس بات کا اعتراف لازمی ہے کہ ہمارا دستورِ ہند کسی بھی لحاظ سے اُردو زبان کی ترقی کے راستے میں روڑا نہیں بنتا بلکہ واضح آرٹیکل موجود ہیں جو بتاتے ہیں: آرٹیکل 29A : ''ہندوستان یا کسی بھی حصے میں رہنے والے باشندوں کو اپنی زبان، رسم خط اور تہذیب کے تحفظ کا حق ہوگا۔'' لیکن جب نفاذ کا وقت آتا ہے تو تشریحات وتعبیرات وتفسیرات میں اُردو کی ترقی وترویج کا معاملہ قانونی موشگافیوں میں کچل دیا جاتا ہے۔

اسی لیے سہ لسانی فارمولہ اردو تعلیم و تدریس کے لیے کبھی اکسیر نہیں بن سکا۔

اُردو کے سرکاری زبان بننے کا معاملہ ہم چار صوبوں میں دیکھ چکے ہیں۔ اس سے ہرگز کوئی خاطر خواہ فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ جن مخصوص معاملات کے لیے اُردو کو دوسری سرکاری زبان بنایا گیا بعد میں علم ہوا کہ اُن معاملات میں درخواست تک اُردو میں موصول نہیں ہو رہی ہیں۔ درخواست اُردو میں موصول نہ ہونا اُردو کی تعلیم و تدریس کے ناکافی ہونے کا نتیجہ ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، عباسی برادران اور حیات اللہ انصاری نے کیسی کیسی کوششیں کیں۔ ذاکر صاحب نے 22 لاکھ سے زیادہ دستخط اُردو کی حمایت میں جمع کر کے حکومت کو پیش کیے۔ آج تک علم نہیں ہو سکا کہ کاغذات کا وہ قیمتی انبار کہاں ہے اور اس پر حسب خواہش فیصلہ نہ ہونے کا سبب کیا تھا۔

گوپال داس کمیٹی رپورٹ کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اِندر کمار گجرال کمیٹی کا کتنا شہرہ تھا، پھر اس پر سردار جعفری کی جائزہ کمیٹی نے کام کیا۔ اس سے بھی کوئی موثر حل نہیں نکلا۔ سچر کمیٹی فائنل رپورٹ پیش کر چکی ہے۔ رنگ ناتھ مشرا کمیٹی کی رپورٹ بھی آ چکی ہے لیکن وہ سب نہیں ہو سکا جس کی امیدیں کی جا رہی تھیں۔ یوں بھی حکومتوں کے لیے زبان کے حوالے سے ان کی سفارشات کا نفاذ جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

اُردو اور مدارسِ اسلامیہ

اُردو کی ترقی کے لیے اسکولی نظام میں اردو کی شمولیت کا کوئی ذکر بہت کم ہوتا ہے۔ کہہ دیا جاتا ہے کہ دینی مدارس اُرود کا تحفظ کر رہے ہیں۔ مجھ جیسے خانقاہی سے زیادہ مدارس کا احترام اور کون کرے گا۔ اور کون جانے گا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ دینی مدارس کے جو مقاصد ہیں وہ جائز بھی ہیں اور آئین ہند کے مطابق بھی۔ لیکن یہ بات وثوق سے کہہ رہا ہوں کہ ہندوستان کے کسی مدرسے میں اُردو کی ترقی کا لائحہ عمل ایجنڈے میں شامل نہیں ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ چند مدارس کے علاوہ تمام مدارس ایسے ہیں جن کے گوداموں میں اگلے ہفتے کا راشن بھی نہیں ہوتا۔ بچے پوس کی راتوں میں چٹائیاں لپیٹ لپیٹ کر سوتے ہیں۔ پھر یہ اعداد بھی دیکھیے کہ اُردو سے دلچسپی رکھنے والی آبادی کے کل 53 فیصد بچے تعلیم گاہوں میں جاتے ہیں اور اُن 53 فیصد کے 4 فیصد مدارس کا منہ دیکھتے ہیں۔ مدرسہ بورڈوں کی تنخواہوں سے چلنے والے مدارس بہت کم ہیں، ان کے علاوہ چھوٹے بڑے جو مدارس ہیں اُن میں استاد کی تنخواہ 4500 سے لے کر 7500 تک ہوتی ہے۔ قابل تدریس طلباء میں صرف سوا دو فیصد مسکین بچے، اساتذہ کی قلیل تنخواہیں، وسائل کی شدید کمی والے مدارس کیا اُردو کی ترقی وترویج کا بھاری بوجھ اُٹھا سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں! حکومت ہو یا عوام ان کو مدارس سے اُردو کی ترقی وترویج کوئی بے جا اُمید نہیں رکھنا چاہیے۔ مدارس کو اُن کے سرپرستوں کے ذمہ رہنے دیجیے، ان کے اپنے لائحہ عمل کے ساتھ۔ ایک ذرا نازک بات بھی اس ضمن میں عرض کرنا ضروری ہے کہ مدارس میں جس اُردو کا استعمال ہوتا ہے وہ مذہبی اُردو ہوتی ہے۔ عربی و فارسی کی اصطلاحات اور عربی مخارج سے گراں بار۔ اس اُردو کو ذریعہ تعلیم بنانا دراصل مدارس کی مجبوری ہے۔ اب عربی و فارسی زبان میں تعلیم دینے والے اساتذہ نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہیں۔

اُردو اکادمیاں اور اُردو کا فروغ

اردو کی ترقی کے سیاق وسباق میں ایک اور غلط بحث اردو اکادمیوں کے تعلق سے ہے۔ تقسیم ملک کے بعد جب پنڈت نہرو بے بس ہو گئے تو انہوں نے اردو ثقافت کی مدبرانہ حکمت عملی تیار کی۔ نہرو جی نے اپنی حکمت عملی کے ذریعے اُردو ثقافت کے فروغ کی ہر ممکن کوشش کی جسے ان کی سیاسی وارث مسز اِندرا گاندھی نے اُردو اکیڈمیوں کی شکل میں Institutionalized کیا۔ دہلی میں نہرو جی کی موجودگی نے دلی کے تعلیمی نظام میں اُردو کی موجودگی کو برقرار رکھا۔ آج بھی ہمیں دہلی میں اُردو میڈیم اسکول نظر آتے ہیں اور ایسے اسکولوں کی بھی کمی نہیں جہاں اُردو کو ایک اختیاری زبان کے طور پر پڑھایا جاتا ہے۔ اُردو اکیڈمیوں کا دائرہ کار اُردو ادب اور ثقافتی سرگرمیوں تک محدود ہے۔ مگر اردو والے ان سے یہی توقع کرتے ہیں کہ وہ اردو تعلیم کے فروغ میں بھی معاون ہوں۔ یہ توقعات اس لیے بڑھ گئی ہیں کہ کسی وقت بغیر سوچے سمجھے دہلی حکومت نے اردو اساتذہ کی تقرری کی

پروفیسر عبدالحق

غلام نبی خیال

مشرف عالم ذوقی

مولانا ولی رحمانی

ذمہ داری دہلی اردو اکیڈمی کو دے دی۔ جبکہ دیگر اردومیڈیم اسکول یا اُردو کو اختیاری زبان کے طور پر پڑھانے والے اسکول Directorate of Education کے سپرد ہیں جو بالکل صحیح ہے۔اس ابہام میں دہلی اکادمی کے تقرر کیے ہوئے اساتذہ پھنس کے رہ گئے ہیں اور آج تک اپنے اصلی گریڈ کو ترس رہے ہیں۔ ہندوستان بھر میں پھیلی اُردو اکادمیاں ادب اور ثقافت کے کاموں کو ٹھیک سے سرانجام دے لیں تو سمجھیں کہ گنگا نہالی۔ ورنہ یہ ہوگا کہ کوا چلا ہنس کی چال، اپنی چال بھی بھولا۔

میڈیا اور اُردو

اردو کی ترقی و ترویج کے سیاق و سباق میں سہل پسندانہ تجزیے کا نیا ہدف عوامی ذرائع ابلاغ ہیں۔ خصوصاً الیکٹرانک میڈیا اور فلمیں— دلچسپ بات تو یہ ہے کہ ایک طرف تو بجا طور پر اُردو والے اُردو رسم الخط کو اردو زبان کا لازمی جز مانتے ہیں، دوسری طرف ان ذرائع ابلاغ سے اُردو کی ترقی کو جوڑتے ہیں جن کا یا تو رسم الخط سے کوئی تعلق نہیں ہے یا پھر وہ دیوناگری یا رومن رسم الخط کو استعمال کرتے ہیں۔ پارلیمنٹ میں، محفلوں میں اکثر غیر اردوداں طبقے کے منھ سے اُردو اشعار کا برمحل استعمال کسے نہیں اچھا لگتا۔ لیکن یہ سب کچھ ماحول کو تو نرم اور خوشگوار کردیتا ہے لیکن کیا یہ اُردو کی ترقی کے کسی سنجیدہ لائحۂ عمل کا حصہ ہوسکتا ہے؟ نہیں۔ حکومت کی پالیسی پلاننگ میں ایسی کسی خوش قدمی کی کوئی جگہ نہیں ہوا کرتی؟

دو فوری اقدامات:

اردو سے متعلق دو اُمور فوری توجہ کے متقاضی ہیں:

1. مقابلے کے سب سے بڑے UPSC کے امتحانات سے عربی اور فارسی کو بحیثیت اختیاری مضمون کے نکال دینا بالکل دانشمندانہ فیصلہ نہیں ہے۔ جرمن، فرانسیسی او رپالی کے بارے میں کچھ نہیں عرض کرنا لیکن عربی اور فارسی تو ہندوستان کی زندہ زبانیں ہیں۔ چار یونیورسٹیاں ان ہی زبانوں کی تعلیم کے لیے کام کررہی ہیں۔ 25 کے قریب شعبے ان زبانوں کی اعلیٰ درجے کی تدریس میں مصروف ہیں۔ صدر جمہوریہ ہر سال عربی و فارسی اساتذہ کو انعامات عطا کرتے ہیں۔ لاکھوں طالب علم ان زبانوں کو سیکھ رہے ہیں، یہ زبانیں ہمیں عرب ممالک اور مشرقِ وسطیٰ سے وابستہ رکھتی ہیں۔ اس ملک کے بیس کروڑ سے زائد افراد کا مذہبی سرمایہ ان زبانوں میں محفوظ ہے۔ ان زبانوں کے چاہنے والے ڈرتے ہیں کہ آج اِنہیں UPSC سے نکالا جارہا ہے، کل شاید درسگاہوں سے نکال دیا جائے گا۔ بتدریج من مانی کرنے کی عالمی اور قومی بہت سی مثالوں سے ہم آشنا ہیں۔ اردو کا امتیاز اس کی شیرینی، نفاست، خطابت اور پیچیدہ مطالب کو بیان کرنے میں مضمر ہے۔ وہ بہت کچھ ان دو زبانوں کے طفیل ہے۔ اس سے پیشتر کہ اس فیصلے کا پیدا کردہ رنج دانشوروں سے نیچے چھَن کر عوام تک پہنچے، اس کا فوری تدارک کرنا لازمی ہے۔

2. سرکاری ویب سائٹ India Development Gatway سے اُردو کو دور کردیا ہے جبکہ رائے شماری کے اعتبار سے اردو بولنے والی آبادی ہندوستان میں چھٹے نمبر پر فائز ہے۔ اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سے کہیں کم بولی جانے والی زبانوں میں انڈیا ڈیولپمنٹ گیٹ وے موجود ہے۔ اس غلطی کا ازالہ بھی فوری طور پر ضروری ہے۔

اختتامی کلمات کے طور پر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اُردو کی بقا اور ترقی کے لائحۂ عمل کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اُردو والے صحیح خطوط پر اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کام کریں۔ اُردو سے وابستہ سرکاری ادارے وہ کام کریں جو اُن کے صحیح دائرۂ عمل میں آتا ہے تو اُن کے پاس وسائل بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ اُردو کے احیا و بقا اور ترقی کا اسم اعظم صرف اور صرف اسکول کے نظام میں اس کی بامعنی شمولیت ہے۔ یہ سب کہتے وقت میں اُردو مخالف قوتوں کی سازشوں کو نظرانداز نہیں کررہا ہوں جن کا سلسلہ ایک صدی سے زیادہ پر محیط ہے۔ اُن قوتوں کا مقابلہ کرنے کے لیے جمہوری طرز پر شدید جدوجہد کی ضرورت ہے اور اس طرح کی شدید جدوجہد کو ہندوستان کی سول سوسائٹی ایک نہایت مؤثر آلے کے طور پر قبول کر چکی ہے۔ افسوس کہ اُردو کے سیاق وسباق میں ایسی کسی جدوجہد کی آہٹ ہمیں دور دور تک نہیں سنائی دیتی۔ جارحانہ یا شدید جدوجہد تو ایک طرف کسی بھی جدوجہد سے بے نیاز اُردو والے اب صرف اس خیال کے ہیں کہ بس اب حکومت سے چلنے والے ادارے اُردو کی تعلیم و تدریس، ثقافت وتہذیب— ہر چیز کا تحفظ کریں گے۔ میں اُردو عوام، قائدین اور دانشوروں کے اس رویے پر کوئی تبصرہ نہیں کروں گا— بس دست بستہ میر کا ایک شعر پڑھ کر اپنی راہ لوں گا:

افسردگیِ سوختہ جاناں ہے قہر میر
دامن کو ٹک ہلا کہ دلوں کی بجھی ہے آگ

(یہ تحریر NCPUL کی عالمی اُردو کانفرنس منعقدہ 4 ستمبر کے افتتاحی اجلاس میں بطور کلیدی خطبے کی پڑھی گئی۔ اس کے مندرجات لکھنے میں راقم کو جناب شمس الرحمٰن فاروقی، محترم شاہد مہدی ڈاکٹر اطہر فاروقی، اور ڈاکٹر سید ظفر محمود سے جو مدد ملی اس کے لیے وہ سراپا سپاس ہے۔)

■

Syed Mohd Ashraf
D-II/59, Qidwai Nagar (W), New Delhi-23

ڈاکٹر تقی عابدی، ٹورنٹو

پروفیسر ابن کنول

ڈاکٹر احمد رحمت علی، ماریشس

شکیل حسن شمسی

قرارداد بین الاقوامی اردو کانفرنس

منعقدہ 4 تا 6 ستمبر 2013

زیرِاہتمام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومتِ ہند

(بین الاقوامی اردو کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں مورخہ 6 ستمبر 2013 کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ایکزیکیٹیو بورڈ کے رکن اور دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اخترالواسع نے کانفرنس کے مندوبین کی طرف سے قرار داد پیش کی جس میں شامل تجاویز کو اتفاق رائے سے منظور کیا گیا۔ پروفیسر اخترالواسع کی پیش کردہ تجاویز درج ذیل ہیں (ادارہ)

یہ زمانہ ٹیکنالوجی اور اطلاعاتی نشریات کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پوری دنیا انگلیوں میں سمٹ گئی ہے۔ آسانی اور آسائش اس عہد کی خاص پہچان کہی جاسکتی ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہیں جو اطلاعاتی ٹیکنالوجی سے اپنی زبان اور ادب کو ہم آہنگ کررہے ہیں۔ اردو کا منظرنامہ اس تناظر میں مایوس کن نہیں بلکہ حوصلہ افزا ہے۔ اگر ہم اس پورے منظرنامے پر نظر ڈالیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کچھ چھوٹے موٹے اور بعض اہم مسائل کے ساتھ ساتھ اردو زبان سے وابستہ افراد و شخصیات نے اجتماعی اور انفرادی سطح پر جو کوششیں کی ہیں وہ قابلِ قدر بھی ہیں اور لائق تحسین بھی، لیکن اس کے باوجود آگے بڑھنے اور نئی دنیا سے ہم آہنگ کرنے کے لیے مزید محنت اور کوشش ضروری ہے۔ آرزوؤں کی دنیا کبھی ختم نہیں ہوتی اور زبانیں تو آرزوؤں کو ہی جنم دیتی ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کی یہ عالمی کانفرنس حکومتِ ہند، وزارتِ فروغِ انسانی وسائل، بالخصوص اس کے سربراہ مرکزی وزیر ڈاکٹر ایم پلم راجو، وزیرِمملکت جناب جتن پرشاد اور وزارت کے دیگر ذمے داروں کی شکرگزار ہے جنھوں نے اس کانفرنس کے انعقاد کا نہ صرف منصوبہ بنایا بلکہ اس کے لیے عملی راہیں بھی ہموار کیں۔ یہ عالمی کانفرنس دراصل خوداحتسابی اور مستقبل کے لائحہ عمل سے عبارت ہے۔ خود احتسابی ہی کے نتیجے میں کانفرنس میں شریک مندوبین اور دیگر شرکا کے جذبات و احساسات کو سامنے رکھتے ہوئے یہ چند سفارشات قرار داد کی شکل میں پیش کی جارہی ہیں۔ ہماری کوشش ہمیشہ یہی رہی ہے کہ قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے بینر سے اردو کے حقیقی مسائل اربابِ اقتدار تک پہنچیں۔ ہم نے حکومتوں کے سامنے کبھی بھی ان مسائل کو پیش کرنے میں کسی رعایت اور جانب داری سے کام نہیں لیا ہے اور اب اس عالمی کانفرنس کے اختتامی مرحلے پر ہم واضح کرنا چاہتے ہیں کہ:

- بلاشبہ اکیسویں صدی کا آغاز اردو کے لیے ترقی و توسیع کی نوید لایا ہے۔ اردو کے سلسلے میں بعض تاریخی عوامل کی وجہ سے بظاہر جو امکانات معدوم اور راہیں مسدود ہوتی محسوس ہورہی تھیں اب مایوسی کے بادل چھٹتے نظر آرہے ہیں، لیکن اردو کے فروغ اور مزید بہتر امکانات کو یقینی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام لوگ جو اردو سے لسانی وابستگی رکھتے ہیں وہ خود بھی اس سلسلے میں کارگر عملی اقدامات کے ذریعے اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے تمام ممکنہ کوششوں میں سرگرمِ عمل ہوں۔ ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر کارِ خیر اپنے گھر سے ہی شروع ہوتا ہے اس لیے ہم اپنے بچوں کو ہر قیمت پر اردو پڑھائیں اور ایک لسانی اقلیت کے طور پر اپنے بچوں کے تعلیمی اور تدریسی حق کے طور پر اردو کی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے دستوری اور جمہوری دائروں میں رہتے ہوئے جدوجہد کریں اور حکومت وقت کو مجبور کریں کہ وہ اردو کی تعلیم کو یقینی بنانے کے لیے ہر اسکول میں اساتذہ فراہم کریں۔ اب RTE ایکٹ کے تحت اپنی ذمے داری سے انکار نہیں کرسکتے۔ خود بھی اردو اخبارات، رسائل اور کتابیں پڑھنے اور اردو میں بچوں کی کتابیں خرید کر انھیں تحفتاً دینے کی عادت ڈالیں۔ مزید برآں صارفین کی حیثیت سے ہر طرح کی عام اور خاص مصنوعات بنانے والی کمپنیوں پر بھی عوامی دباؤ بنا کر انھیں اس کے لیے آمادہ کریں کہ وہ اپنے پروڈکٹس

ڈاکٹر احمد محمد احمد عبدالرحمٰن، قاہرہ

ڈاکٹر اطہر فاروقی

محترمہ کامنا پرشاد

زاہد علی خاں

پروفیسر جمیل اصغر، فیصل آباد

ڈاکٹر فرزانہ اعظم لطفی، تہران

مالا خواز یب النسا، تاجکستان

ڈاکٹر خلیل طوق آر، استنبول

کا اردو میں اشتہار ضرور دیں۔

● یہ بین الاقوامی کانفرنس یک آواز ہوکر حکومتِ ہند سے مطالبہ کرتی ہے کہ سہ لسانی فارمولے کے تحت اردو کو جہاں اردو والے مطالبہ کرتے ہوں، ہر قیمت پر شامل کیا جائے اور اردو والوں کی لسانی ترجیحات کو صحیح طور پر جاننے کے لیے ہر سطح پر اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ فارم پر ہی مادری زبان کو واضح طور پر لکھ دیا جائے اور تیسری زبان کی حیثیت سے ہی اس کی مطلوبہ زبان کے اندراج کا خانہ ضرور ہونا چاہیے تاکہ کسی قسم کے ابہام اور غلط روی سے بچا جاسکے۔

● یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اترپردیش اور کئی ریاستوں میں اردو میڈیم اسکول نہیں کھولے جاسکتے کیوں کہ وہاں کے اسکولی تعلیم کے قانون میں کچھ ایسی شق رکھی گئی ہے کہ امتحان اور تعلیم کا ذریعہ ریاست کی سرکاری زبان میں ہی ہوگا جو کہ نہ صرف سہ لسانی فارمولے کے خلاف ہے بلکہ دستورِ ہند کی دفعہ 350A جس کے تحت مادری زبان میں بنیادی تعلیم کا انتظام و اہتمام ریاستی حکومتوں اور لوکل باڈیز کی ذمے داری ہوگی کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔ اس لیے یہ کانفرنس حکومتِ وقت سے اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن سے اترپردیش اور دیگر ریاستوں میں اردو میڈیم کے تعلیمی ادارے قائم کرنے اور اردو میں امتحان دینے کی سہولت حاصل ہو۔ اگر ضرورت ہو تو دفعہ 350A کے تحت صدر جمہوریہ ہند کو تفویض اختیار کے تحت ریاستی حکومتوں کو ہدایات جاری کی جائیں۔

● یہ کانفرنس اس بات کا بھی مطالبہ کرتی ہے کہ سہ لسانی فارمولے کی عمل آوری میں شفافیت برتی جائے۔ واضح رہے کہ اس فارمولے کے تحت ہر ریاست پر یہ ذمے داری ڈالی گئی ہے کہ پہلی زبان کے طور پر ریاست کی سرکاری زبان پڑھائی جائے جب کہ دوسری زبان کے طور پر آئین کے شیڈول 8 میں درج کی گئی جدید ہندوستانی زبان اور تیسری زبان کے طور پر جدید یوروپین زبان پڑھائی جائے۔ ریاست کی پہلی سرکاری زبان کے علاوہ دوسری زبان کے طور پر اردو، پنجابی اور مراٹھی کی تعلیم دی جاسکتی ہے، مگر اس کے برعکس جدید ہندوستانی زبان کے زمرے سے عملی طور پر اردو کو بے دخل کردیا گیا ہے، جس سے اردو پڑھنے کے خواہاں طلبا کو اردو کے بجائے کسی دوسری زبان کو پڑھنے کے لیے مجبور کیا جاتا ہے۔ یہ پالیسی دستورِ ہند میں درج لسانی اقلیت کو دیے گئے بنیادی حقوق کی دفعہ 29 کی صریحاً خلاف ورزی ہے۔

● مرکزی حکومت کے تحت جو ادارے ہیں جیسے کیندریہ ودیالیہ سنگٹھن، نودیہ اسکولز، کستوربا گاندھی بالیکا ودیالیہ اور اس طرح کے تمام مرکزی حکومت کے تحت چلنے والے اسکولوں میں بحیثیت مضمون اردو پڑھانے کا انتظام کیا جائے۔

● حکومتِ ہند کی وزارت برائے فروغِ انسانی وسائل سے یہ کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ اردو اساتذہ کا ایک قومی رجسٹر تیار کیا جائے تاکہ اردو اساتذہ کی کم یابی یا عدم دستیابی کی صحیح صورتِ حال سامنے آسکے۔

● ریاستی حکومتوں کے تحت مستقبل کے اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے قائم شدہ اداروں میں 20 فیصد جگہیں اردو زبان کے لیے مخصوص ہونی چاہئیں۔

● سی بی ایس ای، این سی ای آر ٹی، این آئی او ایس، نیشنل بک ٹرسٹ اور سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز کے تمام مراکز میں اردو جاننے والے اسٹاف کی برائے نام موجودگی ایک سنگین مسئلہ بن چکی ہے، اس لیے ان تمام اداروں میں اردو کی نئی اسامیوں اور ان پر فوری تقرر کے لیے راہیں ہموار کی جائیں۔

● تمام ایسے ادارے جو اردو کی تعلیم، تدریس، فروغ اور اشاعت کے لیے قائم کیے گئے ہیں جیسے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان وغیرہ میں تمام افسران و کارکنان کے لیے اردو جاننا لازم ہونا چاہیے۔

● دوردرشن، آل انڈیا ریڈیو، پبلی کیشن ڈویژن، پی

ڈاکٹر جلال السعید مصطفی الحفناوی، قاہرہ

محترمہ عابدہ انعام دار

آصف اعظمی

شگفتہ یاسمین

پروفیسر عتیق اللہ

پروفیسر احمد سجاد

پروفیسر سید شاہد مہدی

آئی بی اور ڈی اے وی پی جیسے مرکزی اطلاعات و نشریات کے اداروں اور حکومتِ دہلی و دیگر ریاستوں کی سرپرستی میں چلنے والے ادارے جیسے ڈائرکٹریٹ آف انفارمیشن اینڈ پبلسٹی میں باضابطہ طور پر اردو لکھنے اور پڑھنے والوں کا ہی تقرر کیا جائے۔

- اردو اخبارات و رسائل کو علاقائی زبانوں کے زمرے سے نکال کر ہندی اور انگریزی کے بعد تیسری زبان کا درجہ دیتے ہوئے ڈی اے وی پی کے ذریعے مختص بجٹ کا کم از کم 20 فیصد حصہ انھیں دیا جائے۔
- کونسل میں ریسرچ اور ڈاکومینٹیشن 2 کا سیل
- اردو کی بستیوں میں قومی اردو کونسل برائے فروغ اردو زبان اشتراک اور رابطے کی صورت پیدا کرے تاکہ جہاں جہاں اردو ہے وہاں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا فروغ ممکن ہو سکے۔ اردو کی نئی بستیوں میں اردو کی ترویج و فروغ کی رنگارنگ کوششوں کو ہندوستانی پس منظر میں بھی کام میں لایا جا سکے۔
- عالمی سطح پر منعقد ہونے والے کانفرنس اور سیمیناروں میں ہندوستانی مندوبین کی شرکت کے لیے مالی امداد فراہم کرانے کی سمت میں کوشش کرے۔
- کونسل ہر سال عالمی سطح کا سیمینار منعقد کرائے تاکہ اردو کی بستیوں سے ربط اور اشتراک کو تقویت ملے۔

■

تجاویز

عربی و فارسی کو ہندوستان میں بہت اہمیت حاصل ہے، ان دونوں زبانوں نے ہندوستان کی ماضی میں جو خدمات انجام دی ہیں اور آج بھی دے رہی ہیں ان کو نظرانداز کرنا ناممکن ہے ان دونوں زبانوں نے ہندوستان اور ہندوستانی علوم کو تمام دنیا میں متعارف کرایا ہے۔ ہندوستان کی کوئی بھی ایسی زبان نہیں ہے جس پر ان دونوں زبانوں یا ان میں سے کسی ایک کا اثر نہ ہو۔ اسی اہمیت کے پیش نظر آزادی کے بعد معماران ہند نے عربی و فارسی کو پوری اہمیت دی اور شروع ہی میں عربی مجلّہ ثقافۃ الہند جاری کیا گیا اور ہندوستان کی زیادہ تر یونیورسٹیوں میں عربی و فارسی کے شعبے کھولے گئے۔

موجودہ وقت میں بائیس سے زیادہ یونیورسٹیوں میں عربی و فارسی کے شعبے دیگر ہندوستانی زبانوں کے ساتھ آرٹس فیکلٹی میں قائم ہیں، غیرملکی زبانوں کی حیثیت سے نہیں۔ ہندوستان میں عربی و فارسی میں ہندوستانیوں نے گراں مایہ ادب تخلیق کیا ہے اور اس کی باقاعدہ تاریخ لکھی گئی ہے جو مطبوعہ شکل میں دستیاب ہے۔ ہندوستانی علما نے عربی و فارسی ادب میں ایسے نمایاں کام بھی انجام دیے ہیں جن کو عرب و عجم ہی میں نہیں بلکہ پوری دنیا میں اہم ماخذ کی حیثیت حاصل ہے۔ اسی وجہ سے عربی و فارسی کو عملی اور سرکاری طور سے کلاسیکی زبانوں میں رکھا گیا ہے اور اسی حیثیت سے صدر جمہوریہ ہند سنسکرت کے ساتھ عربی و فارسی کے اساتذہ و علما کو بھی ہر سال توصیفی سند و انعام سے نوازتے ہیں لیکن حال ہی میں حکومت ہند نے ان دونوں زبانوں کو یو پی ایس سی سے نکال کر غیر دانشمندانہ قدم اٹھایا ہے جو قومی مفاد کے خلاف ہے۔

گلوبلائزیشن کے اس دور میں عربی و فارسی بولنے والے ممالک سے بھی ہمارا رشتہ مضبوط ہونا چاہیے اور اس کے لیے قابلِ قدر کوششیں بھی جاری ہیں۔ اس لیے یو پی ایس سی کے ذریعے عربی اور فارسی زبانوں کا کسی بھی صورت میں اور کسی بھی سطح پر نکالا جانا انتہائی نامناسب قدم ہے، کیوں کہ اس سے ایک بڑی آبادی کو ناانصافی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوگا اور ان کے درمیان غم و غصہ جنم لے گا۔

اس لیے حکومتِ ہند سے ہمارا مطالبہ ہے کہ متعلقہ وزارتوں اور یو پی ایس سی کو اس بات کا پابند بنائے کہ وہ ان زبانوں کو یو پی ایس سی کے مقابلہ جاتی امتحانات کی فہرست میں پہلے کی طرح شامل رکھیں۔

پروفیسر احمد علی فاطمی

پروفیسر مظفر شہ میری

پروفیسر اسلم آزاد

ڈاکٹر حسام الدین فاروقی

بین الاقوامی مشاعرہ

5 ستمبر 2013

بین الاقوامی اردو کانفرنس کے دوسرے دن 5 ستمبر کے اجلاس کے اختتام پر بین الاقوامی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پروفیسر وسیم بریلوی، مظفر حنفی، فرحت شہزاد، عطاء الحق قاسمی، محمد علوی، ڈاکٹر زبیر فاروق، عزیز نبیل، نسیم نکہت، انور جلال پوری، راحت اندوری، تقی عابدی، انیس انصاری، جلیل نظامی، سریندر شجر، مہتاب عالم، پرمود تیواری، اور نواز دیوبندی وغیرہ نے اپنے خوبصورت کلام سے محفلِ مشاعرہ کو رونق بخشی۔ مشاعرے کی صدارت پروفیسر وسیم بریلوی نے کی جبکہ نظامت کے فرائض معروف شاعر انور جلالپوری نے انجام دیے۔ قارئین کے ذوق کے لیے شعرا کے چند اشعار یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

راہوں میں بھی رشتے بن جاتے ہیں
یہ رشتے بھی منزل تک جاتے ہیں

(پرمود تیواری، کانپور)

نئی ہواؤں کی صحبت بگاڑ دیتی ہے
کبوتروں کو کھلی چھت بگاڑ دیتی ہے
جو جرم کرتے ہیں اتنے برے نہیں ہوتے
سزا نہ دے کے عدالت بگاڑ دیتی ہے

(راحت اندوری)

چراغوں کو اچھالا جارہا ہے
ہوا پر رعب ڈالا جارہا ہے
جنازے پر میرے لکھ دینا یارو
محبت کرنے والا جارہا ہے

(راحت اندوری)

پچھتر سال کے ہیں دوسری کی بات کرتے ہیں
چچا خشکی میں بیٹھے ہیں تری کی بات کرتے ہیں

(شاہد عدیلی، حیدرآباد)

سرد موسم کڑی دھوپ بھی چھاؤں جیسے
اس کی ہر بات ہے بے مہر ہواؤں جیسے
میرے آنگن میں کبھی تو اترا ہوگا
نقش ہے فرش پہ ایک شے ترے پاؤں جیسے

(ڈاکٹر زبیر فاروق، دوبئی)

آج کل محبت کا کاروبار چلتا ہے
نام تھا وفا جس کا بات وہ پرانی ہے
جانے کن راہوں سے اس شہر میں لایا گیا ہوں
ایسا لگتا ہے یہاں پہلے بھی آیا گیا ہوں
میں نہ یوسف ہوں نہ ایسا کوئی نایاب صفت
کیا خبر کس لیے بازار میں لایا گیا ہوں

(عزیز نبیل، دوحہ قطر)

جو ہم پہ گزری ہے جاناں تمھیں بتائیں کیا
یہ دل تو ٹوٹ گیا ہم بھی ٹوٹ جائیں کیا
ہمارے چاروں طرف حادثے ہوئے لیکن
ہمیں بچاتی ہیں ماں باپ کی دعائیں کیا

(نسیم نکہت، لکھنو)

یہ کیسی یاد ہے بھاتی بھی ہے رلاتی بھی ہے
ہوا دیے کو جلاتی بھی ہے بجھاتی بھی ہے
لکھی ہے دشت نوردی نصیب میں پھر سے
کوئی اسی کی طرح ہو بہو پکارتا ہے
صدائیں سلب ہوئیں کس مقام حیرت پر
کہ میں پکارتا ہوں اور نہ تو پکارتا ہے

(تحسین فراقی، لاہور)

اس طرح دل کو بہلا لیا دیر تک
ایک خط میں نے اس کو لکھا دیر تک
میرا جس حادثے سے تعلق نہ تھا
سن کے اس کو بھی میں چپ رہا دیر تک
بات تھی کچھ اندھیروں سے ٹکراؤ کی
بجھنے والا دیا بھی جلا دیر تک

(انور جلالپوری، لکھنو)

اے شب غم تیری آنکھوں میں بھی تنہائی ہے کیا
چاند مجھ کو نظر آتا نہیں ہرجائی ہے کیا
خواب والو نہ بھروسہ کرو تعبیروں پر
کیا نجومی کی ہر ایک بات میں سچائی ہے کیا؟
رک نہ جانا کبھی رستے میں اگر چوٹ لگے
ٹھہر جانے سے کبھی راہ بھی کٹ پائی ہے کیا
آہ کیوں کھینچتے ہو سوکھے ہوئے پھولوں پر

تازہ خوشبو گئے موسم کی چلی آئی ہے کیا
اے انیس اپنے غموں پر نہ کرو وقت خراب
دوسروں کے لیے فرصت کبھی مل پائی ہے کیا
(انیس انصاری، لکھنو)

ایسے اس کا چہرہ باتیں کرتا ہے
جیسے صبح کا تارہ باتیں کرتا ہے
ہاں مجھے اس سے محبت ہے محبت ہے بہت
ہاں مجھے جرم محبت کی سزا دی جائے
تو میرے ساتھ ہے ساون کی گھٹا کی صورت
کیوں نہ یہ عمر تیرے ساتھ بتا دی جائے
یہ میرے مرشد کامل نے کہا ہے مجھ سے
زخم کھا کر بھی زمانے کو دعا دی جائے
گلیوں میں لہو دیکھ کے کہتا ہے سب اچھا
میں حاکم دوراں تیری عزت نہیں کرتا
(عزیر احمد، لاہور)

اسے اب بھول جانے کا ارادہ کرلیا ہے
بھروسہ غالبًا خود پر زیادہ کرلیا ہے
لگتا ہے بہت دیر رکے گی میرے گھر میں
اس رات کے گھر میں شناسائی بہت ہے
زمیں وآسماں کے درمیاں میں کوئی رہتا ہے یا پھر وسوسہ ہے
یہ تم کیوں آرہے ہو درمیاں میں یہ میرا اور خدا کا مسئلہ ہے
سن اے دور جوانی سن کہ سر سے نشہ تیرا اترتا جارہا ہے
ادھر ہوتی تھیں پھولوں کی قطاریں کس نے راستہ بدلا ہوا ہے
(عطاء الحق قاسمی، لاہور)

بھٹکے ہوئے منزل پہ پہنچ جائیں گے خود ہی
رستوں سے اگر راہنماؤں کو ہٹادو
لوگوں میں فقط عیب نظر آتے ہیں جس کو
اس کو بھی فقط آئینے خانے میں بٹھادو
(ڈاکٹر تقی عابدی، کناڈا)

جن پر لٹا چکا تھا میں دنیا کی دولتیں
ان وارثوں نے مجھ کو کفن ناپ کر دیا
باپ اور بیٹا پہلے آئیں تو پھر پوتا آتا ہے
آنے کی ترتیب ہے لیکن جانے کی ترتیب نہیں
بن جائے اگر بات تو بس کہتے ہیں کیا کیا
اور بات بگڑ جائے تو کیا کیا نہیں کہتے
سمندر میں یہ ندیاں ڈوبتی ہیں
سمندر ڈوبتا ہے آنسوؤں میں
محفل میں جسے غور سے سب دیکھ رہے تھے
دیکھا نہ اسے میں نے تو اس نے مجھے دیکھا
کچھ اس طرح سے اسے پیار کرنا پڑتا ہے
کہ اس کے پیار سے انکار کرنا پڑتا ہے
کبھی کبھی تو وہ اتنا قریب ہوتا ہے
کہ اپنے آپ کو دیوار کرنا پڑتا ہے
خدا نے اس کو عطا کی ہے وہ مسیحائی
کہ خود کو جان کے بیمار کرنا پڑتا ہے
وہ ہاتھ رکھ کے میرے دل پہ جب بھی پوچھتا ہے
نواز درد سے انکار کرنا پڑتا ہے
میرے حصے کے قطروں پر پہرہ بیٹھا رکھا ہے
اس نے اپنی پیاس کی خاطر دریا قبضہ رکھا ہے
جس سے اپنے اندر کے بھی عیب دکھائی دیتے ہیں
ہم نے ایک ایسا بھی چشمہ بنوا رکھا ہے
(نواز دیوبندی)

اندھیرا ہے کیسے ترا خط پڑھوں
لفافے میں کچھ روشنی بھیج دے
کہیں کھو نہ جائے قیامت کا دن
یہ اچھا سمے ہے ابھی بھیج دے
ہمیں بھی آتا ہے مسکرانا
مگر کسے مسکرا کے دیکھیے
(محمد علوی، احمد آباد)

شعلہ ہے اسے چوم رہا ہوں پھر بھی
خالی ہے سبو جھوم رہا ہوں پھر بھی
وہ مجھ سے گریزاں ہے ہوا کی مانند
پنکھا ہوں گھوم رہا ہوں پھر بھی
مناسب ہے کہ پڑھ لی جائے تختی
کسی در پر صدا دینے سے پہلے
(مظفر حنفی، نئی دہلی)

عجب دشمن ہے ظالم ساتھ بھی میرا نہ چھوڑے گا
مگر مجھ کو ڈبونے کا کوئی موقع نہ چھوڑے گا
تجھے کھونے گنوانے کا وہ ایک بے نام سا لمحہ
مجھے لگتا ہے ساری زندگی پیچھا نہ چھوڑے گا
(وسیم بریلوی)

ان شعرا کے علاوہ فرحت شہزاد (نیو جرسی) جلیل نظامی (دوحہ)، سریندر شجر، مہتاب عالم وغیرہ نے بھی اپنی خوبصورت شاعری سے سامعین کو محظوظ کیا۔ ■

مشاعرے کے دوران سامعین کا منظر

قانون حق تعلیم اور ہمارا سماجی رویہ

ریاض احمد

بے شک 'قانون حق تعلیم' دنیا کے ایک بڑے جمہوری ملک کے باشعور افراد کو دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم اپنے مستقبل کے تئیں کتنے سنجیدہ ہیں۔ جہاں عدالت کو گائیڈ لائن Guide Line بنانی پڑی کہ تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم حاصل کرنا ان کا بنیادی حق ہے اور حکومتوں کو بغیر کسی تفریق کے 6-14 سال کی عمر کے تمام بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولت مہیا کرانی چاہیے۔ ایک طرف انسان مریخ پر حیات و نباتات کی تلاش کرنے اور رموز کائنات جاننے میں کروڑوں ڈالر خرچ کر رہا ہے تو دوسری طرف وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کے بچوں کو ابتدائی تعلیم مہیا کرانے سے قاصر ہے۔ اس تلاش حیات و کائنات میں ہمارے سائنسداں بھی کسی نہ کسی طرح شامل ہیں، یہ وہی ملک ہے جس نے سیکڑوں ایسے سائنسداں پیدا کیے جنھوں نے کائنات کی پیدائش کا راز جاننے کے لیے کامیاب کوششیں کیں اور یہ وہی ملک بھی ہے جہاں ابھی تک تقریباً 20% بچوں نے اسکول کا منھ نہیں دیکھا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ آزادی کے بعد ملک کی تعمیر نو کے لیے جن چند شعبوں پر زیادہ توجہ دی گئی ان میں تعلیم کا شعبہ سرفہرست رہا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک نے ترقی کی کئی منزلیں بہت تیزی سے طے کی۔ تعلیم کی مختلف جہتوں مثلاً دسترس یا رسائی (Access)، مساوات (Equality)، معیار (Quality) اور فضیلت و برتری (Excellence) کے حصول میں پوری قوت صرف کی گئی۔ پنچ سالہ منصوبے، مختلف سطحوں کے تعلیمی پراجکٹس، متعدد تعلیمی کمیشن و کمیٹیاں اور لائحہ عمل کے ذریعے تعلیم کو ہر لحاظ سے مضبوطی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ یہی نہیں مذکورہ مقاصد کو پورا کرنے کے لیے آئین میں بھی ترمیم کر کے تعلیم کے شعبے کو ریاستی فہرست (State List) سے مساوی فہرست (Concurrent List) میں لایا گیا تا کہ تعلیم کے فوائد اور برکتوں کو ملک کی سبھی ریاستوں اور خطوں کے ہر طبقے کے لوگوں تک مساویانہ طور پر پہنچایا جا سکے۔ متعدد پنچ سالہ منصوبوں میں تعلیم پر کیے جانے والے اخراجات کو بتدریج بڑھایا گیا۔ چنانچہ دسویں پنچ سالہ منصوبے کے مقابلے گیارہویں پنچ سالہ منصوبے میں تعلیم پر خرچ کے بجٹ کو پانچ گنا زیادہ کر دیا گیا۔ اس کی افادیت بتاتے ہوئے وزیر اعظم نے اس پلان کو Educational Plan سے موسوم کیا۔

عام طور پر ہمارے ملک میں اچھی باتوں کو عوام تک پہنچانے کے لیے قانون بنانے کی ضرورت پڑتی ہے حالانکہ ہمارے آئین کے کئی دفعات میں مختلف طرح سے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے کی سہولت فراہم کرنے کی بات کہی گئی ہے نیز اس کی ہمہ گیریت کے لیے کئی منصوبے بھی روبہ عمل لائے گئے مثلاً آپریشن بلیک بورڈ Operation Black Board ابتدائی تعلیم کی ہمہ گیری Universalization of Elementary Education اور سب کے لیے تعلیمی مہم Sarva Shiksha Abhiyan (SSA) وغیرہ لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ آخر کار پارلیمنٹ کو آئین میں ترمیم کر کے ایک قانون بنانا پڑا جس کی رو سے آرٹیکل 21 کو وسعت دے کر آرٹیکل 21-A کی شکل میں لانا پڑا جس کی تکمیل 2009 میں ہوئی اور پوری طرح نفاذ یکم اپریل 2010 سے ہوا۔ اس قانون کی رو سے سبھی بچوں، جن کی عمر 6-14 سال ہو، کو تعلیم کا حاصل کرنا آئینی حق قرار دیا گیا۔ اس قانون کی بہت ساری شقوں میں تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع، ان کے مقام، کمیونٹی، معاشرہ، اساتذہ، ادارے، افراد اور والدین و سرپرست کے لیے ہدایات بیان کی گئی ہیں۔ یہی نہیں اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ ہر ان کمزور طبقات کے بچوں کو جو خواہ معاشی طور پر کمزور ہوں یا سماجی طور پر کمزور اور پچھڑے ہوں یقین دہانی کرائی جائے کہ وہ اسکول میں داخلہ لیں اور کم از کم چودہ سال کی عمر تک قائم رہیں تا کہ وہ آٹھویں درجہ تک کی تعلیم حاصل کر لیں۔

ہمارے ملک میں معاشی اور معاشرتی طور پر تین طبقات ہیں اور ان طبقات کے بھی کئی ذیلی طبقات ہیں۔ مذکورہ قانون کے تحت سبھی طبقوں کے بچوں کو تعلیم حاصل کرنا لازمی قرار دیا گیا ہے۔ ان تینوں طبقات میں سب سے اوپر کے طبقے کو تعلیم حاصل کرنے میں کوئی پریشانی نہیں بلکہ وہ چاہیں تو گلوبل مارکیٹ میں کھلی ہوئی تعلیمی دکانوں سے اپنے بچوں کے لیے ڈگریاں کسی بھی قیمت پر خرید سکتے ہیں۔ وہ دنیا کے معروف و مشہور اسکولوں میں اپنے بچوں کو داخل کرا سکتے ہیں۔ دوسرا طبقہ جسے درمیانی طبقہ کہہ سکتے ہیں اور جس کے اگر مزید تین حصے کر لیے جائیں تو صورت حال یوں بنتی ہے کہ ایک وہ سماجی درجہ جو اعلیٰ طبقے کی ہم سری کرنے کو پابہ رکاب ہے اور ہر معاملے میں اپنا موازنہ اعلیٰ طبقے سے کراتا ہے۔ یہ طبقہ بھی کسی نہ کسی طرح اندرون ملک یا بیرونی ممالک کے بہتر اسکولوں میں اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کی خواہش بھی رکھتا ہے اور اس کے لیے تیار بھی ہے۔ معیاری تعلیم کے تئیں اس طبقے میں مغربیت کا رجحان پیدا ہوا ہے کیونکہ پچھلی دو تین دہائیوں میں اچھے پبلک اسکولوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے یہی نہیں کئی ریاستوں میں فائیو اسٹار (5 Star) اسکولوں کی تعداد بھی تیزی سے بڑھ رہی ہے بعض اسکولوں کے اشتہار دیکھنے سے لگتا ہے کہ وہ تعلیمی ادارے کے اشتہار نہ ہوں بلکہ ہنی مون منانے کے پیلیس نما ہوٹل کے ہوں مثلاً عمدہ فرنیچرس، گولف کورس، ایرکنڈیشن کمرہ جماعت، CCTV، فائر سیفٹی سسٹم، پبلک اڈریس سسٹم، Back ground music، کیبل ٹی وی، چوبیس گھنٹے پاور بیک اپ اور Broad Band Connectivity وغیرہ۔ تعلیم کا اعلیٰ مقصد انسانی بھلائی اور بقائے باہم ہے ہم جن طلبا کو Touch Screen کلاسیز مہیا کرا رہے ہیں کیا ان میں Human touch کے جذبے کا فروغ بھی ہو سکے گا جو انسانیت اور اس کائنات کی بقا کے لیے

نہایت ضروری ہے۔ ایسے اسکول قائم کرنے والے افراد اور استعمال کرنے والے طبقے کو اس پر ٹھنڈے دماغ سے غور کرنا چاہیے۔ اس درمیانہ طبقے میں ایک اوسط درجہ ہے جس کے بچے ان پبلک اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں جہاں 'پبلک' نظر نہیں آتی۔ تیسرا درجہ وہ ہے جن کے بچے چھوٹے پبلک اسکولوں اور اچھے سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ ان بچوں کے لیے ہے جو پوری آبادی میں اس عمر گروپ کے تقریباً 80% ہیں اور جن کے والدین معاشی اور معاشرتی دونوں لحاظ سے پچھڑے ہوئے ہیں۔ یہ بچے عام سرکاری اسکولوں میں داخل ہوتے ہیں جو دیہی علاقوں اور قصبوں میں سرکاری یا نیم سرکاری اور شہری علاقوں میں میونسپل کمیٹی اور کارپوریشن کے اسکول کہلاتے ہیں۔ ان اسکولوں کا انتظام نہایت ناقص ہوتا ہے۔ درس و تدریس کا یہ عالم ہے کہ وہاں پڑھانے والے اساتذہ بھی اپنے بچوں کو ان اسکولوں میں داخل کرانا نہیں چاہتے۔ حالانکہ سرکاری اخراجات اور بجٹ کا بیشتر حصہ ان ہی سرکاری اسکولوں کے لیے مختص ہوتا ہے۔ بہت سے بین الاقوامی، قومی اور ریاستی سطح کے ترجیحاتی پروگرام ان ہی اسکولوں کے لیے مرتب کیے جاتے ہیں۔ لیکن خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا ہے۔ اب بھی وہاں ایک یا دو ٹیچر والے اسکولوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جہاں اکثر مدرسین غیر حاضر رہتے ہیں۔ بہت سارے اسکولوں میں عمارت کے نام پر کسی خاص طرح کا ڈھانچہ کھڑا نظر آتا ہے جہاں کمرۂ جماعت میں بیٹھنے کی مناسب جگہ میسر نہیں۔

پچھلے سال کے سپریم کورٹ کے فیصلے سے سماجی برابری کے نظریے کو تقویت ملی ہے کہ پرائیویٹ اسکولوں کو ہر سال اول جماعت کی کل تعداد کا 25% کمزور اور محروم طبقات کے بچوں کے لیے مختص کرنی پڑے گی اور حکومتوں کو ان اسکولوں کو تعداد کے لحاظ سے مالی معاونت کرنی ہوگی تاکہ اسکولوں کے خسارے کو کم کیا جا سکے اور معیار کو بہتر بنایا جا سکے۔ اس فیصلے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس وقت کے فروغ انسانی وسائل کے وزیر جناب کپل سبل نے کہا تھا:

''یہ قانون جنس، ذات، طبقات اور برادری پر مبنی ان رکاوٹوں کو ہٹانے کا موقع دیتا ہے جو ہماری جمہوریت کے سماجی تانے بانے کو توڑنے کے درپے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ہمارے مستقبل کو بہتر بنانے والا نظریاتی قانون ہے اور اگر سرکاری حکام اور دیگر متعلقین نے اسے ٹھیک جذبے سے نافذ کیا تو یہ پوری دنیا میں پیروی کے لیے ایک مثال بن سکتا ہے۔''

حالانکہ اس مسئلے پر جہاں سماج کے مختلف طبقوں کی اپنی اپنی رائے ہے وہیں ماہرین تعلیم اور اساتذہ برادری کو بھی کئی خدشات ہیں۔ اگر مان بھی لیا جائے کہ کمزور طبقات کے 25% بچوں کا داخلہ پرائیویٹ اور Elite اسکولوں میں ہو بھی جاتا ہے تب بھی مشکلات کم ہوتی نظر نہیں آتی کیوں کہ اول درجے میں پہنچنے سے پہلے اعلیٰ طبقے کے بچے ان نرسری اور Play اسکولوں میں خاص تربیت حاصل کر چکے ہوتے ہیں جن میں مختلف جہات سے ان پر توجہ دی جاتی ہے مثلاً Baby Bloom پروگرام، Toddler پروگرام، نرسری اور پری پرائمری اسکول کے دیگر نصابی اور ہم نصابی سرگرمیاں وغیرہ۔ اونچے طبقے کے بچے مذکورہ، پروگراموں، سرگرمیوں کے تحت اعداد کی پہچان، معمولی لکھنا پڑھنا، ماحول سے واقفیت، اقدار کی واقفیت، مختلف رنگوں اور اشیا میں فرق، ان کا جائزہ، Visual Arts اور Life Skills وغیرہ کا علم حاصل کر چکے ہوتے ہیں۔ جب کہ عام طلبا جو پہلی بار درجہ اول میں داخل ہوتے ہیں ان کے لیے یہ سب نئی بات ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ ان تمام سرگرمیوں اور کارکردگی میں ان کا معاشرہ بھی شامل ہوتا ہے ان کے خاندان اور والدین بھی شامل ہوتے ہیں۔ والدین خواندہ ہی نہیں بلکہ عام طور پر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں جب کہ ان 25% بچوں کے والدین بمشکل خواندہ ہوتے ہیں اور روزی روٹی کی وجہ سے اپنے بچوں کو وقت نہیں دے پاتے۔

اس قانون کی رو سے سبھی بچوں، جن کی عمر 6-14 سال ہو، کو تعلیم کا حاصل کرنا آئینی حق قرار دیا گیا۔ اس قانون کی بہت ساری شقوں میں تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع، ان کے مقام، کمیونیٹی، معاشرہ، اساتذہ، ادارے، افراد اور والدین و سرپرست کے لیے ہدایات بیان کی گئی ہیں۔ یہی نہیں اس کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ ہر ان کمزور طبقات کے بچوں کو جو خواہ معاشی طور پر کمزور ہوں یا سماجی طور پر کمزور اور پچھڑے ہوں یقین دہانی کرائی جائے کہ وہ اسکول میں داخلہ لیں اور کم از کم چودہ سال کی عمر تک قائم رہیں تاکہ وہ آٹھویں درجہ تک کی تعلیم حاصل کر لیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ بچوں اور والدین دونوں میں تعلیم کی اہمیت کا احساس بہت تیزی سے ہوا ہے۔ ہر شخص اپنے بچے کی تعلیم کے تئیں سنجیدہ ہے مگر ہمارے سامنے کئی انفرادی و اجتماعی مسائل ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق (0-14) سال کے بچوں کی کل تعداد ہماری مجموعی آبادی کا 29.3% ہے اور اگر حق تعلیم کے نفاذ کے لیے سماج کا ہر طبقہ سچے دل سے کوشش کرے تو ہم صد فیصد تعلیم کا ہدف حاصل کر سکتے ہیں لیکن اس میں کئی طرح کی سماجی و معاشی دشواریاں حائل ہیں مثلاً پورے ملک میں آبادی اور ضرورت کے لحاظ سے تقریباً 41% اساتذہ کی کمی ہے۔ اس وقت پورے ملک میں لگ بھگ گیارہ لاکھ 80 ہزار اساتذہ کی تقرری کی ضرورت ہے۔ اساتذہ کی کمی کی وجہ سے جن بڑی ریاستوں میں تعلیمی ترقی متاثر ہو رہی ہے ان میں اتر پردیش (3.06 لاکھ)، بہار (2.60 لاکھ)، مغربی بنگال (1.04 لاکھ)، چھتیس گڑھ (63 ہزار)، مدھیہ پردیش (تقریباً 95 ہزار)، جھارکھنڈ (تقریباً 68 ہزار)، اڑیسہ اور مہاراشٹر لگ بھگ (33-33 ہزار) اور گجرات (27 ہزار سے زائد) اساتذہ کی کمی کے لحاظ سے سرفہرست ہیں۔ اگر ہم مذکورہ ریاستوں میں حق تعلیم کو موثر ڈھنگ سے نافذ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں جلد سے جلد اساتذہ کی اس کمی کو پورا کرنا ہوگا۔ اساتذہ سے متعلق ایک اور دشواری ان کی عارضی (اڈہاک) تقرری یا ودیا سہائک، شکچھا متر، رہبر تعلیم یا اس زمرے کے اساتذہ ہیں جن کو معیاری تعلیم و تربیت حاصل نہیں ہے ان کو تنخواہ بھی کم دی جاتی ہے اس لیے بھی وہ تدریس کے نام پر صرف خانہ پری کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں سپریم کورٹ کے جسٹس بی ایس چوہان اور جسٹس دیپک مشرا کی بنچ نے ٹیچروں کی بحالی کے اس نظام سے ناخوشی کا اظہار کرتے ہوئے فیصلہ دیا ہے۔ یہی نہیں بعض ریاستوں میں معقول تعداد میں اسکول و اساتذہ کے ہوتے ہوئے بھی ضروری سہولتوں کا فقدان ہے جس کی وجہ سے طلبا کی ایک بڑی تعداد معیاری تعلیم سے محروم ہو جاتی ہے۔ رپورٹ کے مطابق ابھی بھی تقریباً 6% اسکولوں میں پینے کا صاف پانی میسر نہیں۔ سماج میں صاحب استطاعت اور ذی شعور والدین اپنے بچوں کے ساتھ پینے کا پانی دیتے ہیں لیکن غریبی کی سطح سے نیچے زندگی گزارنے والے والدین اپنے بچوں کے لیے اس

طرح کا انتظام کرنے سے قاصر ہیں جس سے ان بچوں کو آلودہ پانی پینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ پانی کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مسئلہ ٹوائلیٹ کا بھی ہے ابھی بھی لگ بھگ 35% اسکولوں میں طلبا و طالبات کے لیے مشترکہ بیت الخلا ہے۔

اسکولوں میں Infrastructure کی کمی تو عام ہے اگر سہولتیں ہیں بھی تو ان کو خاطر خواہ ڈھنگ سے استعمال نہیں کیا جاتا اس کی مثال کمپیوٹر کی تعلیم سے دی جاسکتی ہے کہ بعض اسکولوں میں Systems پر دھول جمی رہتی ہے نہ ٹیچر پڑھانے والا ہوتا ہے اور نہ ان کی دیکھ ریکھ کرنے والا عملہ نہ اس کے لیے مناسب لیب۔ اکثر اسکولوں میں طلبا اور اساتذہ کا تناسب غیر متوازن ہے بعض سرکاری اسکولوں میں طلبا کی اتنی کم تعداد ہوتی ہے کہ انھیں اساتذہ کی تعداد سے 2 سے ضرب دیا جاسکتا ہے اور اس کے برعکس کچھ اسکولوں میں طلبا کی تعداد سیکڑوں میں ہوتی ہے اور اساتذہ کی تعداد نہایت کم جس کی وجہ سے ان کو بیک وقت کئی درجات کو پڑھانا پڑتا ہے۔ ملک کی کئی بڑی ریاستوں مثلاً آندھرا پردیش کے متعدد اضلاع (چتوڑ، تروپتی اور عادل آباد) میں طلبا کو زمین پر بیٹھ کر امتحان دیتے ہوئے نیز اتر پردیش کے مرزا پور میں سڑک کے کنارے زمین پر کلاس لگا کر پڑھتے طلبا کی اخبارات نے رپورٹ شائع کی ہیں۔ ظاہر ہے ایک طرف 5 Star اسکول ہیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا اور ایک طرف یہ اسکول ہیں جن میں بنیادی سہولتوں کا فقدان ہے۔ ہمارے سماج کے ذی شعور طبقے کو اور ان اسکولوں کے سربراہوں کو اس مسئلے کی اہمیت پر صدق دل سے غور وفکر کرنا ہوگا۔

اب سوال یہ ہے کہ کس طرح ان اسکولوں کو بہتر بنایا جائے جہاں ملک کی 80% آبادی حصول تعلیم کے لیے فکرمند ہے۔ جہاں خانہ بدوش اور مہاجر خاندان پائے جاتے ہیں۔ جہاں خشک سالی اور سیلاب سے ہزاروں لوگ متاثر ہوتے ہیں۔ جہاں اتراکھنڈ جیسے قدرتی آفات پیش آتی رہتی ہیں۔ جہاں مہینوں تک مختلف وجوہات سے اسکول بند رہتے ہیں اور جہاں تعلیم کی عدم دستیابی یا کم یابی سے سماجی تبدیلی اور ترقی کی رفتار نہایت سست ہے۔

مذکورہ حقائق کے علاوہ چند ایسے مسائل جواب بھی حل طلب ہیں اور جن کا بہتر حل ہمارے مثبت سماجی رویے پر منحصر ہے۔ مثلاً:

❖ ملک کا ہر بچہ پڑھنا چاہتا ہے اور سبھی والدین پڑھانا چاہتے ہیں پھر بھی لاکھوں بچے اسکول سے دور ہیں۔

❖ اسکولوں میں داخلہ مل جانا قانونی مجبوری ہے مگر ان طلبا کے معیار کو بہتر بنا کر اسے قائم کیسے رکھا جائے۔

❖ اسٹیشنری، کتابیں، بستہ، ڈریس و دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں۔

❖ پرائیویٹ اسکولوں کے اساتذہ، انتظامیہ اور ہم جماعتوں کی بدسلوکی کا کیا حل ہے؟

❖ 14 سال تک بچے ابتدائی تعلیم حاصل کرلیں پھر اس کے بعد کہاں جائیں؟ اور اپنی باقی تعلیم کیسے جاری رکھیں؟ چنانچہ قانون حق تعلیم کا دائرہ میٹرک (Xth) تک کیوں نہ کیا جائے تاکہ آٹھویں درجے کے بعد Drop out روکنے میں مدد ملے۔

❖ اس قانون کو بہتر ڈھنگ سے نافذ ہونے کے لیے ریاستی اور قومی سطح پر سیاسی استحکام کی سخت ضرورت ہے تاکہ اس کے لائحہ عمل کو عملی جامہ پہنایا جاسکے کیوں کہ سیاسی اتھل پتھل میں سب سے زیادہ تعلیم کا شعبہ ہی متاثر ہوتا ہے۔

❖ بچوں کے مجموعی تحفظ کو ان علاقوں میں یقینی بنایا جائے جن میں لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ ہے مثلاً جموں وکشمیر، آسام، اور نکسل واد سے متاثر متعدد علاقے تاکہ طلبا بغیر کسی خوف کے اپنی تعلیم جاری رکھیں۔

❖ ہمارے سماج کا ہر طبقہ ایک دوسرے سے جڑا ہی نہیں بلکہ بہت حد تک ایک دوسرے پر انحصار بھی کرتا ہے اگر کوئی طبقہ تعلیمی ترقی میں پیچھے رہ جائے گا تو جلد یا بدیر دوسرے پر بھی اس کا منفی اثر ضرور پڑے گا۔

چنانچہ موجودہ قانون RTE جس کے تحت سبھی کمزور طبقے کو یکساں اور بہتر تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے روشن امکانات موجود ہیں صرف اسے صحیح طور پر نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ سماج میں مثبت سوچ لانے کی ضرورت ہے، عدالت عظمیٰ کے اس فیصلے کو پوری طرح نافذ کرنے کی ضرورت ہے۔ ان اعلیٰ طبقے کے پرائیویٹ اسکولوں کو بھی قومی ترقی میں اپنے مثبت کردار ادا کرنے کا مناسب وقت بھی یہی ہے جنھیں کہا گیا ہے کہ ابتدائی سطح پر کمزور طبقات کے بچوں کو اپنی کل تعداد کا 25% ان طبقات کے طلبا کے لیے محفوظ کردیں اور کوشش کریں کہ کسی طرح وہ بچے اسکول میں حاضر ہوکر سماج کے دوسرے طبقوں کی برابری کرسکیں اور مستقبل میں ایک ایسے ترقی یافتہ سماج کی تشکیل کرسکیں جس کا خواب آزادی حاصل کرتے وقت ہمارے بزرگوں نے دیکھا تھا۔

میور اسکول ، نوئیڈا

حوالے:

1. بھارت کا آئین، 86 ویں ترمیمی ایکٹ 2002
2. آرٹیکل A-21، حق تعلیم ایکٹ 2009
3. ریاض احمد، تعلیم و تدریس کے روشن پہلو، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2011
4. سید نور اللہ اور جے پی نائک، تاریخ تعلیم ہند، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، 1982
5. اختر الواسع، حق تعلیم ایکٹ اقلیتوں کے لیے شعاع امید، اُردو دنیا، جون۔2012
6. کپل سبل، حق تعلیم ایکٹ: پوری دنیا کے لیے ایک مثال، اُردو دنیا، جون۔2012
7. روزنامہ راشٹریہ سہارا، 2 اپریل 2013 اور 21 مئی 2013
8. Abdul Khaliq, An Education Act with more wrongs than rights, The Hindu, 27, July 2012
9. Louis Georges Arsenault, No high five for RTE, The Hindu, 1, April 2013
10. M. A. Baby, Erosion of federal space in education, The Hindu, 11, March, 2010
11. Sapna Sankhla, Do we really need five star schools?, The Hindu, 25, March 2012
12. http://mhrd.gov.in/rte

◘

Dr.Reyaz Ahmad, Assistant Professor, Department of Education & Training, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad - 32 (AP)

ادب اور اساطیر

سیدہ جعفر

ادب ایک سہ حرفی لفظ ہے، تھری ڈائمنشن تصویر کی طرح ایک سے زائد ابعاد کا حامل۔ اس میں بصری امکانات طول وعرض گہرائی اور قرب و بُعد کے تناسب سے تاثر آفرینی کا عنصر شامل ہوجاتا ہے۔ ادب زماں و مکاں اور کائنات کے مختلف مظاہر کا احاطہ کرتا اور انسانی وجود کی معنویت کا احساس دلاتا ہے۔ تینوں ابعاد کی یکجائی اوران کا اتصال تاثر خلق کرتا ہے۔ جب قدیم انسان نے چٹانوں اور پتھروں پر اتاری ہوئی تصویروں اور عکسی اشاروں کے ذریعے سے اظہار وابلاغ کی سرحد پار کی اور اپنے تشکیلی مراحل میں داخل ہوئی تو اس نے اپنے بزرگوں اور خود اپنے اہم جذبات کا نچوڑ لفظوں میں پیش کرنے کی کوشش کی اور گویائی کی قوتوں کو آزمایا جس کا مقصد آگہی اور بصیرت افروز معلومات کی دوسروں تک ترسیل تھا پھر الفاظ مربوط اور مسلسل جملوں میں ڈھلنے لگے۔ بقول F.H Prichard (ایف ایچ پریچڈ) امثال انھیں کا ترقی یافتہ سرمایہ ہیں (Great Essays of All Nations, p 14)

اقوال، فقروں اور امثال نے ایک ہی جست میں مربوط نثر کا فاصلہ طے نہیں کیا بلکہ اُسے اظہار کی مختلف منزلوں سے گزرنا پڑا۔ اپنے بزرگوں، آبا و اجداد اور اگلے وقتوں کے لوگوں کے تجربات ادب میں جگہ پانے لگے۔ دیومالائی تصورات اور اساطیر الاولین نے ادب میں اپنی جگہ بنائی۔ قرآن مجید میں 'اساطیر الاولین' سے مراد قدیم زمانے کے لوگوں کے قصوں سے ہے اور نو(9) جگہ اس کا ذکر آیا ہے جس کی تفصیل حاشیے میں دی گئی ہے۔ قدیم انسان کو کچھ تصورات اور معتقدات کرداروں، قصوں اور ذہنی رویوں کی حیثیت سے ورثے میں ملے تھے۔ دیوی دیوتا، محیرالعقل واردات، اور مختلف النوع تجربات یونگ (Yung) کے الفاظ میں اس کے اجتماعی لاشعور میں محفوظ ہوگئے تھے اور اس کے افکار و معتقدات کا جزو بن گئے تھے۔ دنیا کی متعدد زبانوں میں اساطیر کا اثاثہ اسی کی یادگار ہے۔ یونانی، لاطینی، چینی، عبرانی، رومی اور سنسکرت زبانیں اس سے مالامال ہیں اردو زبان میں دوسری زبانوں کی نسبت صنمیات اور دیومالائی تصورات کی کمی اس لیے بھی محسوس ہوتی ہے کہ اس کی فکری بنیادوں پر زیادہ تر اسلامی عقائد چھائے ہوئے ہیں۔ تلمیحات کی حیثیت سے حضرت آدم، نوح، ایوب، یعقوب، یوسف، موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے قصوں نے ادب میں جگہ ضرور پائی ہے لیکن ان کا شمار اساطیر کے زمرے میں نہیں کیا جاسکتا:

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محو ماہ کنعاں ہوگئیں

خدا کی دین کا موسیٰ سے پوچھیے احوال
کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

بیمار اجل چارہ کو گر حضرت عیسیٰ
اچھا بھی کریں گے تو کچھ اچھا نہ کریں گے

گیا شیطان مارا ایک سجدہ کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

بعض مصنفین اساطیر کو جو 'اسطورہ' کی جمع ہے متھ (Myth) کا نعم البدل تصور کرتے ہیں۔ متھ یونانی لفظ Mothos سے اخذ کیا گیا ہے: A. F Scott اپنی کتاب Current Literary Terms (1979) میں لکھتا ہے کہ:

"A traditional story of legent offering explanation of a religious or supernatural Phenomenon."

متھ کی تعریف کرتے ہوئے مصنفین نے اس کے مختلف پہلوؤں میں سے کسی مخصوص پہلو کو مرکز نگاہ قرار دیا ہے۔ M.A Albroms کی دانست میں Myth کہانی یا پلاٹ ہے اور اس سے غرض نہیں کہ وہ فرضی ہے یا حقیقی (A Glossary of Literary Terms)۔ انگریزی میں فرضی یا غیر حقیقی اور افسانوی کے معنی میں اصلی اور حقیقی کے برعکس استعمال کیا جاتا ہے۔ حقیقی یا تخیلی ہونے سے فرق نہیں پڑتا کیونکہ اس کا مقصد انسانی تجربے کی معنویت کا احساس دلانا اور زندگی کے اسرار و رموز تک ذہن کی رسائی ہونا ہے۔ اردو میں لفظ 'اسطورہ' اسطور کے املا کے ساتھ بھی کہیں کہیں تحریر کیا ہوا ملتا ہے۔ مستند لغت 'لغت کشوری' میں اسطورہ درج کیا گیا ہے اور اس کے معنیٰ افسانہ اور سخن باطن کے بیان کیے گئے ہیں۔ (ص 22)

پرانوں میں بیان کیے ہوئے واقعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے (1) دیدہ اور (2) شنیدہ۔ دیدہ کردار یا واقعات کو آکھیان आख्यान کہا گیا ہے میں نے لفظاً لفظاً جے رام پانڈے کی سنسکرت کتاب 'پرنال پروتا گرھن آکھیان' ڈاکٹر اُپادھیائے سے جو سنسکرت کے پروفیسر ہیں پڑھ کر اس کے اہم اور نایاب مواد سے تاریخ 'ادب اردو ابتدا سے 1700 تک' (مطبوعہ NCPUL) میں استفادہ کیا ہے۔ مصنف علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا سنسکرت شاعر تھا اس نے اپنی آنکھوں سے بادشاہ کو دیکھا تھا اور اس کی مہمات بھی شاعر کے پیش نظر تھیں۔ شنیدہ واقعات کو اپاکھیان उपाख्यान سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اردو میں انیس و دبیر کے علاوہ متعدد مرثیہ نگاروں نے واقعات کربلا نظم کیے ہیں۔ یہ مذہبی بیانیہ ہے جن کا تاریخی ثبوت موجود ہے۔ ہم کربلا کے واقعات کو اساطیر کے ذیل میں جگہ نہیں دے سکتے۔ یہ اسلامی تاریخ کا حصہ ہیں۔ مثنوی میں اس کے برخلاف تخیلی قصے نظم کیے گئے ہیں۔

اردو کے فنکاروں نے ہندوستانی صنمیات اور دیومالا کی طرف اشارے کیے ہیں کیونکہ یہ ان کے اجتماعی لاشعور میں سرایت کر گئے تھے۔ تلمیحات ماضی کی وہ روایات ہیں جن کی معنویت ہمارے اجتماعی حافظے میں نفوذ کر جاتی ہے اور شعوری اور لاشعوری طور پر تخلیقی لمحات میں فنکار کے سامنے images کی کائنات لیے ہوئے ظاہر ہوتے

ہیں۔ دیومالا کے قصے، مذہبی و تاریخی واقعات، لوگ روایات اور Oral Traditions تلمیحات کا جزو بن گئے ہیں یہ وہ بلیغ اشارے اور علامتیں ہیں جو طویل تجربات و واقعات کو اپنے جلو میں لیے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور چند لفظوں میں ان کی طرف اشارہ کرکے بلاغت وجامعیت اور تقلیل الفاظ کے وسیلے سے وسعت کو ایجاز و ارتکاز کا روپ عطا کرتے ہیں۔ مقامی اثرات سے فنکاروں کے ذہن کا متاثر ہونا بُعد اور مغائرت سے نجات پانے کا ذریعہ بن گیا۔ دکنی ادب میں متعدد ہندوستانی تلمیحات اور مذہبی کرداروں کے کنائے سما گئے ہیں:

پل پل کو دل منے مرے نس دن توں یوں بسے
جوں برہمن کے دل میں سدا رام رام ہے

گرچہ لچھمن ہے تیرا رام ولے
اے صنم تو کسی کا رام نہیں

نین راوت ہیں ارجن بان پلکیں
بھوئیں اور پلکیں دھنک بھیم کی

اردو کے فنکاروں نے ہندو دیومالا کی طرف اشارے کیے ہیں کیونکہ یہ ان کے اجتماعی لاشعور میں سرایت کرگئے تھے۔ فراق کہتے ہیں:

شیو کا وش پان تو سنا ہوگا
میں بھی اے یار پی گیا آنسو

ہر لیا ہے کسی نے سیتا کو
زندگی ہے کہ رام کا بن باس

میرتقی میر نے کہا تھا:

پایا نہ دل بہایا ہوا سیل اشک سے
میں پنچہ مژہ سے سمندر بلا چلا

آتش عشق نے راون کو جلا کر مارا
گرچہ لنکا میں تھا اس دیو کا گھر پانی میں

اثر لکھنوی کا شعر ہے:

مدھ کی کٹوریوں میں وہ امرت گھلا ہوا
جس کا ہے کام دیو پیاسا غضب غضب

جاں نثار اختر کہتے ہیں:

اجڑی اجڑی ہوئی ہر آس لگے
زندگی رام کا بن باس لگے

غزل کا آرٹ حرکی اور زندگی کی طرح حرکت و نمو میں رچا بسا ہوا ہے۔ وہ اپنے دور کی حسیت اور تہذیبی زندگی کی دھڑکنوں پر رقص کرتا ہے۔ یہ دریا کو کوزے میں سمونے اور ریزہ کاری کا فن ہے اور قاری کی ذہانت سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس سمندر کی غواصی کرے گا اس کے برخلاف افسانے اور ناول میں تصریح کی گنجائش موجود ہوتی ہے وسیع کینوس بیانیہ کے خدوخال کو بخوبی اجاگر کرسکتا ہے اور اس کی پنہائیوں کو ظاہر ہونے کا اچھا موقعہ ملتا ہے۔ شرح و بسط کی وجہ سے zooming کی سہولت فراہم ہوتی ہے۔

جدید تنقید میں اسطورہ کی وضاحت کرتے ہوئے رولاں بارتھ اور نارتھ فرائی کا حوالہ دیا گیا ہے۔ رولاں بارتھ اسطورہ کو Sign سے تعبیر کرتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ وسیع معنی کو مختصر لفظوں میں پیش کرکے ادب کی بلاغت اور وقعت و معنویت میں اضافہ کیا جاسکتا ہے۔ نارتھ فرائی نے اساطیر کو ادب کا 'مترادف' قرار دیا ہے اور کہتا ہے کہ

> اردو کے فنکاروں نے ہندوستانی صنمیات اور دیومالا کی طرف اشارے کیے ہیں کیونکہ یہ ان کے اجتماعی لاشعور میں سرایت کرگئے تھے۔ تلمیحات ماضی کی وہ روایات ہیں جن کی معنویت ہمارے اجتماعی حافظے میں نفوذ کرجاتی ہے اور شعوری اور لاشعوری طور پر تخلیقی لمحات میں فنکار کے سامنے images کی کائنات لیے ہوئے ظاہر ہوتے ہیں۔ دیومالا کے قصے، مذہبی و تاریخی واقعات، لوگ روایات اور Oral Traditions تلمیحات کا جزو بن گئے ہیں یہ وہ بلیغ اشارے اور علامتیں ہیں جو طویل تجربات و واقعات کو اپنے جلو میں لیے ہوئے نمودار ہوتے ہیں اور چند لفظوں میں ان کی طرف اشارہ کرکے بلاغت وجامعیت اور تقلیل الفاظ کے وسیلے سے وسعت کو ایجاز و ارتکاز کا روپ عطا کرتے ہیں۔

ادب کی ہیئت اساطیر پسند ہوتی ہے اور ادبی تنقید میں اس کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اس کا خیال ہے کہ اسطورہ حقیقت کی اعانت کرتا اور اسے تقویت پہنچاتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ حقیقت اسطورہ کو توانائی اور حرارت فراہم کرے۔ ادب ہر دور میں نئے امکانات، نئی جہتوں اور نیا نقطہ نظر تراشتا ہے۔ اسطورہ بھی ہر دور میں اپنی رمزیت اور ایمائیت کی نئی معنوی پرتیں کھولتا جاتا ہے اور عصری تقاضوں کی تکمیل کرتا ہے۔ بیدی کا 'گرہن' بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں لکھا گیا تھا۔ چاند گرہن عورت کے گرہن اور اس کے مصائب کا معنی خیز استعارہ بن گیا ہے اس تخلیق میں اسطورہ علامتی اشاروں میں ڈھل کر ایک زائد جہت کا احاطہ کرتا ہے اور تہہ دار پیش کش بن گیا ہے۔ جوگیندر پال کی کہانیوں میں دیومالا و اساطیر انسانی مزاج اور اس کے مضمرات اور پوشیدہ گوشوں کو بے نقاب کرتے ہیں۔ 'کھوکھو بابا کا مقبرہ' میں کھوکھو بابا ایک روایتی اور اسطوری نوعیت کا کردار ہے۔ کھوکھو نے جو زمین جوہر سے خریدی تھی وہاں اس کا مقبرہ چبوترے پر بنایا جاتا ہے۔ کھوکھو بابا ہندوستانی ذہنیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جوگندر پال کے افسانے 'عفریت' کو پڑھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ نئی اور پرانی نسل میں generation gap کے علاوہ روحانی خلا بھی پیدا ہوگیا ہے یہ Spiritual Vaccum ہمیں اقدار کی بدلتی ہوئی نوعیت اور آج کی ترقی یافتہ زندگی میں اخلاقی عناصر کی بے قدری اور روحانیت سے بیزاری کا احساس دلاتی ہے۔ اس کا ہیرو اپنے ہوٹل کے کاروبار میں مصروف ہے اور اس کی رفیقہ حیات اپنے عاشق کے ساتھ تفریح میں مشغول اسی عاشق سے بیوی کو ایک لڑکا موہت تولد ہوتا ہے۔ ہیرو بچے کی حقیقت سے واقف ہوتے ہوئے بھی اسے اپنے لیتا ہے۔ رام لیلا گراونڈ میں جب موہت اپنے سوتیلے باپ کے ساتھ راون کو جلانے کا تماشہ دیکھنے جاتا ہے تو کہتا ہے:

''پاپا پاپا اماں کو بھی ساتھ نہیں لائے۔'' ہیرو جواب دیتا ہے ''اماں نے بہت سے راون دیکھے ہیں بیٹا۔''

راون کا کردار خباثت، باطل پرستی، بداخلاقی اور طاغوتی قوتوں کا نمائندہ بن گیا ہے۔ ہر انسانی وجود میں ایک راون چھپا ہوا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ اس کا نفس امارہ ہے جسے مار کر ہم ذہنی و جذباتی سکون حاصل کرسکتے ہیں۔ اس حقیقت کی تفہیم ضروری ہے کہ اساطیر، Reality کی پہچان کا بہت آزمودہ اور پرانا حربہ ہے۔ ہیرو خود ہتھیاروں کا کاروبار کرتا اور غیر سماجی سرگرمی میں ملوث رہتا ہے۔ یہ بھی راون کے بھیس میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہیرو کا اپنی بیوی کو بداخلاقی سے باز نہ رکھنا آج کے دور میں انسان کی مصلحت پسندی، بےحسی اور منفعت پرستی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ ہم نے سچائی اور اعلیٰ اقدار حیات کو مسخ کرنے کے ہنر میں مہارت حاصل کرلی ہے۔ مظہرالزماں پر بعض نقادوں نے یہ اعتراض کیا ہے کہ کہیں کہیں انھوں نے اپنی تخلیقات بالخصوص 'ایک شہر جو کبھی آباد تھا' میں بیانیہ کے مطالبات سے زیادہ انشائیے کے تقاضوں کی تکمیل کی ہے۔ اس میں ہندوستانی مسلمانوں کے زوال کی داستان بیان کی گئی ہے۔ کتا اصحاب کہف کے کتے کی یاد دلاتا ہے اور مسلمانوں کے ذہن پر تاریخ کی مسلط کی ہوئی غفلت اصحاب کہف کی

نیند کی طرف ہمیں متوجہ کرتی ہے وہ کہتے ہیں:

''مختلف ممالک کے سیاحوں کا قافلہ شیخ سعدی کا مرثیہ پڑھتا ہوا جب شہر میں داخل ہو رہا تھا تو ایک سیاہ کتا شہر کے اندر سے باہر نکل گیا اور ہم شہر معدوم میں داخل ہوئے تو فصیل جسم سے پشت لگائے ایک ہزار سالہ بوڑھا بیٹھا تھا۔''

کہانی میں اساطیری عناصر کی پذیرائی کے سلسلے میں جابر حسین کی کہانی 'سن اے کاتب' حسین الحق کا 'گمشدہ استعارہ'، پیغام آفاقی کا 'شکاری اور شکار کا منظر' انجم عثمانی کا 'ایک ہاتھ کا آدمی' ابن کنول کا افسانہ 'ہمارا تمھارا خدا بادشاہ' مظہر الزماں کا 'پہلے دن کی تلاش' الیاس احمد گدی کا افسانہ 'ٹام جیفرسن کے پنجرے' طارق چھتاری کا 'باغ کا دروازہ' اور مشرف عالم ذوقی کا 'دابۃ الارض' کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ طوالت کے خوف سے ان کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے۔

اردو ادبیات اور ناول کا سیاق وسباق، قدیم ثقافتی رنگ وآہنگ اور اساطیری توجیہات سے بے نیاز اور ماورا نہیں۔ بیانیہ میں اساطیر کے توضیحی اشارے بخوبی سما جاتے ہیں۔ دیومالائی نظام کی نادیدہ کائنات اور اسطوری معنویت کو ہر دور میں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ خواتین فکشن نگاروں کی نسائی حسیت (Feminism) نے مرد اساس سماج میں عورت کے مسائل اور اس کی زندگی کی الجھنوں کی موثر تصویر کشی کی ہے۔ قرۃ العین کا ناول 'سیتا ہرن' تو تمام تر دیومالائی رنگ میں ڈوبا ہوا ہے اور خود نام سے بھی اس کا اندازہ ہوتا ہے۔ قرۃ العین حیدر کا سیتا ہرن، خدیجہ مستور کا ناول 'آنگن' اور جیلانی بانو کے ایوان غزل کی مثال دی جاسکتی ہے۔ تہذیبی زندگی کی عائد کردہ پابندیوں اور عورت کے جذباتی تموج اور تلاطم کی بڑی حقیقت پسندانہ مرقع کشی کی گئی ہے۔ مختلف زبانوں کے ادب میں نیک کردار کے زمین میں سما جانے کے اساطیر ملتے ہیں۔ جیلانی بانو نے اپنی ہیروئن غزل کے زمین میں سما جانے کا منظر اس طرح پیش کیا ہے:

''میرے اوپر مٹی پھینکو۔ مجھے سنگسار کرو۔ مجھے مار ڈالو۔ میرے اوپر پتھر رکھ دو تم میں سے کوئی انسان ہے۔ گڑھے کے اندر سے غزل چلا رہی تھی۔'' (ایوانِ غزل، ص 345)

سریندر پرکاش نے اساطیر سے استفادہ کرتے ہوئے کہیں کہیں انھیں خلط ملط بھی کر دیا ہے اور ایک نئے اسطورہ کی معنویت خلق کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی تخلیقات میں کہیں دو مختلف دھاروں کا سنگم بنانے کا رجحان اور انھیں ایک دوسرے میں ضم کرنے کے اسلوب

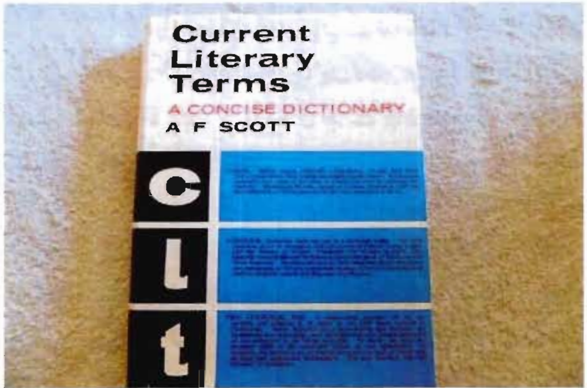

نے انفرادیت اور تازہ خیالی کم اور ایک استعجاب آمیز کیفیت زیادہ پیدا کی ہے۔ انتظار حسین نے اسلامی اساطیر کی طرف توجیہ کی اور ہندو دیومالا کے عناصر سے بھی کام لیا ہے۔ کشتی، کچھوے، پتے نرناری، برہمن،

کھانی میں اساطیری عناصر کی پذیرائی کے سلسلے میں جابر حسین کی کھانی 'سن اے کاتب' حسین الحق کا 'گمشدہ استعارہ'، پیغام آفاقی کا 'شکاری اور شکار کا منظر' انجم عثمانی کا 'ایک ھاتھ کا آدمی' ابن کنول کا افسانہ 'ھمارا تمھارا خدا بادشاہ' مظھر الزماں کا 'پھلے دن کی تلاش' الیاس احمد گدی کا افسانہ 'ٹام جیفرسن کے پنجرے' طارق چھتاری کا 'باغ کا دروازہ' اور مشرف عالم ذوقی کا 'دابة الارض' کی نشان دھی کی جاسکتی ھے۔ طوالت کے خوف سے ان کا جائزہ لینا ممکن نھیں ھے۔

بکرا، دسواں قدم اور مورنامہ میں ہندوصنمیات سرایت کر گئے ہیں اور ماضی کی بازیافت اور اعلیٰ انسانی اقدار (جن سے موجودہ دور کا انسان دور ہوتا جا رہا ہے) کے احیا کی تمنا اسطور کے پردے سے جھانکتی نظر آتی ہے۔

بیدی، انتظار حسین اور سریندر پرکاش وغیرہ نے اسطورہ کی معنوی گہرائی سے کام لے کر ایک نئی جہت کو روشناس کیا ہے اور ایک نئے پیرایہ ابلاغ کو فروغ دیا ہے۔

قدیم انگریزی ادب میں فرانس بیکن (1526-1561) نے اساطیر کو ادب کے لیے نقصان رساں قرار دیا تھا اس کا خیال تھا کہ توہم پرستی اور رجعت پسندی ادب کو موجودہ منظرنامے سے بیگانہ بنا دیتی ہے۔ اس نے کہا تھا:

"Made a declaration of independence to emancipate science from the shakles of Mythology." (A Short History of Myth- Kern Amstrong- Page 112)

اس طرح چارلس ڈارون اور نٹشے وغیرہ بھی اساطیر سے ناخوش تھے لیکن رفتہ رفتہ ادب میں اساطیر کی رمزی اور ایمائی قوت کو محسوس کیا جانے لگا اور انھیں قبول کرنے پر زور دیا جانے لگا۔ اس کو نقاد، انیسویں صدی میں اساطیر کے خلاف بعض دانشمندوں کے اظہار خیال اور انھیں ادا کرنے کی سفارش کا ردعمل سمجھتے ہیں۔

اس تصور کے تحت اساطیر سے دلچسپی فنکار کو عصری حسیت وقتی مسائل اور گرد و پیش کی دنیا سے دور کر دیتی ہے بعد میں اس تصور کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ اساطیری پیکروں کا احساس اور ان کے جمالیاتی سحر نے بڑے فنکاروں کو فکر ونظر کا سرمایہ مہیا کیا ہے اور ان کی سائیکی میں جذب ہو کر خوبصورت پھول کھلائے ہیں۔ فنکار کے لاشعور میں اساطیر کا تحرک موجود ہوتا ہے۔ نمو یافتہ اور غیر نمو یافتہ شکل میں۔

جی سی یونگ (1875-1961) سائیکی میں اساطیر کی موجودگی کا معترف ہے اور سگمنڈ فرائڈ جنس کا رشتہ اساطیر سے جوڑنا چاہتا ہے۔ اساطیری کرداروں اور نادرالوجود ہستیوں اور فقیدالمثال واقعات میں وردرس Raudrasa سے ویررس Vir Rasa کروں رس Karun Rasa او شانت رس Shant Rasa کا امتزاج تعجب خیز ہی نہیں جمالیاتی انبساط Aesthetic Pleasure کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ ہندوستانی دیومالا کو چار شقوں میں تقسیم کیا گیا ہے (1) ویدک میتھالوجی Vedic Mythology (2) بدھسٹ میتھالوجی (3) انڈین میتھالوجی اور (9) ہندو میتھالوجی۔ ہندو میتھالوجی سے زیادہ تر فنکاروں نے روشنی حاصل کی ہے۔ William Blake نے اپنی نظموں کو اساطیری عناصر کی آب وتاب سے چمکایا ہے کیا اقبال کے 'جاوید نامہ' میں دیومالائی کردار نہیں ہیں۔ وہ شیو جی کے بارے میں کہتے ہیں:

موئے برسر بستہ و عریاں بدن
گرد او مارے سفیدے حلقہ زن

اساطیر نے ادب کو وسعت، جامعیت، ایجاز و ارتکاز معنیٰ آفرینی اور ماضی کے سرمائے سے مستفید ہونے کا سلیقہ سکھایا ہے۔

■

Prof. Syeda Jaffer9-1-24/1, Langer House, Hyderabad - 500008 (AP) INDIA

منظر اعجاز

ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تیسرا اجلاس

ایک تجزیہ

پروفیسر محمد حسن نے غزل کی آب و ہوا ہی نہیں، پوری فضا ہی سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اس کے باوجود وہ شعرِ غزل کے دو مصرعوں کے ارتکاز و ایجاز سے نہ صرف متاثر ہوئے بلکہ اسے نظموں میں بروئے کار لانے کی صلاح بھی دی اور خود اسے اپنے فن میں برتنے کی کوشش بھی کی جس کے نتیجے میں ان کی نظمیں ایجاز و اختصار کا نمونہ بن گئیں۔ لیکن زیرِ تجزیہ نظم کا اختصاص یہ ہے کہ باعتبار ہیئت یہ معرا نظم ہے اور بہ لحاظ فن مکالماتی اور اس کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ یہ ان کی نظموں میں غالباً سب سے طویل نظم ہے۔ میرے نزدیک اس کی کشش انگیزی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ 27 اگست 1989 کو خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ کے مہمان خانے میں تخلیق پذیر ہوئی۔ پٹنے میں ان کے قیام کا یہ کون سا موقع تھا، فی الحال اس سلسلے میں کچھ کہنے سے میں قاصر ہوں۔ البتہ مذکورہ لائبریری میں 'تیسری اردو ریسرچ کانگریس 22-24 جنوری 1989 منعقد ہوئی تھی۔ اس کانگریس میں ڈاکٹر حسن نے شرکت کی تھی اور اردو میں دانشوری کی روایت کے عنوان سے ایک مختصر سا مقالہ پیش کیا تھا۔ یہ مقالہ خدا بخش جرنل کے شمارہ 62-57 جنوری تا جون 1991 میں شامل ہے۔ صرف دو صفحات (ص 11، 12) پر مشتمل ہے۔

خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری نے 'اردو میں دانشوری' کے عنوان سے 1995 میں ایک کتاب شائع کی۔ ٹائٹل کور پر عنوان کے نیچے ایک سطری وضاحتی جملہ یہ ہے:

''خدا بخش دانشوری سیمینار منعقدہ 1986 کے مقالات، روداد، بحثیں اور نمونے۔''

اس کتاب میں ڈاکٹر محمد حسن کے دو مقالات درج ذیل صورت میں درج ہیں:

- اردو ادب میں دانشوری کی روایت (1)
- اردو ادب میں دانشوری کی روایت (2)

جنوری تا جون 1991 جو دو صفحے کا مقالہ ہے، وہ اس کتاب میں دوسرے نمبر پر ہے۔ اس سے یہ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ خدا بخش دانشوری سیمینار کا انعقاد، پہلی اردو ریسرچ کانگریس کے طور پر 1986 میں ہوا تھا۔ جب کہ تیسری اردو ریسرچ کانگریس 22 تا 24 جنوری 1989 کو منعقد ہوئی تھی۔ اس ریسرچ کانگریس کا سلسلہ آگے بھی چلتا رہا اور تقریبات منعقد ہوتی رہیں۔ اسی سلسلے میں اگست 1989 کے آخری ہفتے میں ڈاکٹر محمد حسن پٹنہ تشریف

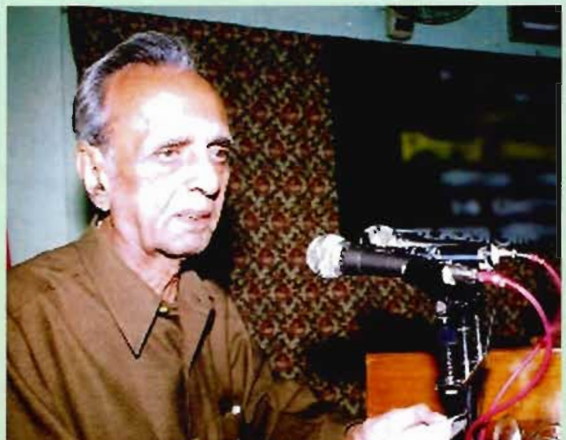

لائے ہوں گے اور خدا بخش لائبریری کے مہمان خانے میں قیام فرمایا ہوگا۔ زیرِ تجزیہ نظم اسی سفر کی یادگار ہے۔ میرے خیال میں اس نظم کا اصل محرک تیسری اردو ریسرچ کانگریس کا تاثر ہے جس کی کیفیت منفی رہی ہوگی چنانچہ اسے انھوں نے 'ابلیس کی مجلس شوریٰ کا تیسرا اجلاس' قرار دیا۔ میرے اس قیاس کی بنیاد ان کے مذکورہ مقالات ہیں جن میں انھوں نے اردو میں دانشوری کے وجود سے تقریباً انکار ہی کیا ہے۔

زیرِ تجزیہ نظم جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، مکالماتی ہے۔ اس کے تین کردار ہیں جو منظر نامے پر ابھرتے ہیں۔ ایک تو اس مجلس شوریٰ کا سرگروہ یا سردار ہے جسے ابلیس قرار دیا گیا ہے اور دو اس ابلیس کے مرید ہیں۔ اس نظم کے عنوان پر نظر پڑتے ہی معاً ذہن اقبال کی بعض نظموں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن یہاں اقبال کی نظموں سے محمد حسن کی زیرِ تجزیہ نظم کا موازنہ مقصود نہیں۔ البتہ یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ نیکی و بدی، خیر و شر، اچھائی اور برائی یا روشنی اور تاریکی کی ستیزہ کاری ازل ہی سے جاری وساری ہے جسے مختلف زبانوں میں شعر و ادب کا موضوع بنایا جاتا رہا ہے اس لیے مختلف زبانوں کے ادب میں اس کے آیات و آثار ملتے ہیں۔ اس موضوع کے فنی برتاؤ میں فنکاروں نے کبھی اس کے داخلی پہلو کو ابھارا ہے اور کبھی خارجی پہلو کو۔ اقبال کی جبریل و ابلیس میں تو براہِ راست نیکی و بدی کی ترجمانی کرنے والے دو کردار دکھائی دیتے ہیں۔ یہ ماورائی اور تصوراتی کردار داخلی پہلو کے حامل ہیں لیکن اقبال نے تو تاریخی حوالے سے انھیں خارجی پیکر بھی عطا کرنے کی کوشش کی ہے:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

لیکن Stevension نے اس موضوع کو داخلی اور نفسیاتی تناظر میں 'ڈاکٹر جیکل اور مسٹر ہائیڈ' کے عنوان سے برتنے کی کوشش کی ہے۔ محمد حسن کی زیرِ نظر نظم میں ایسے مثبت اور منفی کردار نہیں۔ مجلس شوریٰ میں جو تین کردار ہیں، وہ سب ایک ہی قبیل و قماش کے ہیں۔ ان میں پہلا تو مجلس کا سرگروہ یا سردار ہے اور دو دوسرے کردار اس کے مرید یا پیروکار ہیں۔ لیکن اس تیسرے اجلاس میں ابلیس جس مہم جویانہ اقدام کے سلسلے میں اپنے مریدوں کو ہدایتیں دیتا ہے، وہ نیکی یا خیر کو نیست و نابود کرنے کی ہیں۔ نظم ابلیس کے مکالمے سے شروع ہوتی ہے جس میں وہ زوال پذیر انسانیت کی زبوں حالی کا خاکہ فاتحانہ طمانیت کے ساتھ پیش کرتا ہے:

شکر ہے اے اہرمن زادو کہ اب آفاق پر

یورشیں پیغمبروں کی خاتمے پر آگئیں
اب فقط بھولی روایت بن گئے عیسیٰ مسیح
اب پرانی ظلمتیں انسانیت پر چھا گئیں
کون پڑھ سکتا ہے گیتا کون سمجھے گا قرآن
ان سبھی کی کنجیاں اب ہاتھ اپنے آگئیں
سب صحیفوں کو بھلا بیٹھی ہیں اب انسانیت
ان کی تعلیمات کی ساری لویں کجلا گئیں

یعنی کہ ابلیس اپنے مریدوں یا شیطان کی اولادوں کو خوش خبری دیتا ہے کہ دورِ جہالت کی ظلمتیں انسانیت پر چھائی ہوئی ہیں اور باقی باتیں اس کے بنیادی سبب کی تفصیلات پر مشتمل ہیں یعنی گیتا اور قرآن آسمانی صحیفوں اور پیغمبران مذاہب کی تحریکات و تعلیمات کے اثرات اپنی اثر پذیری کھو چکے ہیں۔ اس دورِ ظلمت میں کوئی گیتا یا قرآن کا پڑھنے والا نہیں رہا، نہ ان کی تعلیمات کسی کی فہم و فراست میں آنے والی رہیں۔ کیوں کہ معلمین مذاہب جو ان کے محافظ اور ذمے دار تھے، انھوں نے اس خزانے کی کنجیاں مجھے سونپ دی ہیں۔ اب انسانیت کو منور کرنے والی پیغمبروں کی تعلیمات کی ساری شمعیں اور ان کی ساری لویں کجلائی ہوئی ہیں۔

مریدوں کے لیے یہ اطلاع کسی معجزے سے کم نہیں چنانچہ ان کا ذوقِ تجسس انھیں مہمیز کرتا ہے۔ وہ ہر چند کہ اپنے پیر یعنی ابلیس کی آگہی بردار بصیرت اور فہم و فراست کے قائل ہیں تاہم اپنے متجسسانہ جذبے کی تسکین کے لیے وہ اس کی تفصیل جاننے کے آرزومند ہوتے ہیں۔

چنانچہ پہلا مرید اسی جذبے کے تحت گویا ہوتا ہے:

اے کہ ہے تیری فراست پردہ دار آگہی
معجزہ کیوں کر ہوا کس طرح اتری یہ وحی

مرید کے استفہامیہ لہجے میں جو مسرت آمیز حیرت و استعجاب کے عناصر ہیں، انھیں نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ ابلیس بھی مرید کی متجسسانہ کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے جس انداز و اسلوب میں صورتِ حال پر روشنی ڈالتا ہے،

اس دور ظلمت میں کوئی گیتا یا قرآن کا پڑھنے والا نہیں رہا، نہ ان کی تعلیمات کسی کی فہم و فراست میں آنے والی رہیں۔ کیوں کہ معلمین مذاہب جو ان کے محافظ اور ذمے دار تھے، انہوں نے اس خزانے کی کنجیاں مجھے سونپ دی ہیں۔ اب انسانیت کو منور کرنے والی پیغمبروں کی تعلیمات کی ساری شمعیں اور ان کی ساری لویں کجلائی ہوئی ہیں۔

اس سے شاعر کی آگہی بردار بصیرت اور فہم و فراست کے آیات و آثار روشن ہیں لیکن اس مرحلے میں اقبال کے اقوال و اشعار کی طرف ذہن منتقل ضرور ہوتا ہے۔ یعنی:

تصوف تکلم شریعت کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

یا

جلوتیانِ مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق
خلوتیانِ میکدہ کم طلب و تہی کدو

لیکن محمد حسن کے اسلوب و لہجے میں تلخی و ترشی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی ہے۔ دراصل یہ تلخ حقیقت بھی ہے جو ابلیس کی زبانی معرضِ بیان میں آئی ہے۔ ابلیس جواب دیتا ہے:

آہ اے نادان تو واقف نہیں اس راز سے
اب کلیسا ہو کہ مسجد، خانقہ یا دیر ہو
اپنی جولانگاہ ہیں، اپنے ہیں سب ملّا مرید
اپنے ہیں یہ پادری، پنڈت، یہ عالم، یہ امام
لکھ رہے ہیں حکم پر میرے یہ تفسیریں تمام
نام لیتے ہیں خدا کا کر رہے ہیں میرا کام

اسی تسلسل میں تفصیلات آگے آتی ہیں اور یہ تفصیلات آخری شعر کے اجمال کی ہیں۔ ان تفصیلات میں ابلیس اپنی کارستانیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال کی خبر دیتا ہے یعنی اس نے اپنے انتقامی جذبے کے زیر اثر اقدام و عمل میں کامیابی حاصل کی۔ اس لیے اس کا لہجہ پرجوش اور انداز فاتحانہ ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ ہر جگہ قتلِ عام کا سلسلہ جاری ہے۔ بندگانِ حق کو پھانسی کی سزا دی جارہی ہے۔ میں نے جس کے آگے سجدے سے انکار کردیا تھا، اس عزت مآب انسان کی آج یہ حالت ہے کہ وہ ہر گلی کوچے میں رسوا ہورہا ہے (اور چونکہ ملا، پنڈت، پادری اور امام میرے زرخرید غلام ہیں) اس لیے خدا کے کلام کی خرید و فروخت کا میرا کام مزے میں چل رہا ہے۔ وہ سب میرے حکم کے بندے ہیں اور میرے حکم کے مطابق کلامِ الٰہی کی تفسیریں لکھ رہے ہیں۔ مذہب کی تعبیریں پیش کررہے ہیں۔ اس لیے میرے تو پو بارہ ہیں۔ رات کے اندھیرے میں میرا کالا دھندہ خوب پھول پھل رہا ہے۔ چنانچہ اس خوشی کے موقعے پر جشن اور بادہ گساری کا اہتمام ہونا چاہیے:

نام پر تاریکیوں کے ہم نوا اک اور جام!

لیکن دوسرا مرید جو ذرا زیادہ دوراندیش معلوم ہوتا ہے، جوش میں آکر ہاں میں ہاں نہیں ملاتا۔ وہ اس اندیشے کا اظہار کرتا ہے کہ یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ دورِ حاضر کے صحیفے گیتا اور قرآن نہیں ہیں بلکہ شاعروں کے اقوال و اشعار ہیں جن سے زمانہ کے بدلے ہوئے طور اور تیور کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ وہ دور ہے جس میں ہر قلم نیزہ بن گیا ہے اور ہر لفظ انمول ہوگیا ہے جن میں عوام پر اثرات مرتب کرنے کی گیتا اور قرآن سے زیادہ قوت و صلاحیت ہے۔ اگر قلم ٹوٹ بھی جائے تو اس سے روشنی کی ایسی بارش ہوگی کہ تاریکیاں پھیلانے کی ساری کوششیں ملیامیٹ ہوجائیں گی۔ اسی اندیشے کے پیش نظر دوسرا مرید مشورہ دیتا ہے:

ایسی کچھ تدبیر کیجے سچ کوئی لکھنے نہ پائے
فکر یوں شل ہو کوئی حرفِ نوی لکھنے نہ پائے

یا قلم کو چھین لیں یا کاٹ ڈالیں سب کے ہاتھ
یا زبانیں کھینچ لیں ان سب کی بیدردی کے ساتھ

ظاہر ہے کہ ابلیس اپنے مریدوں کا پیر ہے، اپنے ارادت مندوں کے حلقے کا سردار ہے جس کی اپنی ایک حیثیت ہے، ایک شان ہے، اس لیے وہ مرید کے مشورے کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتا یہاں تک کہ اس کے مشورے کو بے خبری پر محمول کرتے ہوئے استہزائیہ اور طنزیہ انداز میں اسے مخاطب کرتا ہے:

انتظام اس کا ہوا کب کا ہوا اے بے خبر
اب یہ سب پیغامبر ہیں بندگان اہل زر
آج ہیں ان سب کے دیواں سب صحیفے بے اثر

اور بغیر کسی توقف کے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے ایک شاعر کے ماضی و حال کا ذکر کرتا ہے:

ایک شاعر تھا جو کل گاتا تھا مزدوروں کے گیت
مفلسوں کی بات کرتا تھا وہ زرداروں کے بیچ
کرتا تھا اعلانِ حق دار و رسن والوں کے بیچ
اس کو نشہ تھا بہت محنت کشوں کی جیت کا
ہم نے لاکھوں میں کیا ہے مول اک اک گیت کا
کھینچ لی ہے غیرت فن اس کے اک اک روم سے

ابلیس اسی تسلسل میں ایک دوسرے شاعر کا بھی ذکر کرتا ہے اور یہ ذکر کیا ہے، حالِ زار ہے جیسا کہ درج ذیل اشعار سے واضح ہے:

ایک شاعر و ادیب ہی کا طبقہ ایسا تھا جو اس لعنت سے پاک اور پیغمبرانِ دین حق جیسا ایثار پسند اور بیباک تھا اور اپنے کلام سے مستحصلوں کا لہو گرماتا تھا اور ان میں انقلابی روح بیدار کرتا تھا لیکن اب وہ بھی ابلیس کے دامِ تزویر میں آکر گم کردۂ راہ ہو گیا ہے اور ابلیسی نظام کا آلۂ کار بن گیا ہے۔

''دوسرے شاعر نے رکھے دار پر سر کے چراغ
وہ قلم کا مدح خواں وہ فکر سے روشن دماغ
آج دیکھو تو ذرا اپنے پرستاروں میں ہے
دیوِ استبداد کے ادنیٰ گرفتاروں میں ہے

ابلیس اس کے بعد ایک اور شاعر کا ذکر کرتا ہے، جو انسان دوست اور انسانیت کا نغمہ سرا تھا۔ نگہبانِ ایمان اور ضمیرِ عصر کا محافظ تھا:

اس کو اب پنجڑے میں
سونے کے مقید کردیا
ہم نے سیم وزر سے اس کی
چھولیوں کو بھر دیا

محمد حسن نظموں میں ڈرامائیت کے قائل ہی نہیں رہے ہیں بلکہ اسے لازمی عنصر قرار دیا ہے اور انھوں نے منظوم ڈراما بھی لکھا ہے جو خیام سے متعلق اور 'زنجیر نغمہ' میں شامل ہے۔ زیرِ نظر نظم بھی ڈرامائی کیفیات کی حامل ہے جس میں ابلیس اور اس کے دو مرید تو منظرنامے پر نظر آتے ہیں۔ ان کے مکالموں سے ان کی فتنہ پردازی اور شرپسندی واضح ہے۔ یہ سب سرمایہ دارانہ نظام کی حکمتِ عملی طے کرنے، اسے بروئے کار لانے اور استحکام بخشنے والے انسانی سماج کے عفریت ہیں جو غریبوں، مزدوروں اور کمزوروں کا خون چوسنے والے ہیں۔ انھوں نے تو ملا، پنڈت، پادری، امام سب کو بہت پہلے ہی سے اپنے دامِ تزویر میں پھانس کر رکھا ہوا ہے۔ یہ سب جوعِ زر میں مبتلا ہو کر ابلیسی نظام کے کارندے بن چکے ہیں اور مذاہب کی روح کو مجروح کر کے بھولے بھالے عوام کو گمراہ کرتے رہے ہیں اور انھیں ابلیسی نظام کے شکنجے میں کستے رہے ہیں۔ ایک شاعر و ادیب ہی کا طبقہ ایسا تھا جو اس لعنت سے پاک اور پیغمبرانِ دینِ حق جیسا ایثار پسند اور بیباک تھا اور اپنے کلام سے مستحصلوں کا لہو گرماتا تھا اور ان میں انقلابی روح بیدار کرتا تھا لیکن اب وہ بھی ابلیس کے دامِ تزویر میں آکر گم کردۂ راہ ہو گیا ہے اور ابلیسی نظام کا آلۂ کار بن گیا ہے۔

ابلیس نے جن تین شاعروں کا ذکر کیا ہے وہ منظرنامے پر نہیں، پس منظر میں ہیں ان کی سیرت تو ابلیس کے تذکرے سے ظاہر ہوتی ہے لیکن صورت ظاہر نہیں ہوتی۔ جب کہ ابلیس اور اس کے دو مریدوں سے زیادہ یہ تین شاعر قاری کی متجسسانہ تشنگی کو شدید تر کر دیتے ہیں۔ شاعروں کا اپنے ضمیر اور اپنے ایمان کو چند سکۂ رائج الوقت کے عوض رہن رکھ دینا یا فروخت کر دینا عصرِ جدید کا ایک بڑا سانحہ اور ایک عظیم المیہ ہے اور میرے خیال میں یہی سانحہ، یہی المیہ محمد حسن کی اس نظم کا اصل محرک ہے۔ اسی سانحے اور المیے کے ساتھ نظم کا اختتام ہوتا ہے لیکن یہ اختتام قاری کے ذہن میں یہ سوال نقش کر جاتا ہے کہ ''کون معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں۔''

پروفیسر محمد حسن کے نقطۂ نظر سے بھی متعلق ایک اہم بات سامنے آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ محمد حسن ترقی پسند تھے۔ ان کا تنقیدی شعور اور تخلیقی وجدان مارکسی اشتراکیت کے زیرِ اثر تھا جسے بالعموم لادین اشتراکیت سے تعبیر کیا جاتا ہے کیوں کہ اس نے مذہب کو افیون قرار دیا تھا حالانکہ وہ خود لامذہب نہیں تھا۔ جہاں تک محمد حسن کا تعلق ہے، ان کی زندگی بھلے ہی مومنانہ طور سے نہ گزری ہو لیکن ان کا دل مومن ضرور تھا۔ انھوں نے بڑی جرأت مندی اور بیباکی سے ہم عصر اشتراکی یا ترقی پسند شاعروں پر تنقیدیں کی ہیں۔ علمائے دین و مذہب کی تنقید میں تو ان کا میلان اقبال کے زیرِ اثر دکھائی دیتا ہے لیکن زیرِ تجزیہ نظم میں انھوں نے اپنے ہم عصر اور ہم مشرب شعرا پر جس انداز و اسلوب میں تنقید کی ہے، وہ انھیں اقبال سے ممتاز کرتا ہے۔

■

Dr. Manzar Aijaz, Head, P G Deptt of Urdu
A N College, Patna - 800013 (Bihar)

سرسید کی تاریخ نگاری

محمد معظم الدین

سرسید احمد خاں محض ایک شخصیت کا نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے۔ اس تحریک کے مختلف النوع پہلو تھے۔ سرسید بذاتِ خود کئی حیثیتوں سے نہ صرف انیسویں صدی کے پورے منظرنامے پر چھائے رہے بلکہ آج کے دور میں بھی مختلف شعبہ ہائے زندگی میں ان کے اثرات نمایاں ہیں۔ سیاست، ادب، مذہب، تعلیم اور دیگر علوم وفنون میں ان کے قدم اجتہادی تھے۔ سرسید پہلے شخص ہیں جنھوں نے فکر وادب میں آزادیِ رائے اور آزادیِ خیال پر زور دیا اور ایک ایسے مکتبِ فکر کی بنیاد رکھی جس میں عقل، نیچر، تہذیب اور مادی ترقی کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے تمام علمی سرمایے میں انھیں عناصر کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

ریاضی اور تصوف کی طرح تاریخ نگاری کا ذوق بھی انھیں وراثت میں ملا تھا۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ ''ان کے اسلاف قلعۂ معلّٰی سے وابستہ تھے اور اس سبب سے درباری مذاق کی اکثر چیزوں سے ان کا لگاؤ خاندانی روایات کے زیر اثر تھا''[1] اس کے علاوہ بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی کی تصنیفی سرگرمیوں سے واقفیت نے بھی ان کے اندر تاریخی تحقیق و تدقیق کا ذوق پیدا کیا۔ اسی دوران آگرہ کالج کے، جو اس زمانے میں ایک پُر وقار علمی مرکز تھا، چند ہونہار طالب علموں نے فارسی زبان میں آگرہ کی عمارتوں پر مفید اور پُراز معلومات رسالے مرتب کیے تھے۔ نیز انگریز مصنّفین کی بھی کئی کتابیں وجود میں آچکی تھیں۔ سرسید ان سب کتابوں سے براہِ راست متاثر ہوئے اور اپنے تاریخی ذوق کو جلا دینے کے بعد کئی اہم تاریخی کتابیں تصنیف کیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں ہندوستان کی تاریخ سے سب سے زیادہ دل چسپی تھی نیز ان کا ذہن اور تخلیقی صلاحیتیں تاریخ کے لیے بہت موزوں تھیں۔ سرسید ماضی سے مستقبل کو سنوارنے کا کام لینا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ قوم نہایت بدنصیب ہے جو اپنے بزرگوں کے قابلِ یادگار کارناموں کو بھلا دے یا ان سے بے خبر رہے۔ اسی طرح کا اظہارِ خیال ایک جگہ اور کیا ہے کہ کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے غیرتی نہیں کہ وہ اپنی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھو دے۔

سرسید سے پہلے اردو میں تاریخ نویسی کا آغاز ہو چکا تھا۔ کئی ایک کتابیں فورٹ ولیم کالج کے قیام سے قبل لکھی جا چکی تھیں نیز اس کالج میں فارسی زبان میں لکھی گئی کئی اہم کتابوں کے ترجمے اردو زبان میں ہو چکے تھے لیکن

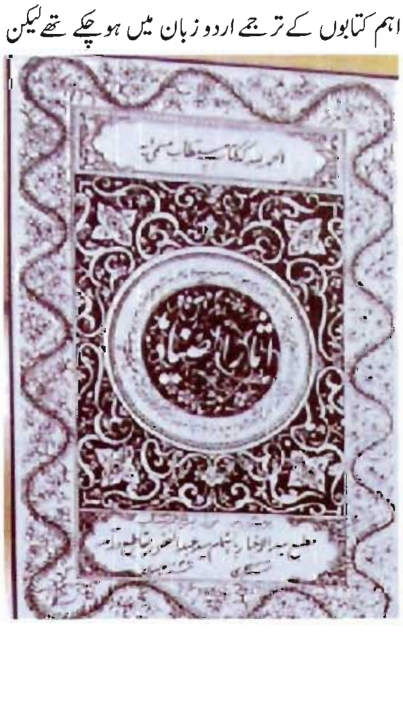

اردو تاریخ نگاری کا خالص تصنیفی رجحان نہیں تھا۔ اس سلسلے میں پہل سرسید نے کی۔

تاریخ سے دل چسپی کے علاوہ انھیں اس بات کا شدید احساس بھی تھا کہ ہندوستان کا تہذیبی ورثہ اور اس کی صالح قدروں کا محفوظ رکھا جانا اشد ضروری ہے۔ لہٰذا انھوں نے آئینِ اکبری، تاریخ فیروز شاہی اور تزکِ جہاں گیری کی ترتیب و تدوین کے علاوہ بقلمِ خود کئی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ اس سلسلے میں ان کی ابتدائی کاوش 'جامِ جم' ہے۔ یہ کتاب آگرہ میں دورانِ ملازمت فارسی زبان میں 1839 میں لکھی گئی۔ یہ ایک مختصر رسالے کی شکل میں ہے جس میں امیر تیمور صاحب قراں سے لے کر ابوظفر بہادر شاہ تک تقریباً 43 بادشاہوں کا مختصراً ذکر ہے۔ ان کی ایک اور کتاب 'سلسلۃ الملوک' ہے۔ اس کا شمار تالیفات میں ہوتا ہے۔ 69 صفحات پر مشتمل یہ کتاب مطبع شرف المطابع دہلی سے 1852 میں شائع ہوئی۔ اس میں دہلی کے 203 بادشاہوں یعنی راجا جدھشتر سے ملکۂ وکٹوریہ تک (تقریباً پانچ ہزار سال) کا حال نقشہ اور جدول کی صورت میں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بارے میں معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں۔ پہلے یہ نقشہ آثار الصنادید کے دوسرے ایڈیشن کے باب اوّل میں شامل تھا۔

آثار الصنادید سرسید کی سب سے اہم تاریخی تصنیف ہے جس کی وجہ سے ان کا شمار مورخین کے زمرے میں ہوتا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن 1847 میں اور دوسرا 1854 میں شائع ہوا۔ سرسید نے اس میں اپنی تحقیقی صلاحیت کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ پہلے ایڈیشن کا اسلوب

بیان پرتکلف ہے۔ لیکن دوسری اشاعت میں آسان اور سلیس زبان استعمال کی گئی ہے۔ یہ 19ویں صدی میں شہر دہلی کے موضوع پر لکھی گئی بہترین کتاب ہے۔ اس کی اہمیت اور افادیت کے پیش نظر گارساں دتاسی نے اس کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا۔ بعدازاں یورپ کی دوسری زبانوں میں بھی اس کے ترجمے ہوئے۔ اسی کتاب کی بنا پر ''رائل ایشیاٹک سوسائٹی انگلینڈ'' نے 1864 میں سرسید کو اعزازی ممبرشپ عطا کر کے اپنے لیے سامانِ وقار فراہم کیا۔ اس میں جزئیات کی فراہمی اور اس کی فن کارانہ ترتیب سرسید کی تحقیق وجستجو اور فنّی صلاحیت کے اعتراف کے لیے کافی ہے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے تین ابواب میں دہلی اور گردونواح کی عمارتوں یعنی حویلیوں، مسجدوں، مندروں، بازاروں، باولیوں کنوؤں وغیرہ کے حالات ،ان کے نقشے، تصویریں، کتبے، دہلی کے پرانے شہروں، قلعوں، محلوں کی تفصیلات درج ہیں۔ چوتھا باب دلّی اور دلّی کے لوگوں کے بیان کے لیے وقف ہے۔ دراصل اس میں دہلی کے 118 مشاہیر مثلاً مشائخ، علما، فقرا، مجاذیب، اطبا، قرّا، شعرا، خوش نویس، مصور، موسیقی داں وغیرہ کا مختصر مگر جامع تذکرہ موجود ہے۔ ایک لحاظ سے یہ بڑا قیمتی سرمایہ ہے اور شاید دہلی کے تہذیب وتمدن کی آخری بہار سے اس کتاب کو کبھی خزاں نصیب نہ ہو۔

بجنور کے زمانۂ قیام میں سرسید نے محکمہ کے زیرہدایت اس ضلع کی تاریخ 'تاریخ ضلع بجنور' کے نام سے قلم بند کی تھی لیکن 1857 کے رستاخیز حالات کے سبب یہ کتاب محفوظ نہ رہ سکی۔ 'تاریخ سرکشی بجنور'، سرسید کی ایک اور اہم تاریخی کتاب ہے۔ اس میں بجنور میں زمانۂ غدر میں رونما ہونے والے واقعات کا بیان ہے۔ سرسید نے بجنور کے زمانۂ قیام میں ہی غدر کے واقعات کو جمع کرنا شروع کر دیا تھا۔ مراد آباد آکر انھوں نے اسے ترتیب دے کر شائع کرایا۔ اس میں مئی 1857 سے اپریل 1858 تک کے واقعات شامل کیے گئے ہیں۔

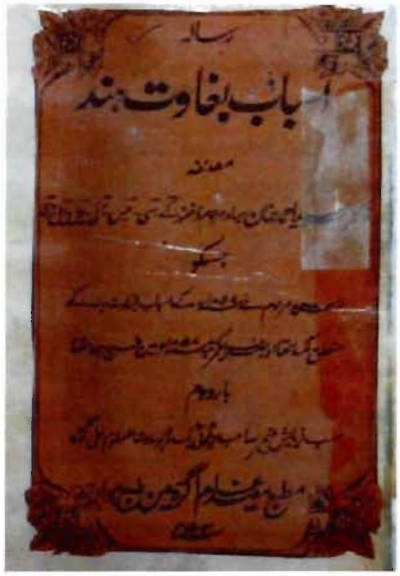

'اسبابِ بغاوتِ ہند' (مطبوعہ 1858/1859) انتہائی پرآشوب دور میں لکھی گئی سرسید کی اہم تاریخی تصنیف ہے۔ اس میں 1857 میں پیدا شدہ شورش کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے اور ان الزامات کی مدلّل طریقے سے تردید کی گئی ہے جو حکومتِ وقت کی طرف سے ہندوستانی عوام بالخصوص مسلمانوں پر لگائے گئے تھے۔ سرسید نے بڑے مدبرانہ انداز میں انگریزی حکومت کی سیاسی، انتظامی اور مذہبی پالیسیوں پر کھل کر بحث کی ہے اور انھیں سخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ سرسید کے باغیانہ تیور کو دیکھتے ہوئے ان کے دوست راجا جے کشن داس نے اسے جلا دینے کا مشورہ دیا تھا تاکہ انگریزوں کی باز پرس اور سرزنش سے بچا جاسکے۔ لیکن سرسید کے آہنی ارادوں کے سامنے یہ مشورہ کام نہ آیا۔ بقول حامد حسن قادری ''یہ بھی سرسید کی ملکی خیر خواہی، قومی محبت اور اخلاقی جراءت کی یادگار ہے۔''[2] اس کتاب میں واقعہ اور بیانیہ نگاری کے اچھے نمونے موجود ہیں۔ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سرسید جزئیات اور تفصیلات کو جمع کرنے اور انھیں ترتیب دینے کے فن سے بہ خوبی واقف تھے۔

'خطبات احمدیہ' کی تالیف کے دوران انھیں حکومت برطانیہ کا خوف متزلزل نہ کرسکا۔ عقیدت اور جذبۂ اطاعت سے خطبات احمدیہ ان کی سبھی تصانیف میں بلند ترین مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کا تحقیقی معیار کسی طرح کم تر نہیں ہے۔ جدید زمانے میں باقاعدہ طور پر سر سید نے سیرت نگاری کے اصولوں اور مبادیات پر ہمدردانہ اور مورخانہ نظر ڈالی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'خطبات احمدیہ' ایک سچّے عاشق رسول کا والہانہ اظہار عقیدت ہے جو خالص اسلامی جذبے اور عقیدت کے تحت لکھی گئی ہے۔

'خطباتِ احمدیہ' 1870 بھی سرسید کی ایک اہم تصنیف ہے۔ اسے کلیتاً نہ سہی جزوی طور پر ہی تاریخ کے زمرے میں شامل کرسکتے ہیں۔ دراصل اس میں ان الزامات کی انتہائی شائستہ اور مدلّل انداز میں تردید کی گئی ہے جو سرولیم میور نے 'لائف آف محمدؐ' میں، جو چار جلدوں میں ہے، آنحضرتؐ پر لگائے تھے۔ پوری کتاب بارہ ابواب پر مشتمل ہے اور بارھویں باب میں آنحضرتؐ کی زندگی کے ابتدائی بارہ سال کی تاریخ کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں آپؐ کی انسانیت اور اخلاقِ حسنہ پر بالخصوص روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ کتاب انگلستان کے دورانِ قیام لکھی گئی ہے اور تحقیق وجستجو کا اعلا نمونہ ہے۔ مولانا حالی ایک جگہ اس کے متعلق سرسید کی دلی کیفیت کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''...وہ جب کبھی اور کاموں سے فارغ ہو کر بیٹھتے تھے اکثر سرولیم کی کتاب کا ذکر کرتے تھے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہتے تھے کہ اسلام پر حملے ہو رہے ہیں اور مسلمانوں کو مطلق خبر نہیں۔''[3] دورانِ تصنیف سرسید نے اپنی دلی کیفیت اور بےچینی کا اظہار ایک خط میں اس طرح کیا ہے'' ان دنوں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ ولیم میور صاحب کی کتاب کو میں دیکھ رہا ہوں۔ اس نے دل کو جلا دیا اور اس کی نا انصافیاں دیکھ کر دل کباب ہوگیا.........اور مصمم ارادہ کیا کہ آنحضرتؐ کی سیرت میں، جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے۔ اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے..... لکھنے میں شب وروز مصروف ہوں۔ اس کے سوا اور کچھ خیال نہیں آتا۔ ملنا جلنا سب بند ہے''[4] اسی طرح 10دسمبر 1869 کو محسن الملک کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ ''میں شب وروز تحریر کتاب سیرت مصطفویؐ میں مصروف ہوں۔ سب کام چھوڑ دیا ہے لکھتے لکھتے کمر درد کرنے لگی ہے۔''[5] کتاب کی اشاعت کے لیے چندہ وصول ہونے میں تاخیر ہوگئی تو لندن سے محسن الملک کو لکھا کہ ''کتابیں اور میرا اسباب یہاں تک کہ میرے ظروفِ مسی تک فروخت کر کے ہزار روپے بھیج دو۔''[6]

غرض یہ اس کتاب کی اشاعت کے لیے سرسید کو جتنی فکر تھی شاید ہی کسی اور کتاب کے لیے رہی ہو۔ اس کے پس پشت ان کا جذبۂ ایمانی اور آنحضرتؐ کے تئیں ان کی دردمندی، عقیدت اور قلبی ارادت کے سوا کچھ اور نہیں۔

'خطباتِ احمدیہ' کی تالیف کے دوران انھیں

حکومت برطانیہ کا خوف متزلزل نہ کرسکا۔ عقیدت اور جذبۂ اطاعت سے خطبات احمدیہ ان کی سبھی تصانیف میں بلندترین مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کا تحقیقی معیار کسی طرح کم تر نہیں ہے۔ جدید زمانے میں باقاعدہ طور پر سرسید نے سیرت نگاری کے اصولوں اور مبادیات پر ہمدردانہ اور مورخانہ نظر ڈالی ہے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ 'خطبات احمدیہ' ایک سچے عاشقِ رسول کا والہانہ اظہارِ عقیدت ہے جو خالص اسلامی جذبے اور عقیدت کے تحت لکھی گئی ہے۔

انگریز مورخوں نے جس طرح مسلم حکمرانوں، اسلامی حکومتوں اور عام مسلمانوں کو اپنے طنز و تعریض کا نشانہ بنایا ہے اس کے متعلق سرسید نے اپنے کرب کا اظہار محسن الملک کے نام ایک خط میں اس طرح کیا ہے:

"اب ایک اور ضروری بات ہے جو لکھتا ہوں۔ انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں اور حکومتوں کی تاریخیں نہایت ناانصافی اور تعصب سے لکھی ہیں اور کوئی برائی نہیں جو مسلمانوں کی طرف منسوب نہ کی ہوں۔ ہماری قوم کے جوان لڑکے انگریزی میں انھیں تاریخوں کو پڑھتے اور دیکھتے ہیں جس سے نقص پیدا ہوتا ہے اور جو بات کہ از راہِ ناانصافی اور تعصب کے مسلمانوں کی نسبت لکھی گئی ہے، اس کو وہ سچ اور واقعی سمجھتے ہیں۔ اس لیے ایسی قسم کی انگریزی کتابوں کا پیدا ہونا جن میں مسلمانوں کا حال نہایت سچائی اور انصاف سے لکھا گیا ہو، نہایت مفید بلکہ نہایت ضروری ہے۔"7

سرسید کی تاریخی کتب کی فہرست سے یہ بات واضح طور پر نمایاں ہے کہ کثیر المشاغل ہونے کے باوصف انھوں نے تن تنہا اردو میں تاریخ نویسی کی نہ صرف صحت مند روایت کی داغ بیل ڈالی بلکہ اس رجحان کو کافی فروغ بھی دیا۔

سرسید ایک مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے۔ چنانچہ اس پیر میکدہ کے گرد چند ایسے باکمال اصحاب کھنچ کر چلے آئے تھے جن کے کارناموں کو سرسید کی کوششوں سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ سرسید کے بعد اردو کے تاریخی ادب میں جن حضرات نے بالخصوص اضافہ کیا ان میں مولانا شبلی اور مولوی ذکاء اللہ قابلِ ذکر ہیں۔ محسن الملک نے، جن کا کوئی مورخانہ کارنامہ تو نہیں ہے لیکن مقدمہ ابن خلدون پر ریویو لکھ کر اپنے تاریخی ذوق کا یقیناً ثبوت فراہم کیا ہے۔

سرسید کی تاریخی کتب پر کیفیت کے لحاظ سے تو بحث ہوسکتی ہے لیکن کمیت کے اعتبار سے ایسا نہیں کہ بے جا طور پر مایوسی کا اظہار کیا جائے۔ اصل چیز وہ اصول و نظریات ہیں جنھیں سرسید نے اپنی تاریخی کتب میں برتا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیفی زندگی کے ایک خاص دور میں تاریخ نگاری کی طرف توجہ کی تھی۔ بعض صلاحیتوں کی بنا پر وہ اچھے مورخ بن سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے مستقلاً تاریخ نگاری کو اپنا مشغلہ نہیں بنایا۔ تجدد پسند ذہن کی بنا پر انھوں نے عہدِ حاضر کے مسائل پر زیادہ توجہ دی تھی۔ تاریخ کے متعلق ان کا نظریہ تھا کہ "بزرگوں کے قابلِ یادگار کارناموں کو یاد رکھنا اچھا اور برا دونوں طرح کا پھل دیتا ہے"8 چنانچہ وہ تاریخ نگاری میں بھی عملی مقاصد کے متلاشی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ شبلی کو الفاروق لکھنے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اس بات کا خدشہ تھا کہ تاریخ جدید نقطۂ نظر کی تبلیغ و اشاعت میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

الخطبات الاحمدیہ

فی

العرب والسیرۃ المحمدیہ

تاریخ نگاری کے متعلق سرسید کا ایک خاص نقطۂ نظر تھا۔ تاریخ کے اسباب کا پتا لگانا، بادشاہوں کے اچھے برے کاموں کو درج کرنا، واقعات سے زیادہ معاشرت پر زور دینا وہ تاریخ نگاری کے لیے ضروری سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پرانی تاریخ کو جدید مذاق کے مطابق از سرنو مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے تاریخ نگاری کے لیے ایک خاص طرز بیان کی ضرورت کا بھی احساس دلایا۔ المامون کے دیباچے میں اس کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں "نیز ہر فن کے لیے زبان کا طرز بیان جداگانہ ہے۔ تاریخ کی کتابوں میں ناول (قصہ) اور ناول میں تاریخانہ طرز گو کیسی ہی فصاحت و بلاغت سے برتا گیا ہو، دونوں کو برباد کردیتا ہے۔"9 چنانچہ انھوں نے میکالے کی تاریخ نگاری کے شاعرانہ طرز بیان کو ناپسند کیا ہے۔ وہ تاریخ میں تخیل سے کام لینے کے سخت مخالف تھے نیز دل چسپی کے عنصر کے ساتھ ساتھ سادہ بیانی کے قائل تھے۔ واقعہ نگاری اور بیانیہ میں ان کا قلم خاصا رواں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے طلب کا دامن دور دور تک پھیلایا ہے اور واقعات و جزئیات کے انبار کو ایک لڑی میں بہتر طریقے سے پرویا ہے۔ واقعیت اور حقیقت پر نظر برابر مرکوز رکھی ہے۔ اپنے طرز بیان سے انھوں نے تاریخ نگاری کو حتی الامکان عام فہم بنانے کی کوشش کی ہے۔

المامون کے دیباچے میں سرسید نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ تاریخ میں محض واقعات نہیں بلکہ اس کے اسباب سے بھی بحث ہونی چاہیے۔ اس میں سماجی اور تہذیبی تفصیلات کے ساتھ ساتھ سیاسی، تاریخی اور علمی و ذہنی ترقیوں کا حال بھی درج ہونا چاہیے۔ سرسید تاریخ میں محض سرسری واقعہ نگاری کے قائل نہیں تھے بلکہ اس میں فلسفۂ زندگی کے متلاشی تھے اور اسے مستقبل کو سنوارنے کا بہتر ذریعہ سمجھتے تھے۔ گویا وہ تاریخ سے احیائے قومی کا کام لینا چاہتے تھے۔ ان کی نظر ماضی اور حال سے زیادہ مستقبل اور ترقی پر تھی لہٰذا بقول ڈاکٹر سید عبداللہ وہ روایات کے اس تسلسل سے بھی بے نیاز ہوگئے تھے جس سے قومی زندگی کی تعمیر میں مدد مل سکتی تھی۔ چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے اپنے مشن یعنی قومی ہمدردی اور بہی خواہی کو ہی اوّلیت دی اور قوم کی تعمیر و ترقی کے لیے تاحیات کوشاں رہے۔

حواشی

(1) سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا، ڈاکٹر سید عبداللہ
(2) مطالعہ سرسید احمد خاں- مولوی عبدالحق، ص 187
(3) سرسید احمد خاں، مطالعۂ شخصیت خطوط کی روشنی میں، ڈاکٹر محمد عزیز، مشمولہ، مطالعاتِ سرسید احمد خاں، مرتبہ طارق سعید، ص 100
(4) خطوط بنام سید مہدی علی
(5) سرسید احمد خاں، مطالعۂ شخصیت خطوط کی روشنی میں، ڈاکٹر محمد عزیز، مشمولہ، مطالعاتِ سرسید احمد خاں، مرتبہ طارق سعید، ص 101
(6) ایضاً ص 100
(7) ایضاً ص 102
(8) بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا: ڈاکٹر سید عبداللہ
(9) بحوالہ سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقا: ڈاکٹر سید عبداللہ

Dr. Moazzamuddin, Dept of Education in Languages, NCERT, Shri Auribindo Marg, New Delhi - 110016

مرزا شفیق حسین شفق

مرثیہ کی خواندگی کا فن

ممتاز حسین جونپوری نے 'خون شہیداں' میں ایک مقام پر لکھا ہے:

''الہ آباد کے مشہور شاعر لسان العصر اکبر مرحوم نے مجھ سے ایک بار خود فرمایا کہ مرثیہ اور مجالس میں شرکت اور مرثیہ خوانی سننے سے جس قدر ادب لطیف اور ذوق سلیم کی ترقی ہوتی ہے وہ اور طرح ممکن نہیں۔ اس لیے ان کی رائے تھی کہ مرثیہ خوانی کی مجالس میں وقت نکال کر ضرور شرکت کرنا چاہیے۔''

(خون شہیداں، ص 45، ممتاز حسین جونپوری، نظامی پریس لکھنؤ 1942)

ممتاز حسین کے اس بیان سے جس میں انھیں اکبر الہ آبادی مرحوم نے مجالس مرثیہ خوانی میں شرکت کی تاکید کی ہے کسی قدر مرثیہ خوانی کی مجالس کی اہمیت وافادیت واضح ہو جاتی ہے۔ مرثیہ خوانی کی اسی اہمیت وافادیت کے پیش نظر ہم اس مضمون میں مرثیہ خوانی کی اساسی و بنیادی چیز خوانندگی پر روشنی ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

جب ہم مرثیہ خوانی کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں اس کے ابتدائی خدوخال، اس فن سے قبل داستان گوئی اور شعر خوانی کی روایات میں ملتے ہیں تو آیئے پہلے داستان گوئی اور شعر خوانی کی روایات پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔ اس کے بعد فن خوانندگی پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

محمد حسین آزاد نے 'سخندان فارس' میں ایرانی داستان گویوں کے سلسلے میں تحریر کیا ہے۔

''ایران کے بازاروں میں اکثر قہوہ خانوں میں ایک شخص سروقد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق وشوق میں مست اسے گھیرے ہوئے ہے وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصع کرتا ہے اور صورت ماجرا کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماں باندھ دیتا ہے، کبھی ہتھیار بھی سجا ہوتا ہے، جنگ کے معرکے یا غصے کے موقع پر شیر کی طرح بھر کر کھڑا ہوتا ہے..... غرضیکہ غیظ وغضب، عیش وطرب یا غم والم کی تصویر فقط اپنے کلام سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اس کی تصویر بن جاتا ہے۔ اسے حقیقت میں بڑا صاحب کمال سمجھنا چاہیے کیوں کہ اکیلا آدمی ان مختلف کاموں کو پورا پورا ادا کرتا ہے جو تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہے۔''

(سخندان فارس۔ محمد حسین آزاد، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1979)

آزاد کے اس بیان سے داستان گوئی کی روایت پر واجبی حد تک روشنی پڑ جاتی ہے البتہ جہاں تک شعر خوانی کا تعلق ہے تو اس فن کے ماہرین میں سب سے پہلے جو نام ہمارے ذہن میں آتا ہے وہ میر سوز کا نام ہے۔ میر سوز کے بارے میں آزاد نے 'آب حیات' میں رقم کیا ہے:

''انھوں (میر سوز) نے علاوہ شاعری کے شعر خوانی کا ایسا طریقہ ایجاد کیا تھا جس سے کلام کا لطف دوچند ہو جاتا تھا، شعر کو اس طرح ادا کرتے تھے کہ خود مضمون کی صورت بن جاتے تھے، اور لوگ بھی نقل اتارتے تھے مگر وہ بات کہاں؟ آواز دردناک تھی، شعر نہایت نرمی اور سوز وگداز سے پڑھتے تھے اور اس میں اعضا سے بھی مدد لیتے تھے مثلاً شمع کا مضمون باندھتے تو پڑھتے وقت ایک ہاتھ شمع اور دوسرے کی اوٹ سے وہیں فانوس تیار کر کے بتاتے۔ بے دماغی یا ناراضی کا مضمون ہوتا تو خود بھی تیوری چڑھا کر وہیں بگڑ جاتے۔''

(آب حیات صفحہ 189 محمد حسین آزاد، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1982)

پروفیسر نیر مسعود کی کتاب 'مرثیہ خوانی کا فن' سے نظم طباطبائی کی تحریر دیکھیں۔

میں نے سنا کسی زمانے میں حکیم میر اصغر علی کی داستان سننے کو دو ایک دفعہ میر انیس بھی چلے آئے تھے اور میر صاحب کی مجلس میں حکیم صاحب تو جایا ہی کرتے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ داستان سننے کے بعد رزم کا بیان پڑھنے میں میر صاحب کا لہجہ کچھ بدل گیا ہے۔ سمجھے کہ ہمارا تتبع کیا۔ مجھ سے مرحوم ذاکر حسین یاس نے بیان کیا کہ حکیم صاحب کہا کرتے تھے کہ رزم کا بیان باندھنے اور پڑھنے میں انیس نے ہمارے طرز کو اڑا لیا''

اس ضمن میں نظم طباطبائی بیان کرتے ہیں کہ ''ایک مرتبہ وہ میر مونس کا مرثیہ سننے کے بعد حکیم اصغر کی داستان سننے کو چلے گئے حکیم صاحب نے رزم کے بیان میں رجز تو اس طرح ڈانٹ کر پڑھا کہ مونس کے یہ دو مصرعے جو ابھی ہم سن کر آئے تھے یاد آ گئے:

تیغوں کے دم بڑھیں، فرسوں کے قدم بڑھیں
کیا دیر ہے، ادھر سے بڑھو تم، تو ہم بڑھیں

یہ بیان کر کے نظم لکھتے ہیں:

اب اس کا فیصلہ کون کرے کہ رجز پڑھنے کا یہ طرز حکیم صاحب وہاں سے اڑا لائے تھے یا وہ لوگ ان کی داستان سن کر اڑا لے گئے تھے۔'' (مرثیہ خوانی کا فن صفحہ 17-16 پروفیسر نیر مسعود، اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ 1990)

داستان گوئی اور شعر خوانی کی حسین آمیزش سے جو فن وجود میں آیا وہ مرثیہ خوانی کہلایا۔ میر مظفر حسین ضمیر کو داستان گوئی اور شعر خوانی دونوں پر مہارت حاصل تھی اور ان کی اسی مہارت نے فن مرثیہ خوانی میں نئی نئی اختراعات کیں۔ اسی کے پیش نظر شبلی نعمانی نے اپنے 'موازنہ' میں میر ضمیر کو تحت اللفظ پڑھنے والا پہلا شخص قرار دیا جو میرے نزدیک درست نہیں ہے کیونکہ ضمیر نے اپنی مثنوی 'مظہر العجائب' (تصنیف 1244ھ) میں اپنی مرثیہ خوانی کے آغاز کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے:

میں کہ اس سے کبھی نہ تھا آگاہ
مرثیہ کا ہے کیا طریقہ و راہ
میں نے یہ عرض کی کہ مشفق من
مرثیہ خوانی کا جدا ہے فن
مجھ کو اس سے رسم و راہ نہیں
اس میں بندے کو دست گاہ نہیں

(مثنوی مظہر العجائب صفحہ 27 سید مظفر حسین ضمیر، مطلع الانوار سہارن پور)

میر ضمیر کا اپنے پڑوسی غلام علی کے عاشور خانے میں مجلس شب عاشور پڑھنے سے یہ کہہ کر معذرت کرنا کہ ''مرثیہ خوانی کا جدا ہے فن۔ مجھ کو کچھ اس سے رسم وراہ نہیں'' ظاہر کرتا ہے کہ میر ضمیر سے پہلے بھی مرثیہ خوانی کا فن موجود تھا، جیسا کہ خود ضمیر کے بیان سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ضمیر نے مرثیہ خوانی کے مروجہ انداز سے مختلف ایک نیا طرز خواندگی ایجاد کیا اس طرح ضمیر کو اس فن کا موجد کہنا غلط ہے۔ البتہ ضمیر کو 'مجدد خواندگی' کہا جاسکتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی ضروری ہے کہ خواندگی کے فن کو ضمیر و خلیق نے جو ارتقا بخشا اسے انیس و دبیر نے معراج کمال پر پہنچا دیا۔

مرثیہ خوانوں نے مرثیہ خوانی کے کچھ سکہ بند اصولوں کو تو ضرور اپنایا لیکن مرثیہ خوانی کو باقاعدہ وباضابطہ فن کا درجہ نہیں دیا مگر یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اسے فن کا درجہ دلانے کی سنجیدہ کوششیں نہیں کی گئیں۔ مرثیہ خوانی کو باقاعدہ فن کا درجہ خاندان انیس نے ہی دلایا اور خواندگی کے کچھ اصول بھی وضع کیے اور جو احاطہ تحریر میں آسکتے تھے انھیں قلم بند بھی کر دیا، کیوں کہ بہت سی باریکیاں اس فن میں ایسی بھی ہیں جن کا تحریر میں آنا تو درکنار، زبانی بھی سمجھانا ممکن نہیں، سوا اس کے کہ مصرعے کو صحیح اور درست لب و لہجے میں خود ادا کر کے بتایا جائے۔ مرثیے کی خواندگی کے اسرار و رموز سید یوسف حسین شائق (آل انیس) نے اپنے ایک مضمون میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیے ہیں اور مرثیہ خوانوں کے لیے کچھ ہدایتیں بھی کی ہیں۔

1. جو مرثیہ منبر پر پڑھنے کے لیے لایا جائے وہ پڑھنے والے کو زبانی یاد ہونا چاہیے، یا کم از کم اتنا ذہن نشین ہونا چاہیے جو یاد ہونے کے برابر ہو۔ اس کا اولیں مقصد یہ ہے کہ پڑھنے والے کی زبان سے ہر لفظ درست اور برمحل نکلے۔

2. مرثیہ کے مطلع کا پہلا مصرع ایک سانس میں ایسی آواز میں پڑھنا چاہیے جو نہ بہت بلند ہو نہ اتنی کم ہو جسے اہل مجلس سن نہ سکیں البتہ مصرعے میں قافیے پر پہنچ کر آواز پر تھوڑا زور دینا چاہیے تاکہ سننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ لفظ کیا ہے، اس کے بعد آواز کو پہلی سطح پر لے آنا چاہیے۔

3. مصرعے کو ایک سانس میں پڑھنے کی جو پابندی اوپر بیان ہوئی ہے صرف مطلع کے پہلے مصرعے کے لیے ضروری ہے۔

4. ہر مصرعے کو ادا کرنے میں اس کے مضمون اور انداز کے مطابق لب ولہجہ اختیار کرنا۔

5. مصرعے کے ٹکڑے کرنا: اس سے مراد یہ ہے چوں کہ مصرع چند فقروں کو ترتیب دے کر نظم کیا جاتا ہے اس لیے ان فقروں پر مناسب لب ولہجہ کے ساتھ وقفہ دینا چاہیے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ سننے والوں پر مفہوم واضح ہو جائے اگر مصرعے کے ٹکڑے غلط کیے جائیں گے تو مطلب اور معنی میں بہت فرق پیدا ہو جائے گا۔ یہاں ہمیں مصرعے کے غلط ٹکڑے کرنے کی ایک مثال یاد آگئی جسے ہم اپنے بیان کی وضاحت کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے حسب ذیل مصرعے کے ٹکڑے کرکے یوں پڑھا:

ٹوٹے تھے سب رسول کے پیارے۔ حسینؑ پر

غلط ٹکڑے کرنے سے معنی یہ نکلتے ہیں کہ جو لوگ حسینؑ پر حملہ آور ہوئے تھے وہ رسول کے پیارے تھے لیکن حسینؑ رسولؐ کے پیارے نہ تھے کیونکہ 'حسینؑ پر' کے ٹکڑے کو الگ کر دیا، حالانکہ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ:

ٹوٹے تھے سب۔ رسول کے پیارے حسینؑ پر

اب مصرعے کے معنی یہ پیدا ہوئے ہیں کہ تمام اعدا، رسول کے پیارے حسین پر حملہ آور تھے۔ اس طرح کا فرق ہے جو مصرع کے غلط ٹکڑے کرنے سے مفہوم اور مطلب میں پڑ جاتا ہے۔

6. قطع کرنا: اس سے مراد ہے مصرعے کے کسی فقرے پر آواز میں ایسی تبدیلی پیدا کرنا جس سے سننے والے پر یہ ظاہر ہو کہ ابھی بات ناتمام ہے اور ابھی کچھ اور کہنا باقی ہے۔ یہ صورت مصرعوں کو ادا کرنے میں کثرت سے آتی ہے۔ قطع کرنے کی ضرورت مصرعے کے درمیان میں بھی پڑتی ہے اور ایسے محل پر بھی جہاں ایک مصرعے کو اگلے مصرعے سے مربوط کرنا ہو۔ مصرعے کے درمیان میں جن الفاظ پر قطع کرنا ہوتا ہے وہ عموماً 'کی عرض'، 'فرمایا'، 'یہ سن کے'، 'یہ کہہ کے' وغیرہ ہیں۔

ایک مصرع کو دوسرے مصرعے کے ساتھ قطع کرنے کی مثال یہ ہے:

صحت سے نوجواں بھی ہیں بچے بھی۔ پیر بھی

اس مصرعے کو اگلے مصرع سے ملانے کے لیے 'پیر بھی' کے فقرے پر قطع کرنا ہوگا، تب اگلا مصرع مطلب واضح کرے گا جو یہ ہے:

سجاد ایک۔ ہوگئے ہیں۔ راہ میں علیل

اب یہ معنی مکمل ہوئے کہ سب تو صحت سے ہیں لیکن ایک سجاد ہیں جو علیل ہوگئے ہیں۔

7. اگر کسی مصرعے میں صنائع لفظی آگئے ہوں تو اس مصرعے کو ایسے لہجے میں پڑھنا چاہیے جس سے وہ صنعت اور مصرعے کا حسن نمایاں ہو جائے اس کی مثال میں یہ مصرع ملاحظہ ہو:

کھینچے جو کماں۔ دے نہ اماں۔ پیل دماں کو

اس مصرعے میں تکرار قافیہ سے مصرعے میں حسن پیدا کیا گیا ہے لہٰذا اس مصرعے کے تینوں فقروں پر توقف بھی کرنا ہوگا اور ہر فقرے کو اس کے مناسب لہجے میں ادا کیا جائے گا۔

8. مصرع کسی رخ سے پڑھنا: بعض مصرعے ایسے ہوتے ہیں جن میں ایک سے زائد انداز یا پہلو نکل سکتے ہیں اور ان کے ادا کرنے کا الگ لب ولہجہ ہوگا۔ ایسے مصرعے کے ہر انداز کے لیے جو لب ولہجہ اختیار کیا جائے گا وہ اس کا رخ کہا جائے گا۔ لب و لہجے کے اسی فرق کو رخ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ پڑھنے والے کی صواب دید پر موقوف ہے کہ وہ مصرعے کے کس انداز کو پڑھنے کے لیے منتخب کرتا ہے اور سامعین پر کیا تاثر ڈالنا چاہتا ہے اسی کے مطابق اسے پڑھنے کا رخ اختیار کرنا چاہیے۔ اس کی مثال میں بھی ایک مصرع ملاحظہ ہو:

دیکھو! فساد ہوگا، بڑھایا اگر قدم

اس مصرعے کے پڑھنے کے دو رخ ہیں ایک تو غصے کا لہجہ ہے جس کے ذریعے سے کسی کو مرعوب کرنا ہے اور دوسرا رخ نرم لہجے میں متنبہ کرنا ہے کہ اگر قدم بڑھاؤ گے تو اس کا نتیجہ فساد ہوگا۔ یہ دونوں رخ پوری طرح واضح کرنا ممکن نہیں جب تک دونوں رخ سے مصرعے کو ادا کر کے نہ بتایا جائے گا۔''

(مرثیہ خوانی میں خاندان انیس کا مقام، سید یوسف حسین، مطبوعہ پندرہ روزہ شیعہ ص5و6 ایڈیٹر میثم کاظم جرولی لکھنو 25 ستمبر 1988)

خواندگی کے مندرجہ بالا آئین وقوانین اور قواعد وضوابط کے بالاستیعاب مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ خواندگی کا فن بہت مشکل اور دقت پسند ہے اس کے لیے مسلسل ریاض کی ضرورت ہے۔ مرثیہ خوان مختلف النوع افراد کی کیفیت صرف لہجے کے تغیر، جسم اور اعضا کی معمولی جنبش، چشم وابرو کی گردش سے بیان کرتا ہے مرثیہ خوان کے لیے یہ بڑا نازک موقع ہوتا ہے کیونکہ اسے مرثیہ کے کرداروں کی منظر کشی کے ساتھ ساتھ اپنی ہستی کو بھی قائم رکھنا ہوتا ہے۔ مثلاً مرثیہ خواں سکینہ کا مکالمہ پیش کر رہا ہے تو اسے ایسا لب ولہجہ اختیار کرنا پڑتا ہے جس سے اہل مجلس صورت تو اس کی دیکھیں مگر آواز وہ چار برس کی کم سن بچی کی سنیں۔ یہ کتنا نازک مقام ہے اس کی نزاکتوں کو مرثیہ خوان یا مرثیہ خوانی سے خصوصی شغف رکھنے والے حضرات ہی سمجھ سکتے ہیں۔

■

Mirza Shafiq Husain Shafaq
5, Unity Apartment 55, Jagat Narain Road,
Lucknow - 18 (UP)

لطف الرحمٰن کا نظریۂ شعر وادب

مشتاق احمد

بیسویں صدی صنعتی انقلابات اور جملہ شعبۂ حیات سے تعلق رکھنے والی شخصیات کے قابلِ تحسین کارناموں کی صدی رہی ہے۔ اس لیے اس صدی کو نشاۃ ثانیہ کی صدی بھی کہا جاتا ہے۔ جہاں تک زبان وادب کا سوال ہے تو اس شعبے میں بھی بیسویں صدی ایک زرخیز صدی مانی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس صدی میں آسمانِ عالمی ادب پر سیکڑوں درخشاں ستارے نمودار ہوئے ہیں۔ اردو کے تعلق سے بھی بیسویں صدی ایک غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے کہ ترقی پسند تحریک، حلقہ اربابِ ذوق، جدیدیت، تعمیریت اور مابعد جدیدیت کے پودوں کی آبیاری بھی اسی صدی میں ہوئی اور اسے تناوری بھی حاصل ہوئی۔ لطف الرحمٰن جیسی ہمہ جہت شخصیت کا تعلق بھی علم وفن کی اسی زرخیز صدی سے ہے کہ ان کی پیدائش 2 فروری 1941 کو شمالی بہار کے مردم خیز خطہ دربھنگہ کے ریونڈھا گاؤں میں ہوئی تھی اور ان کا انتقال 31 اگست 2013 کو بھاگلپور میں ہوا۔ غرض کہ نصف بیسویں صدی اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے تمام نشیب وفراز کے مناظر وتلاطم ان کے ذہن وفکر کے محور ومرکز رہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن کی تخلیقات کے مطالعے سے یہ عقدہ کھلتا ہے کہ وہ ادب، سماج اور زندگی کے جمالیاتی رشتوں کے امین تھے۔ انھوں نے نہ صرف اردو شاعری کو تازگیٔ برگِ نوا سے نوازا بلکہ فنونِ لطیفہ اور تخلیقی تخیل کو بھی اپنی تنقیدی بصیرت وبصارت سے نئی سمت ورفتار بخشی۔ اس طرح کی ہمہ جہت شخصیت کا انتقال نہ صرف اردو زبان وادب کے لیے بلکہ ہندوستانی ادب کے لیے خسارۂ عظیم ہے۔

لطف الرحمٰن کے حالاتِ زندگی پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچپن سے ہی ذہین وفطین تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں بے پناہ ذہانت وصلاحیت سے نوازا تھا۔ انھوں نے دربھنگہ کے تاریخی شفیع مسلم ہائی اسکول سے 1957 میں امتیازی نمبر سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ ان کے اساتذہ اور ہم درجہ آج بھی ان کی ذہانت کی مثال پیش کرتے ہیں۔ وہ پھر پٹنہ گئے اور بی این کالج سے انٹر پاس کیا لیکن دربھنگہ جو زمانۂ قدیم سے تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہا ہے اس کی یادیں انھیں پھر دربھنگہ کھینچ لائی۔ یہاں انھوں نے شہر کے تاریخی تعلیمی ادارہ ملّت کالج، دربھنگہ میں داخلہ لیا اور 1961 میں بی اے آنرز کے امتحان میں بہار یونیورسٹی میں اول درجہ حاصل کیا اور گولڈ میڈلسٹ ہوئے۔ پٹنہ یونیورسٹی سے انھوں نے پہلے ایم اے (اردو) کا امتحان دیا اور یونیورسٹی میں ٹاپ رہے۔ پھر ایم اے (فارسی) کیا یونیورسٹی میں پہلی پوزیشن لے کر گولڈ میڈل حاصل کیا۔ واضح ہو کہ اردو میں بھی انھیں گولڈ میڈل ملا تھا اور برسوں تک اس کی گونج حلقۂ ادب میں رہی۔ انھوں نے اپنے استادِ محترم پروفیسر اختر اورینوی اور علامہ جمیل مظہری کے مشورے پر 1966 میں ٹی این بی کالج بھاگلپور میں بہ حیثیت لکچرار (اردو) تقرر ہوا۔ بعدہٗ بھاگلپور یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو مقرر ہوئے اور فروری 2001 میں سرکاری ملازمت سے سبکدوشی حاصل کی۔

پروفیسر لطف الرحمٰن کی شخصیت ہمہ جہت تھی وہ ایک طرف زبان وادب کے اچھے استاد تھے تو دوسری طرف سماجی وسیاسی میدان میں بھی اپنی مستحکم شناخت رکھتے تھے۔ ان کی سیاسی بصیرت اور سماجی شعور کے قائل ریاست بہار کی تمام سیاسی پارٹیوں کے سربراہ تھے۔ انھیں کئی سیاسی پارٹیوں نے سیاست میں عملی طور پر شامل ہونے کی دعوت دی لیکن شروع کے دنوں میں انھوں نے خود کو زبان وادب تک ہی محدود رکھا لیکن 1995 میں راجد کے سربراہ لالو یادو کی ایما پر وہ عملی سیاست میں داخل ہوئے اور بھاگلپور کے ناتھ نگر اسمبلی حلقے سے ممبر قانون ساز اسمبلی منتخب ہوئے۔ 1997 سے 1999 تک وہ بہار کی کابینہ میں بھی شامل رہے۔ انھیں محکمۂ اقلیتی فلاح وبہبود اور محکمۂ تعمیر سڑک کی وزارت دی گئی اور یہاں بھی انھوں نے اپنی ذہانت اور سیاسی بصیرت کا ثبوت پیش کیا اور بے داغ رہے۔ سیاست میں مصلحت پسندی ایمان کا درجہ رکھتی ہے لیکن لطف الرحمٰن نے کبھی بھی حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا۔ نتیجتاً وہ جلد ہی سیاست کی مصلحت پسند دنیا سے باہر نکل آئے اور بقول پروفیسر قمر رئیس ''سیاسی لکڑ بگھوں کی چنگل سے نکل آئے''۔

یوں تو لطف الرحمٰن اپنی طالب علمی کے زمانے سے ہی لکھنے پڑھنے کی طرف مائل تھے لیکن پیشۂ تدریس میں آنے کے بعد انھوں نے ادب کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ شروع کے دنوں میں چھپنے چھپانے میں دلچسپی رہی لیکن بعد کے دنوں میں اپنی تحریروں کو شائع کرانے سے زیادہ مطالعے میں غرق رہے۔ جن لوگوں نے لطف الرحمٰن کی تحریریں پڑھی ہیں یا تقریریں سنی ہیں وہ خود ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ لطف الرحمٰن کا مطالعہ کتنا وسیع تھا اور ان کی تحقیقی وتنقیدی بصیرت کی گیرائی وگہرائی کیا تھی۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے ہی کیا تھا۔ ان کی پہلی شعری تخلیق بہ صورتِ نظم انجمن ترقی اردو ہند کے ترجمان 'ہماری زبان' 1961 میں شائع ہوئی تھی جس کے ایڈیٹر اردو ادب کے قد آور ناقد پروفیسر آل احمد سرور تھے۔ ان کا پہلا شعری مجموعہ 'تازگیٔ برگِ نوا' 1977 میں شائع ہوا تھا اپنی غزلیہ شاعری کے متعلق خود انھوں نے لکھا ہے کہ:

''میری غزلیں میری باطنی خود کلامی کی صدائے باز گشت اور میرے تلخ وشیریں تجربات کی پردۂ سخن ہیں۔ میں نے اس صدی میں اپنی آواز کی تہذیب وتحسین کا بارِ گراں اٹھایا جو کامیو کے لفظوں میں مکروہ ترین انسانی جرائم کے ارتکاب کی صدی ہے، بیسویں صدی کے تقریباً وسط میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم کے بے ضمیر حملوں نے بے گناہ انسانوں کے قتلِ عام کا جشن جس انداز میں منایا اور جس طرح دوسری جنگِ عظیم میں تقریباً پانچ کروڑ انسان موت کے گھاٹ اتار دیے گئے وہ میرے لاشعور کی تشکیل کا عہد تھا، جس نے مجھے اس اجتماعی لاشعور کا حصہ بنایا، جس کا سنگِ بنیاد تشدد اور ہمہ گیر انتشار ہے، اس کے بعد سے دنیا میں تشدد، انتشار، بے انصافی اور انسانی جرائم کے جوڈرامے مسلسل کھیلے جا رہے ہیں انھوں نے میرے باطن کو مسلسل عذاب میں رکھا ہے، اس لیے میری غزلوں میں دکھ اور انتشار کا احساس زیادہ نمایاں اور گہرا ہے'' (بوسۂ نم، ص 11)

دراصل لطف الرحمٰن عصری حسیت کے نبض شناس تھے اور ان کی نگاہوں میں صرف درسی ونصابی کتابیں نہیں تھیں جیسا کہ ان دنوں ہمارے معروف دانشوروں کی میزانِ عقل کا محور ومرکز ہے۔ بلکہ وہ ادب کے علاوہ تواریخ، سماجیات، سیاسیات اور نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ان کی تخلیقات اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں

علوم وفنون کے کتنے چراغوں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی فکر ونظر کی دنیا روشن کی ہے۔ وہ خود اعتراف کرتے ہیں کہ:

''تخلیق فن عبادت ہے۔ تفریح طبع کی چیز نہیں، شعروسخن بھی تزکیۂ نفس کا ایک پر اثر اور دلکش وسیلہ ہے۔ اس سے روحانی بصیرت، زندگی میں نفاست، معصومیت اور تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ جمالیاتی ادراک کی منزلوں میں ذات سے فطری بے نیازی رفعتِ احساس عطا کرتی ہے جو بے ثبات زندگی کی آلائشوں اور کثافتوں سے نجات کا خوبصورت وسیلہ بن جاتی ہے۔ شاعری روحانی نابصیری کا بہترین مداوا اور ابدیت سے ہم آہنگی کا بہترین ذریعہ ہے۔ عمومی سطح زندگی سے بے تعلقی، روحانی رفعت اور باطنی پاکیزگی پر مبنی فن کارانہ تخلیق تزکیۂ باطن کی رہگذر میں انمول رختِ سفر کی حیثیت رکھتی ہے۔ فن کا مقصد داخلی معراج ہے''۔ (مقدمہ 'بوسۂ نم' 2007 ص 7)

پروفیسر لطف الرحمٰن کی شعری کائنات پانچ مجموعہ ہائے کلام پر مشتمل ہے۔ 'تازگیِ برگِ نوا' (1977) 'بوسۂ نم' (2007)، 'صنم آشنا' (2008) 'دشت میں خیمہ گل' (2012)، 'راگ براگ' (2012)۔ ان مجموعوں کی غزلوں، نظموں اور نثری نظموں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ لطف الرحمٰن ایک فطری شاعر تھے اور ان کی فکر ونظر کا محور فلاح و بہبودِ انسانیت تھا۔ اس لیے وہ شروع کی روایتی شاعری یعنی گل ورخسار کی دنیا سے جلد ہی باہر نکل کر مسائلِ زیست کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے۔ 'تازگیِ برگِ نوا' کی چند غزلوں کو چھوڑ دیں تو پہلا مجموعہ ہی یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ لطف الرحمٰن کے اندر کا دکھ صرف شاعر کا دکھ نہیں ہے بلکہ یہ غمِ ذات تو غمِ جہاں کا درجہ رکھتا ہے:

اٹھائے دوش پہ صدیوں کی بے حسی کا بوجھ
گذشتہ شب کوئی کھینچی ہوئی کمان تھا میں

دلکشی اب بھی عمارت کی بظاہر ہے وہی
گرچہ اندر سے بکھرتی ہوئی دیوار ہوں میں

بدلا ہے ساتھ ساتھ مرے آسماں کا رنگ
ٹھہرا ہے اک مقام پہ یہ کارواں بھی کب

'دشت میں خیمۂ گل'، 'بوسۂ نم'، 'صنم آشنا' اور 'راگ براگ' کی شاعری لطف الرحمٰن کے ارتقائے فکر ونظر کی غماز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دھیرے دھیرے میری آنکھیں ہو گئیں صحرا نشیں
قطرہ قطرہ کوئی ان جھیلوں کا آنسو لے گیا
اس کا دل داغ ہے اندر سے بھنور ہوں میں بھی
اپنے ہی چاند کے سائے کا سفر ہوں میں بھی

رات بیمار سی ہے صبح عیادت جیسی
تو نہیں ہے تو ہر اک رُت ہے مصیبت جیسی
آنکھ روتی ہوئی ہنستا ہوا چہرہ کیا ہے
کچھ بتا صفحۂ دریا پہ یہ لکھا کیا ہے

دفترِ زیست میں ایسے بھی کئی نام ملے
جو فسانہ نہ بنے صرف حوالوں میں رہے
ہم گلستاں میں رہے بوئے محبت بن کر
گرچہ آوارہ و برباد پریشاں بھی رہے

طوالت کے خوف سے مزید غزلیہ اشعار کی یہاں گنجائش نہیں اور نہ ان کی نثری نظموں کی مثالیں ممکن ہیں لیکن بطورِ نمونہ ان کی دو نثری نظمیں یہاں پیش کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ نثری نظموں میں بھی لطف الرحمٰن نے اپنی فنکاری کو معراج بخشا ہے۔ نظم 'تواریخ' ملاحظہ کیجیے:

پہاڑوں کی ناہموار سڑکوں کی طرح
وہ بھی بے سمت و بے جہت/ شخصیت رکھتی ہے
وادیوں سے آنکھ مچولی کھیلتی رہتی ہے
آوارہ گرد بگولوں کی طرح
کبھی کسی جھاڑی سے اٹکھیلیاں کرتی ہے
کہیں نیچے سے اوپر/ اور کبھی اوپر سے نیچے
لہریں لیتی رہتی ہے
''آتی ہے ندی فرازِ کوہ سے گاتی ہوئی!''
''آسماں کے طائروں کو نغمہ سکھلاتی ہوئی''
''سنگِ رہ سے گاہ بچتی، گاہ ٹکراتی ہوئی''
اور جب صحراؤں سے گذرتی ہے تو
ہلکان ہو جاتی ہے/ اور میدانوں میں پہونچتی ہے
تو یوں پھیل جاتی ہے کہ
اس کا وجود ہی معدوم ہو جاتا ہے
اپنے کناروں سے محروم ہو جاتی ہے
اور کبھی جب جوش میں آتی ہے
تو بستیوں اور شہروں کو/ بے وجود بنا دیتی ہے
اور پھر آہستہ سے/ سمندر کی گود میں اتر کر
ایک بے نام سی لہر بن جاتی ہیں
اور اس کے کھارے پانی میں
اپنی ساری مٹھاس کھو دیتی ہے

(راگ براگ۔ ص 102-103)

اور 'صنم آشنا' کی نظم 'عکس' ملاحظہ کیجیے:

میرا سلسلۂ نسب/ نہ چاند سے ملتا ہے
نہ کسی ستارے سے/ میرے محبوب!
میں تو!/ تیری مہربان نگاہوں کا عکس ہوں
جس نے/ سورج کو بھی/ مجھ سے شرمندہ کر دیا ہے

(صنم آشنا، ص 96)

پروفیسر وہاب اشرفی نے بجا لکھا ہے کہ:

''ان کی تنقیدی کاوشوں میں ان کے گہرے علمی شعور کا تو اندازہ ہوتا ہی ہے۔ ان کے مفکرانہ ذہن کی شناخت کے کئی پہلو ابھرتے رہتے ہیں۔ ایک دانشور جب شاعری کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو اس کی فکر کی صلاحیت کا اندازہ اس کے شعر سے بھی ہونے لگتا ہے''۔

(وہاب اشرفی، راگ براگ۔ ص 158)

بلاشبہ ان کی غزلیں اور نظمیں ان کے زرخیز مفکرانہ ذہن اور صالح فکر ونظر کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ لطف الرحمٰن کی شاعری کو پڑھنے کے لیے تمام تر تعصب سے پاک ذہن کی ضرورت ہے اور قاری کا با شعور ہونا بھی لازمی ہے۔ جیسا کہ شفیع جاوید نے کہا ہے:

''لطف الرحمٰن کے اشعار ذہنی بالیدگی اور ارتقاع کے اظہار ہیں۔ یہ شاعر دلنواز عام ادبی حافظے کی شے نہیں ہے کیوں کہ انھیں غزل کی فہم کے ساتھ ہی پڑھا جا سکتا ہے''۔

(شفیع جاوید، دشت میں خیمۂ گل، 2012، ص 17)

لطف الرحمٰن اردو تنقید نگاری میں بھی اپنی منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کو پیش پا افتادہ مضامین کا پلندہ نہیں بنایا ہے بلکہ صحرائے نقد میں اپنی تعمیری فکر کی بارشوں سے دلکش سبزے بھی اگائے۔ وہ تنقید کو بھی تخلیق سے کمتر نہیں سمجھتے تھے اور ادب کے لیے تنقید کو سانس تصور کرتے تھے۔ واضح ہو کہ ان کا پہلا تنقیدی کارنامہ 'جدیدیت کی جمالیات' (1993) میں آیا تھا اور اس وقت یہ کہا جا رہا تھا کہ جدیدیت کا چراغ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گل ہو چکا ہے لیکن لطف الرحمٰن کی یہ کتاب گہرے جھیل میں ایک کنکر پھینکنے کی مانند تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے جھیل کے کنارے تک شعورِ آب کے ہلکوروں نے غور وفکر کے کتنے دائرے بنا دیے تھے اور جہانِ ادب میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا۔ ان کی نگاہ میں تنقید مکھی پر مکھی مارنے کا عمل نہیں تھا بلکہ وہ تنقید میں بھی فکری اور جمالیاتی مفاہمت کو لازمی قرار دیتے تھے۔ تنقید کے متعلق ان کا نظریہ واضح تھا کہ:

''ادب اور تنقید میں چولی دامن کا ساتھ ہے، لیکن فنی تنقید کی سرحدوں کا آغاز تخلیق کی تکمیل کے بعد ہوتا ہے۔ تنقید کا بنیادی مقصد فنکار اور قاری کے درمیان سازگار فکری اور جمالیاتی مفاہمت اور جذبہ واحساس کی ہم رشتگی کا فروغ ہے۔ نقاد قاضی، مفتی یا فقیہ نہیں ہوتا کسی حد تک مدرس ہو سکتا ہے۔ نقادوں پر قارئین کے ذوقِ ادب وفن اور احساسِ جمال کی تہذیب وتحسین کی ذمے داری تو یقیناً

عائد ہوتی ہے۔(نقدِ نگاہ،ص11)

جیسا کہ پہلے ذکر آچکا ہے کہ لطف الرحمٰن شروع کے دنوں میں چھپنے چھپانے میں دلچسپی رکھتے تھے لیکن دو دہائیوں تک انھوں نے چھپنے چھپانے سے زیادہ مطالعے کو ضروری سمجھا اور شاعری ہو کہ نثری تخلیقات اس کی روح میں اترنے کی کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ ''جدیدیت کی جمالیات'' (1993) کی اشاعت کے بعد ان کی دوسری تنقیدی تصانیف 'نثر کی شعریات'(2006) ، 'نقد نگاہ' (2006)، 'تنقیدی مکالمے' (2008) 'تعبیر وتقدیر' (2008)، 'فنون لطیفہ اور تخلیقی تخیل' (2011)، 'تنقید وتخلیق' (2011) میں بالترتیب شائع ہوئیں۔ اس سے پہلے ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ 'راسخ عظیم آبادی کی غزل گوئی' 'کتابی صورت میں اور ہندی شاعر 'بہاری' پر ایک مونوگراف بھی ساہتیہ اکادمی سے ہی شائع ہوا تھا۔

پروفیسر لطف الرحمٰن تنقید کو بھی تخلیق کے درجے کی چیز سمجھتے تھے اور ان کا یہ اصرار تھا کہ تخلیق سے کسی قدر تنقید کی اہمیت کم نہیں ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ نقاد اپنی تنقیدی آرا میں اصلیت (Orignality) برقرار رکھے نہ کہ 'مانگے کا اجالا' سے کام چلائے۔ انھوں نے بارہا اس فکرمندی کا اظہار کیا کہ اردو میں جو تنقید لکھی جارہی ہے وہ زیادہ تر مانگے کا اجالا ہے۔ انھوں نے اردو تنقید کی اہمیت وافادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''کسی بھی تخلیق کی مکمل معنویت اور تعبیر وتفسیر کبھی مکمل نہیں ہوتی، بدلتے ہوئے عصری وآفاقی منظر وپس منظر میں تخلیق فن کی معنویت میں بھی تبدیلی وتغیر ایک فطری امر ہے، نقاد فن کی مسلسل معنی آفرینی کا سب سے اہم فریضہ ادا کرتا ہے، فن کو از کاررفتہ، مہمل، بے معنی اور باسی پن اور کہنگی سے محفوظ رکھتا ہے، یہ اس کا اہم کارنامہ ہے، جو اس کے فن کے وجود کو ایک ناگزیر حصہ بنا دیتا ہے، تخلیق وتنقید ایک ہی سکّے کے دو رخ ہیں۔ یعنی ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم یعنی نقاد ان طلسمات سے پردہ اٹھاتا ہے، جو تخلیق کے گرد حائل ہیں''۔

(مقدمہ تنقید وتخلیق 2011، ص10)

پروفیسر وہاب اشرفی جنھوں نے اپنی اہم تحقیقی وتنقیدی کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں پروفیسر لطف الرحمٰن کو بطور ناقد پیش کرنے سے گریز کیا تھا اور بحیثیت شاعر جگہ دے کر حقِ تاریخ نویسی ادا کی تھی، نے جب پروفیسر لطف الرحمٰن کے تنقیدی اثاثے کا بغور مطالعہ کیا تو انھیں بھی اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑا کہ:

''لطف الرحمٰن کے یہاں انسانی تباہی کے خوف کا احساس ان کی تنقید کے مرکزی تصور پر دال ہے۔ نئے شعروادب کا یہ مزاج معلق نہیں ہے نتیجے کے طور پر تنقید کا کیف بھی اسی سے پیدا ہو رہا ہے۔ لطف الرحمٰن کی دل سوزی اور دردمندی کا Perspective بھی یہی ہے چنانچہ ان کی تنقیدی روش میں اخلاقی قدروں کا احترام ایک روشن لکیر ہے، جن کی شکست وریخت حقیقتاً انسان کی شکست وریخت ہے۔ تباہی وبربادی ہے۔ لطف الرحمٰن کی فنی تنقید اسی احساس کو جگاتی اور انسان، انسانیت اور دنیا کی سالمیت کے خطرات کو آئینہ دکھا کر ذی ہوش اور دانش مند بنانے کا مشکل کام سرانجام دیتی ہے۔ لطف الرحمٰن انسانیت کی مثبت سرشت کے قائل تو ہیں لیکن اسے گھن لگانے والے عناصر کی طرف نشاندہی کر کے ایک طرح سے بڑی طاقتوں کی لائی ہوئی بیماریوں کے علاج کے لیے بڑی سنجیدگی سے فکرمند ہیں یعنی ان کی تنقید کی ایک واضح سمت ہے...''

('جدیدیت کی جمالیات' 1993، اردو تنقید کا نیا نصاب، از وہاب اشرفی، ص11)

دراصل لطف الرحمن عصری حسیت کے نبض شناس تھے اور ان کی نگاہوں میں صرف درسی ونصابی کتابیں نہیں تھیں جیسا کہ ان دنوں ہمارے معروف دانشوروں کی میزانِ عقل کا محور ومرکز ہے۔ بلکہ وہ ادب کے علاوہ تواریخ، سماجیا ت، سیاسیات اور نفسیات پر بھی گہری نظر رکھتے تھے ان کی تخلیقات اس حقیقت کو عیاں کرتی ہیں کہ انھوں نے اپنی تحریروں میں علوم وفنون کے کتنے چراغوں سے استفادہ کیا ہے اور اپنی فکر ونظر کی دنیا روشن کی ہے۔

بلاشبہ پروفیسر لطف الرحمٰن کے تنقیدی وتحقیقی مضامین اردو تنقید وتحقیق کو نہ صرف اعتبار بخشتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے مشعلِ راہ ہیں جو صدق دل سے تمام تر گروہ بندی وگروپ بندی سے دامن بچاتے ہوئے دنیائے ادب میں اپنے فکر ونظر کے چراغ روشن کیے ہوئے ہیں۔ پروفیسر رحمٰن ادب کو حقیقت ہستی کے عرفان وادراک کا بہتر ذریعہ تصور کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مطالعۂ ادب کی اہمیت جگہ بہ جگہ تحریر کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایک انسان کے اندرون کی تاریکی صرف اور صرف مطالعہ ادب سے ہی دور ہوسکتی ہے۔

مختصر یہ کہ پروفیسر لطف الرحمٰن نے اگر اپنی شاعری کے پودوں کی آبیاری خونِ جگر سے کی تو اردو تنقید کی سنگلاخ زمین میں بھی اپنی فکر نو کے گل کھلائے۔ انھوں نے نئی نسل کے سامنے یہ مثال پیش کی ہے کہ شاعری اور تنقید کی عمارت اشیائے فسوں سے تیار نہیں ہوسکتی بلکہ اس کے لیے حق جوئی اور حق گوئی لازمی شرط ہے۔ پروفیسر قمر رئیس نے ان کی تنقیدی بصیرت وبصارت کی عصری معنویت کا اعتراف کرتے ہوئے بجا لکھا ہے کہ:

''انھوں نے ادبی تنقید میں جو پہچان بنائی ہے اس کی بنیاد حق جوئی یعنی ادبی ورثہ میں نئی سچائیوں کی جستجو پر ہے۔ اس کے لیے بے شک انھوں نے نئے یعنی فیشن زدہ اوزار نہ ڈھونڈے ہوں لیکن جن اوزاروں سے کام لیا ہے وہ آزمودہ اور مصفا تو ہیں ہی انھیں ان کے غور وفکر نے زیادہ کارگر اور صیقل بھی کیا ہے۔''

(پیش گفتار، نثر کی شعریات، 2006، قمر رئیس)

پروفیسر لطف الرحمٰن کے متعلق عہد حاضر کے جید عالم ودانشور اور مفکرِ اسلام مولانا ولی رحمانی کی اس دانشورانہ تحریر کو دیکھیے جس کا حرف حرف سند کا درجہ رکھتا ہے:

''پروفیسر لطف الرحمٰن صاحب آج کی تہذیب کے 'مردِ آگاہ' ہونے کے باوجود عجلت کا شکار نہیں ہیں، نہ سطحیت کا مرض ان کے قریب سے گزرا ہے۔ وہ گہرے مطالعہ، ڈوب کر پڑھنے، غور وفکر، تحلیل وتجزیہ اور نقد ونظر کا مزاج رکھتے ہیں۔ قدرت نے انھیں عقل کے وافر حصے کے ساتھ عمدہ حافظے سے نوازا ہے، جس کا وہ بہترین ایجابی مصرف لیتے ہیں۔ مرحلہ تحریر کا ہو یا تقریر کا، وہ کھرے اترتے ہیں اور پڑھنے اور سننے والوں پر گہرا اثر چھوڑتے ہیں عام زندگی سے لے کر فکر وتحقیق کے مرحلوں تک ان میں جو بڑا وصف نظر آتا ہے وہ قوتِ گفتار کے ساتھ جرأتِ اظہار بھی ہے، جس سے ان کے جملے گوہر آبدار بن جاتے ہیں''۔

(محمد ولی رحمانی، نقدِ نگاہ، ص:15-14)

پروفیسر لطف الرحمٰن نے کبھی کہا تھا کہ:

تو بند کردے نگاہوں کے ان دریچوں کو
کہ اب نہ لوٹ کے آؤں گا، جانتا ہوں میں

یہ حقیقت تو ابدی اور ازلی ہے کہ اب لطف الرحمٰن جسمانی طور پر ہمارے درمیان نہیں آئیں گے لیکن ان کے فکری اثاثے ہمارے ذہن کو ہمیشہ منور کرتے رہیں گے۔ غالب نے شاید اسی طرح کی ہمہ جہت اور عبقری شخصیت کے لیے کہا تھا:

مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم
تو نے وہ گنجہائے گراں مایہ کیا کیے

Dr. Mushtaque Ahmad
Millat College, Darbhanga - 846004 (Bihar)

رام پرسادمینا

بھیڑ میں ہے مگر اکیلا ہے

مخمور سعیدی کی شخصیت کے مختلف پہلو

اردو شاعری مختلف ادبی ونیم ادبی تحریکوں سے متاثر رہی ہے مثلاً کلاسیکل، نوکلاسیکل، رومانی، ترقی پسند، حلقۂ ارباب ذوق، جدیدیت، مابعد جدیدیت وغیرہ، ان تحریکات کے اثرات ہر شاعر اور ادیب نے قبول کیے ہیں ان سب میں ایک شاعر ایسا بھی ہے جس نے ان تحریکوں کے اثرات تو قبول کیے لیکن کسی بھی ایک تحریک کو اپنے پاؤں کی زنجیر نہیں بننے دیا۔ اس شاعر کا نام ہے مخمور سعیدی۔ سلطان محمد خاں، قلمی نام مخمور سعیدی 31 دسمبر 1934 میں ٹونک (راجستھان) میں پیدا ہوئے اور 2 مارچ 2010 کو وہیں وفات پائی۔ مخمور سعیدی کا شمار جدید دور کے نامور شاعروں میں ہوتا ہے۔ مخمور سعیدی کلاسیکی شاعر نہیں ہیں جب کہ کلاسیکیت ان کی شعری سرشت کا حصہ ہے۔ وہ ترقی پسندی کے قائل بھی نہیں لیکن ایک حد تک ان کو بلند آہنگی، قطعیت، اور بیانیہ انداز پسند ہے۔ وہ ایک غیر جدید شاعر بھی نہیں مگر جدیدیت کو بعض موضوعات تک محدود رکھنا اور اظہار کو ابہام کے پردے میں مستور رکھنے کے قائل نہیں۔ یہ متضاد خصوصیات وکیفیات ان کو اجتماع ضدین کا شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

شمس الرحمٰن فاروقی مخمور سعیدی کی شاعرانہ کیفیت کو اس انداز میں پیش کرتے ہیں:

''وہ جدید شاعر ہیں لیکن پرانی فارسی پر مکمل قدرت رکھتے ہیں۔ وہ جدیدیت کے نمائندہ شعرا میں نمایاں ہیں لیکن مشاعرے پڑھتے ہیں۔ وہ تحت اللفظ سناتے ہیں لیکن مشاعروں میں بے انتہا مقبول ہیں۔ ان کے مزاج میں تفرید پسندی ہے لیکن وہ یاروں کے یار بھی ہیں۔''

(راستہ اور میں، مصنف: شین کاف نظام، ص 37)

مخمور سعیدی کے مزاج میں بردباری اور جذبۂ عمل کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ مروت، انکسار، دردمندی، شرافت جیسی اقدار سے جس شخص کا پیکر تشکیل پاتا ہے اس کا نام ہی مخمور سعیدی ہے۔ انسان ہی کی حیثیت سے نہیں ایک شاعر اور مدیر کی بھی حیثیت سے ان کا مرتبہ بلند تھا۔

مخمور سعیدی کو دوسرے معاصرین کی طرح نہ تو اپنے کسی مرتبے کا نشہ رہا اور نہ وہ عزتیں کمائیں جو ذلتوں کے عوض حاصل ہوتی ہیں۔ وہ ہر حال میں خوش رہنے کا فن جانتے تھے اور صحیح معنی میں قناعت کی قدر سے واقف تھے۔ انھوں نے مختلف اخبارات، رسائل کی ادارتی ذمے داریاں نبھائیں۔ اگرچہ ادارت ان کی مجبوری تھی وہ لاولد تھے لیکن کئی نفوس کی کفالت کی ذمے داری انھوں نے اپنے سر لے رکھی تھی۔ اس مجبوری کے باعث ان کا استحصال بھی ہوا۔ انھوں نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ کام کیا۔

مخمور سعیدی اہم اور ایک اچھے شاعر تھے ان کا شمار جدید شعرا کی اس نسل سے تھا جو 1960 کے بعد پروان چڑھی تھی ان کے ادبی سفر میں کئی صنفی مراحل آئے۔ ابتدا میں غزل پر زیادہ توجہ رہی پھر آزاد نظم کے مقابلے میں معریٰ نظم زیادہ پسند آئی۔ ان کی نظموں میں مجید امجد کا اثر صاف طور پر دیکھا جاسکتا ہے ان کی نظم 'پرانا شہر' معریٰ ہونے کے باوجود آج بھی اپنی تازگی کا احساس دلاتی ہے:

مہر بہ لب ویران دریچے، دروازے سنسان
دو پہاڑوں کی چوٹی پر شاہی گورستان
نیم کی شاخوں میں الجھی ہے کنکوے کی کانپ
دیواروں پر رینگ رہا ہے شکستگی کا سانپ

مخمور سعیدی کی پہلی نظم بارہ سال کی عمر میں ماہنامہ 'جمالستان' دہلی کے سال نامہ 1950 میں شائع ہوئی تھی۔ ابتدا میں مخمور سعیدی کثرت سے نظمیں کہتے تھے لیکن جب ان کے استاد بسمل سعیدی نے غزل کی افادیت اور اہمیت سمجھائی تو وہ غزل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے رباعیاں، قطعات اور دوہے لکھے ہیں ان کے ایک درجن شعری مجموعے شائع ہوکر مقبول عام ہوئے ان میں 'گفتنی' (1960)، سیہ بر سفید (1969)، آواز کا جسم (1972)، سب رنگ (1975)، واحد متکلم (1979)، آتے جاتے لمحوں کی صدا (1979)، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا (1983)، دیوار و در کے درمیان (1994)، عمر گزشتہ کا حساب 2000، راستہ اور میں 2003، اور پیڑ گرتا ہوا، گھر کہیں گم ہوگیا، یہ دونوں دیوناگری خط میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کی کتاب 'راستہ اور میں' پر 2006 میں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا۔ ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کے علاوہ آپ کو فراق سمان، قاضی عبدالودود، ایوارڈ، محمود شیرانی ایوارڈ، اور اس کے علاوہ دلی، بہار، اترپردیش اور راجستھان اردو اکادمیوں کے انعامات سے نوازا گیا۔ مخمور سعیدی نے نثر بھی بہت اچھی لکھی ہے انھوں نے کئی نثری کتابیں اردو والوں کی نذر کی جن میں میرے عہد کی صدائیں، بازدید، داغ دہلوی، اور 1857 کی کہانی غالب کی زبانی وغیرہ۔ انھوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے بھی کیے اور دو ناول 'مرجانی' اور 'سفر تمام ہوا' بھی تخلیق کیے۔

مخمور سعیدی نے تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور ہر فن کار کی طرح ان کی زندگی نشیب وفراز اور مسرت و غم سے عبارت رہی۔ حالانکہ ذاتی گفتگو میں بہت کم اپنی زندگی کے راز کا انکشاف کرتے تھے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کثرتِ داغِ مفارقت اور غمِ روزگار نے ان کی زندگی کو المناک داستان میں تبدیل کردیا تھا۔ ان المناکیوں کا احساس ان کی بعض غزلوں سے بخوبی ہوجاتا ہے۔ مخمور سعیدی نے حج کرنے کے بعد مے نوشی ترک کردی تھی۔ آخر ایام میں ان کی صحت زیادہ خراب نہیں تھی لیکن موت کی سرگوشی ان کو صاف محسوس ہورہی تھی۔ کچھ غزلیں تو اپنی بیٹی کی یاد میں کہی تھیں جن میں یہ احساس بہت نمایاں تھا:

قیامت اس پہ جو گزری گزر گئی مخمور
کسی سے کچھ نہ کہا گھٹ کے مرگیا اک شخص

بہت گھٹن اس حصار میں ہے، حدِ انا سے گزر نہ جاؤں
میں جسم وجاں کی کشش سے نکلوں، خلا میں پرواز کرنہ جاؤں

ان اشعار میں سفرِ آخرت کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ عجیب بات تو یہ ہے کہ یہ اشعار اور آخری سفر سے متعلق تمام اشعار ان کے آخری مجموعہ کلام 'دیوار و در کے درمیاں' میں ہیں۔ اس مجموعے سے قبل ان کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں ایک بھرپور زندگی نظر آتی ہے۔ مخمور سعیدی کو کوئی روشن ضمیر صوفی بزرگ تو نہیں کہا جاسکتا کہ ان کو اپنی موت کی خبر پہلے ہی ہوچکی تھی لیکن ان کے آخری دور کی غزلیہ شاعری میں بار بار آخری سفر اور موت کا ذکر ملتا ہے اور کہیں نہ کہیں ان کے لاشعور میں پیوست 'موت' کی عکاسی کرتا ہے:

زندگی میرے لیے قرض مرے خوابوں کا
سوچتا ہوں کبھی یہ قرض ادا بھی ہوگا

مخمور سعیدی کلاسیکی شاعر نہیں ہیں جب کہ کلاسیکیت ان کی شعری سرشت کا حصہ ہے۔ وہ ترقی پسندی کے قائل بھی نہیں لیکن ایک حد تک ان کو بلند آہنگی، قطعیت، اور بیانیہ انداز پسند ہے۔ وہ ایک غیر جدید شاعر بھی نہیں مگر جدیدیت کو بعض موضوعات تک محدود رکھنا اور اظہار کو ابہام کے پردے میں مستور رکھنے کے قائل نہیں۔ یہ متضاد خصوصیات و کیفیات ان کو اجتماع ضدین کا شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔

مخمور یہ دنیا وہ رسد گاہِ اجل ہے
زندہ ہے یہاں کوئی تو مرنے کے لیے ہے

جیسا کہ میں پہلے ہی ذکر کر چکا ہوں کہ مخمور سعیدی نے تمام اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن ان کا خاص میدان اردو غزل ہے۔ غزل میں ان کا فن پورے کمال کو پہنچا ہوا ہے۔ ان کا اولین مجموعہ کلام 'گفتنی' اردو کی روایتی غزل کا ایک نادر نمونہ ہے۔ اس دور کے کلام میں اگرچہ وہ تازہ کاری نہیں ہے جو بعد کے کلام میں نظر آئی ہے۔ لیکن 'گفتنی' کی غزلوں میں ان کی انفرادیت ہر جگہ نظر آتی ہے۔ ابتدائی دور میں وہ روایتی کلاسیکی انداز کی طویل غزلیں لکھتے رہے اور ان پر فراق، جگر اور فیض کے اثرات نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں چند اشعار:

محبت ایک لحن بے صدا ہے بزم ہستی میں
جسے محسوس کر سکتا ہے کوئی سن نہیں سکتا

بڑھا دیا ہے امیروں کی خستہ حالی نے
قفس سے تا بہ چمن ورنہ فاصلہ کم ہے

مخمور سعیدی کی غزلیں ارتقا کے مراحل سے گزری ہیں۔ ان کے تمام مجموعہ کلام گفتنی، سیر بر سفید، آواز کا جسم، واحد متکلم، آتے جاتے لمحوں کی صدا، بانس کے جنگلوں سے گزرتی ہوا اور دیوار و در کے درمیاں، میں فنی ارتقا بہت واضح ہے۔ بعض عصری سماجی و معاشی تلخیاں ضرور ان کی غزلوں میں در آئی ہیں۔ لیکن ان کی غزلیں کسی بھی طرح ترقی پسند غزلیں نہیں کہی جا سکتیں حالانکہ بعض اشعار میں سماجی کرب ضرور دکھائی پڑتا ہے:

سرخیاں خون میں ڈوبی ہیں سب اخباروں کی
آج کے دن کوئی اخبار نہ دیکھا جائے

(آتے جاتے لمحوں کی صدا)

تقریر اس کی آگ تھی شعلے فضا میں بھر گئی
اور شہر سارا جل گیا تم چپ رہے ہم چپ رہے

دھوئیں میں در و بام کے کھونے کا منظر سامنے ہے
مرے شہر کے خاک ہونے کا منظر سامنے ہے

(دیوار و در کے درمیاں)

مخمور سعیدی کی غزل ان کے ہم عصروں میں منفرد مقام رکھتی ہے۔ انھوں نے قدرتی مناظر، صبح، رات، شام، پانی، پھول، جیسی ردیفیں اختیار کر کے اور قدرتی حسن کو اپنے تجربوں میں شامل کر کے جدید غزل کے مجموعی رنگ سے ممتاز کر لیا ہے۔ اتنی بڑی تعداد میں فطری مناظر کو اپنے اندر جذب کر کے ان کی غزلیں اپنی انفرادیت کی تشکیل کرتی ہیں۔ مخمور سعیدی کی غزلوں کا سرمایہ اتنا ہے کہ قاری اپنی پسند اور شعور کے مطابق اشعار برآمد کر سکتا ہے وہ گھر، دل اور تنہائی کے شاعر ہیں۔ لفظ دل کے معنی ہر جگہ الگ الگ ہوتے ہیں۔

اس طرح مخمور سعیدی کی غزلوں میں دل کے بہت سے معنی برآمد ہوتے ہیں:

دردِ آیاتِ دل آسان نہیں کچھ یارو
پڑھ کے دیکھا یہ وظیفہ بھی جلالی نکلا

بے دلی کے اس سفر میں آج بھی
ہر قدم پر ہم کو یاد آتا ہے دل

نئی غزل کے نام پر جو افراط و تفریط کی گئی مخمور سعیدی کی غزل ان لایعنی تجربوں سے محفوظ رہی۔ مخمور سعیدی نئے ہوتے ہوئے بھی قدیم ہیں۔ ان کی غزل اردو غزل کی اس روایت سے کہیں رشتہ توڑتی نظر نہیں آتی۔ جسے خلیل الرحمن اعظمی نے 'طریقہ راسخ' کا نام دیا تھا۔ مجموعی طور پر مخمور سعیدی کی غزل تمام خوبیوں سے عبارت ہے۔

مخمور سعیدی شعوری طور پر زبان کی صحت اور سلامتی کا اپنے ہم عصر شاعروں سے زیادہ خیال رکھتے تھے۔ ٹھیک اسی طرح وہ فن شعر کے روایتی اصول و ضوابط پر بھی گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اردو زبان کا ایک تہذیبی و ثقافتی پس منظر بھی ہے اسی میں اردو زبان و ادب کے لطیف پہلو اور آب و رنگ اچھی طرح کھل کر سامنے آتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ہند ایرانی ثقافت سے مانوس ہونے کے علاوہ فارسی زبان و ادب سے بھی کسی قدر واقفیت بہت مددگار ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں مخمور سعیدی کی خوش قسمتی ہے کہ اس دور میں جو ذہن و فکر کی نشو و نما کا زمانہ ہے۔ یہ ماحول بھی میسر آیا۔ ان کو فارسی زبان پر عبور حاصل تھا اور فارسی اساتذہ کے کلام پر بھی ان کی نظر گہری تھی۔ ان چیزوں کا عکس کہیں کہیں ان کی شاعری میں بھی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ مخمور سعیدی مشرقی شعری روایت کو پسند کرتے تھے مگر اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ وہ کسی ندرت و جدت کے مخالف تھے۔ ان کا کلام قدیم و جدید کے خوش گوار امتزاج کا دل پسند نمونہ ہے۔ انھوں نے اعتدال کو قائم رکھا ہے۔ اس کی بہترین مثال ان کے مجموعۂ کلام 'راستہ اور میں' کی غزلیں، نظمیں، رباعیات اور قطعات ہیں۔ اس مجموعے کی ہر صنف میں کلاسیکی روایت کے احترام کے ساتھ ان کی تازہ کاری کی بھی شہادت ملتی ہے۔

مخمور سعیدی بنیادی طور پر غزل کے شاعر سمجھے اور مانے جاتے ہیں مگر سچ تو یہ ہے کہ وہ ہر صنف پر قادر تھے۔ انھوں نے نظمیں بھی کافی تعداد میں کہی ہیں۔ جنھیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس نکتے سے واقف تھے کہ کون سا خیال نظم کے جامے کا تقاضا کرتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظیات کا ذخیرہ ان کی خصوصیات میں شامل ہے۔ ان کے پاس الفاظ کا ایک ذخیرہ موجود تھا جس سے وہ اپنے مافی الضمیر کو بہت آسانی سے مناسب الفاظ میں ادا کر دیتے تھے۔ انھوں نے بعض نئی علامتیں اور رموز بھی بڑی چابک دستی سے استعمال کیے ہیں:

کتنی دیواریں اٹھی ہیں ایک گھر کے درمیاں
گھر کہیں گم ہو گیا دیوار و در کے درمیاں

مخمور سعیدی کے موضوعات میں بھی بڑا تنوع پایا جاتا ہے ان میں کچھ موضوعات تو وہ ہیں جو سیاسی بحران، معاشی زبوں حالی، انسان اور انسانیت کی ناقدری، اقدار کی شکست و ریخت اور سماجی ابتری سے پیدا ہوئے ہیں۔ بعض موضوعات ایسے ہیں جن میں ان کا اپنا ذہنی کرب جھلک رہا ہے۔ موضوعات کا یہ حصہ خاص طور پر پڑھنے والے کے دل و دماغ پر براہ راست اثر کرتا ہے۔

مخمور سعیدی کی شاعری درد آمیز اور غم انگیز ضرور ہے مگر وہ یہ پیغام بھی دیتی ہے کہ زندہ رہنے کا عزم اور حوصلہ ان سب نامساعد حالات سے زیادہ توانا ہوتا ہے:

جانا تو مرا طے ہے مگر یہ نہیں معلوم
اس شہر سے میں آج چلا جاؤں کہ کل جاؤں

مجموعی طور پر دیکھا جائے تو مخمور سعیدی جدید دور کے ایک بلند پایہ شاعر ہیں اور اردو ادب میں ان کا مقام قابل ستائش ہے:

ایک سورج تھا کہ تاروں کے گھرانے سے اٹھا
آنکھیں حیران ہیں کیا شخص زمانے سے اٹھا

Ram Parsad Meena, Research Scholar, Delhi University, Delhi - 110007

ادارہ

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی

یاس یگانہ چنگیزی اردو کے سب سے متنازعہ شعرا میں ایک تھے۔ ان کے حامیوں اور مخالفوں دونوں نے انھیں 'غالب شکن' گردانا جب کہ وہ غالب کے نہیں بلکہ غالب پرستی کے مخالف تھے۔ یگانہ اردو شاعری میں بغاوت کی وہ آواز تھے جس کا لہجہ بعد میں شاد عارفی، منموہن تلخ، شجاع خاور اور مظفر حنفی تک پہنچا۔

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی ان کا پورا نام تھا اور تخلص 'یاس' اور 'یگانہ' رکھتے تھے۔ انھیں اپنے یگانہ اور یکتا ہونے کا احساس تھا۔ وہ خود ہی کہتے ہیں:

کلام یاس سے دنیا میں ایک آگ لگی
یہ کون حضرت آتش کا ہم زباں نکلا

یاس یگانہ کی پیدائش 17 اکتوبر 1884 کو پٹنہ میں ہوئی تھی، جو پہلے عظیم آباد کے نام سے مشہور تھا۔ یگانہ اپنی جائے پیدائش کے بارے میں خود ہی لکھتے ہیں:

''شہر عظیم آباد محلّہ مغلپورہ میرا مولد ہے، جو تیموریوں، چغتائیوں اور قزلباشوں کا مسکن تھا جہاں اعلیٰ درجے کے مہذب امرا، شرفا بستے تھے۔''

یگانہ کے والد مرزا پیارے صاحب آبائی جاگیردار تھے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق یگانہ نے اپنی ابتدائی تعلیم مغلپورہ کے مدرسے میں حاصل کی تھی اور انگریزی تعلیم کے لیے عظیم آباد کے مشہور محمڈن اینگلو عربک پٹنہ سٹی میں داخلہ لیا۔ سنہ 1903 میں کلکتہ یونیورسٹی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ یگانہ شروع ہی سے خداداد صلاحیت اور فطری ذہانت کی بنا پر ہمیشہ اعزاز و اکرام سے نوازے گئے۔ اسی فطری ذہانت نے انھیں مذاق شعر و سخن کی طرف مائل کیا۔ یگانہ بیتاب عظیم آبادی سے شرف تلمذ ہوئے۔

1904 میں کلکتہ کا سفر کیا اور کچھ دنوں تک ٹیا برج میں مقیم رہے۔ 1906 میں یگانہ لکھنؤ پہنچے۔ 1926 سے 1928 تک لاہور میں قیام کیا۔ اس کے علاوہ اٹاوہ اور علی گڑھ کا سفر کیا۔ لیکن جلد ہی حیدرآباد کا رخ کیا وہاں مہاراجہ کشن پرشاد کے دربار سے کچھ عرصے تک وابستہ رہے۔ نواب بشیر یار جنگ یگانہ کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے۔ انھوں نے یگانہ کو سب رجسٹراری کی خدمت پر عثمان آباد میں معمور کیا جہاں 1926 سے 1932 تک یاس کی مندرجہ ذیل تصنیفات ہیں: نشتر یاس، چراغ سخن، آیات وجدانی، غالب شکن ترانہ، گنجینہ، شہرت کاذبہ المعروف بہ خرافات عزیز۔

یاس یگانہ اردو شاعری میں ایک منفرد لب و لہجے کے شاعر مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے خصوصاً اردو غزل میں فرسودہ روایت پرستی اور بے جا غالب پرستی کے خلاف آواز بلند کی جس نے اردو غزل میں بدمذاقی کا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ یگانہ بہت حد تک اردو غزل میں صحت مند فضا بنانے اور اعلیٰ ادبی ذوق فروغ دینے میں کامیاب رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ غالب کی شاعری کی مخالفت کر رہے تھے۔ وہ بذات خود غالب کی شاعرانہ عظمت کے معترف تھے۔ انھوں نے اپنی کتاب 'غالب شکن' میں اس امر کا اعتراف کیا ہے:

''غالب کے کمالات کا بھی معترف مگر اسی حد تک جتنا میرا ضمیر اجازت دیتا ہے۔'' (غالب شکن یاس یگانہ چنگیزی)

یگانہ کا انتقال 4 فروری 1956 کو لکھنؤ میں ہوا۔ وفات کے وقت ان کی عمر 73 سال تھی۔ ان کے روضے کو ان کی بیٹی مریم جہاں نے پختہ صورت عطا کی۔ جن پر ان کا یہ شعر لکھا ہوا ہے:

خودپرستی کہیے یا حق پرستی کہیے
آہ کس دن کے لیے ناحق پرستی کہیے

یگانہ کے ساتھ یہ بہت بڑی زیادتی ہوگی کہ انھیں غالب شکن کے طور پر یاد کیا جائے۔ انھوں نے اردو شاعری میں جن باتوں کی نشاندہی کی ہیں ہمیں ان کی شاعری کو اسی تناظر میں دیکھنا چاہیے۔ ڈاکٹر ایم عظیم اللہ کہتے ہیں کہ:

''یگانہ سے متعلق یہاں یہ امر بحث طلب نہیں ہے کہ وہ ایک غالب شکن کے طور پر یاد کیے جاتے ہیں بلکہ یہ بات غور طلب ہے کہ ان میں ایک انفرادیت، بانکپن اور نئے تیور ہیں اور ان کی غزلوں میں زندگی کی حرکت و توانائی اور روایت پرستی کے خلاف بغاوت ملتی ہے.... یگانہ کی شاعری اسی روح پرستی کے خلاف بغاوت ہے۔'' (اردو شاعری کی نئی جہتیں، ص 117)

یگانہ اپنی مشہور زمانہ کتاب 'غالب شکن' میں اس حقیقت کا اعتراف کچھ یوں کرتے ہیں:

''مجھ سے زیادہ، غالب پر سخت کلامی یا بداخلاقی کا الزام کھیپ سکتا ہے۔ اور سب سے زیادہ افسوس ناک امر یہ ہے کہ غالب پرستوں نے تمام اساتذہ ماضی و حال کا حق تلف کر کے غالب کو دے دیا ہے۔ مگر میں نے ہرگز غالب کا حق تلف نہیں کیا۔ ان کو اردو کا مایہ ناز شاعر مانتا ہوں۔ ہاں کھری کھری سنادی جس کے مخاطب غالب نہیں ہیں بلکہ غالب پرست۔''

(غالب شکن، دوآتشہ مکتوبات یگانہ، 1935، ص 34)

یگانہ اردو غزل میں نئے آہنگ اور تب و تاب کے ساتھ رونما ہوئے ہیں۔ یہ ان کا منفرد انداز ہے جس پر کسی اور شاعر کا گمان نہیں گزرتا۔ انھوں نے غزل کو ایک نئی سمت عطا کی بقول سیدہ جعفر:

''یگانہ نے غزل کے موضوعات کے دائرے کو اپنی نئی جہت اور وسعت سے آشنا کیا اور ایسے مضامین باندھے جو پہلی بار اپنی حقیقت پسندانہ کیفیت کے ساتھ غزل کے افق پر نمودار ہوئے۔'' (تاریخ ادب اردو عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک، جلد چہارم، ص 244)

یگانہ کی شاعری کو مجنوں گورکھپوری نے 'مردانگی' سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی زندگی پوری طرح اذیت اور آزمائشوں سے عبارت تھی، تاہم ان کے کلام میں زندگی سے بے رُخی، بیزاری یا قنوطیت کا شائبہ نہیں ملتا بلکہ حالات کے سامنے ڈٹے رہنے اور اس سے نبرد آزما کا ولولہ ملتا ہے:

مجھے اے خدا آخر کسی کو منھ دکھانا ہے
بہانہ کر کے تنہا پار اتر جانا نہیں آتا
موت مانگی تھی خدائی تو نہیں مانگی تھی
لے دعا کر چکے اب ترک دعا کرتے ہیں

باقر مہدی نے اپنی کتاب آگہی و بے باکی کے صفحہ 102 میں یگانہ کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''میر و غالب کے بعد تیرا نام جو سب سے زیادہ احترام اور اہمیت کا مالک ہے وہ یگانہ کا ہے۔''

(بحوالہ تاریخ ادب اردو، عہد میر سے ترقی پسند تحریک تک، جلد چہارم)

یاس یگانہ چنگیزی

مرزا واجد حسین یاس یگانہ چنگیزی

❖

ہنوز زندگیِ تلخ کا مزہ نہ ملا
کمالِ صبر ملا، صبر آزما نہ ملا
مری بہار وخزاں جس کے اختیار میں ہے
مزاج اُس دلِ بے اختیار کا نہ ملا
جواب کیا وہی آوازِ بازگشت آئی
قفس میں نالۂ جاں کاہ کا مزہ نہ ملا
اُمیدوارِ رہائی قفس بدوش چلے
جہاں اشارۂ توفیقِ غائبانہ ملا
ہوا کے دوش پہ جاتا ہے کاروانِ نفس
عدم کی راہ میں کوئی پیادہ پا نہ ملا
ہزار ہاتھ اُسی جانب ہے منزلِ مقصود
دلیلِ راہ کا غم کیا، ملا ملا نہ ملا
بس ایک نقطۂ فرضی کا نام ہے کعبہ
کسی کو مرکزِ تحقیق کا پتا نہ ملا
اُمید و بیم نے مارا مجھے دوراہے پر
کہاں کے دیر وحرم، گھر کا راستا نہ ملا
خوشا نصیب، جسے فیضِ عشقِ شورانگیز
بقدرِ ظرف ملا، ظرف کے سوا نہ ملا
سمجھ میں آگیا جب عذرِ فطرتِ مجبور
گناہ گارِ ازل کو نیا بہانہ ملا
بجز ارادہ پرستی خدا کو کیا جانے
وہ بدنصیب جسے بختِ نارسا نہ ملا
نگاہِ یاس سے ثابت ہے سعیِ لاحاصل
خدا کا ذکر تو، کیا بندۂ خدا نہ ملا

❖

بیٹھا ہوں پاؤں توڑ کے، تدبیر دیکھنا
منزل قدم سے لپٹی ہے تقدیر دیکھنا
پہنا دیا ہے طوقِ غلامی تو، ایک دن
میری طرف بھی مالکِ تقدیر دیکھنا
مجھ ناتواں کا صبر تو کیا آزماؤ گے
راس آئے تم کو جوہرِ شمشیر دیکھنا
آوازے مجھ پہ کستے ہیں پھر بندگانِ عشق
پڑ جائے پھر نہ پاؤں میں زنجیر دیکھنا
مردوں سے شرط باندھ کے سوئی ہے اپنی موت
ہاں دیکھنا ذرا فلکِ پیر دیکھنا
ہوش اُڑ نہ جائیں صنعتِ بہزاد دیکھ کر
آئینہ رکھ کے سامنے تصویر دیکھنا
چونکے تو چشمِ شوق میں عالم سیاہ تھا
خوابِ نظر فریب کی تعبیر دیکھنا
پروانے کرچکے تھے سرانجامِ خودکشی
فانوس آڑے آگیا، تقدیر دیکھنا
شاید خدانخواستہ آنکھیں دغا کریں
اچھا نہیں نوشتۂ تقدیر دیکھنا
اصلاح کی مجال نہیں ہے تو کیا ضرور
ہے ربطیِ نوشتۂ تقدیر دیکھنا
ہر خوب و زشت آپ ہی اپنی مثال ہے
حدِ کمالِ کاتبِ تقدیر دیکھنا
بادِ مراد چل چکی لنگر اٹھاؤ یاس
پھر آگے بڑھ کے خوبیِ تقدیر دیکھنا

❖

چراغِ زیست بجھا دل سے اک دھواں نکلا
لگا کے آگ مرے گھر سے میہماں نکلا
دل اپنا خاک تھا پھر خاک کو جلانا کیا؟
نہ کوئی شعلہ اٹھا اور نہ کچھ دھواں نکلا
سنیں گے چھیڑ کے افسانۂ دلِ مرحوم
ادھر سے ملکِ عدم کا جو کارواں نکلا
تڑپ کے آبلہ پا اٹھ کھڑے ہوئے آخر
تلاشِ یار میں جب کوئی کارواں نکلا
لہو لگا کے شہیدوں میں ہوگئے داخل
ہوس تو نکلی مگر حوصلہ کہاں نکلا
حریمِ ناز میں شاید کسی کو دخل نہیں
دلِ عزیز بھی ناخواندہ میہماں نکلا
نہاں تھا خانۂ دل ہی میں شاہدِ مقصود
جو بے نشاں تھا وہ دیوار درمیاں نکلا
ہے فنِ عشق کا استاد بس دلِ وحشی
مریضِ غم کا یہی اک مزاج داں نکلا
لگا ہے دل کو اب انجامِ کار کا کھٹکا
بہارِ گل سے بھی اک پہلوئے خزاں نکلا
زمانہ پھر گیا چلنے لگی ہوا الٹی
چمن کو آگ لگا کر جو باغباں نکلا
ہمارے صبر کی کھاتے ہیں اب قسم اغیار
جفاکشی کا مزہ بعدِ امتحاں نکلا
خوشی سے ہوگئے بدخواہ میرے شادیِ مرگ
کفن پہن کے جو میں گھر سے ناگہاں نکلا
اجل سے بڑھ کے محافظ نہیں کوئی اپنا
خدا کی شان کہ دشمن نگاہ باں نکلا
دکھایا گورِ سکندر نے بڑھ کے آئینہ
جو سر اٹھا کے کوئی زیرِ آسماں نکلا
لحد سے بڑھ کے نہیں کوئی گوشۂ راحت
قیامت آئی جو اِس گھر سے میہماں نکلا
اب اپنی روح ہے اور سیرِ عالمِ بالا
کنویں سے یوسفِ گم کردہ کارواں نکلا
کلامِ یاس سے دنیا میں پھر اک آگ لگی
یہ کون حضرتِ آتش کا ہم زباں نکلا

❖

بنام یگانہ

خودی کا نشہ چڑھا آپ میں رہا نہ گیا
خدا بنے تھے یگانہ مگر بنا نہ گیا
پیامِ زیرِ لب ایسا کہ کچھ سنا نہ گیا
اشارہ پاتے ہی انگڑائی لی رہا نہ گیا
ہنسی میں وعدۂ فردا کو ٹالنے والو
لو دیکھ لو وہی 'کل' 'آج' بن کے آ نہ گیا؟
گناہِ زندہ دلی کہیے یا دل آزاری
کسی پہ ہنس لیے اتنا کہ پھر ہنسا نہ گیا
پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا
سمجھتے کیا تھے؟ مگر سنتے تھے ترانۂ درد
سمجھ میں آنے لگا جب تو پھر سنا نہ گیا
کروں تو کس سے کروں دردِ نارسا کا گلہ؟
کہ مجھ کو لے کے دلِ دوست میں سما نہ گیا!

بتوں کو دیکھ کے سب نے خدا کو پہچانا
خدا کے گھر تو کوئی بندۂ خدا نہ گیا
کرشن کا ہوں پجاری علی کا بندہ ہوں
یگانہ شانِ خدا دیکھ کر رہا نہ گیا

❖

کیوں کسی سے وفا کرے کوئی
دل نہ مانے تو کیا کرے کوئی
نہ دوا چاہیے مجھے نہ دعا
کاش اپنی دوا کرے کوئی
مفلسی میں مزاج شاہانہ!
کس مرض کی دوا کرے کوئی
درد ہو تو دوا بھی ممکن ہے
وہم کی کیا دوا کرے کوئی
ہنس بھی لیتا ہوں اوپری دل سے
جی نہ بہلے تو کیا کرے کوئی
موت بھی آسکی نہ منھ مانگی
اور کیا التجا کرے کوئی
دردِ دل پھر کہیں نہ کروٹ لے
اب نہ چونکے خدا کرے کوئی
عشق بازی کی انتہا معلوم!
شوق سے ابتدا کرے کوئی
کوہ کن اور کیا بنا لیتا
بن کے بگڑے تو کیا کرے کوئی
اپنے دم کی ہے روشنی ساری
دیدۂ دل تو وا کرے کوئی
شمع کیا، شمع کا اجالا کیا
دن چڑھے سامنا کرے کوئی
غالب اور میرزا یگانہ کا
آج کیا فیصلہ کرے کوئی

❖

کدھر چلا ہے اِدھر ایک رات بستا جا
گرجنے والے گرجتا ہے کیا برستا جا
دکھا دے خاک کے پتلوں میں زور کتنا ہے
ہوا پہ تیر چکا، اب زمیں میں دھنستا جا
رُلا رُلا کے غریبوں کو ہنس چکا کل تک
مری طرف سے اب اپنی دَسا پہ ہنستا جا
جفائے پنجۂ خوں خوار سے جو بس نہ چلے
تو بن کے خشک نوالہ گلے میں پھنستا جا
علاجِ اہلِ حسد، زہر خندِ مردانہ
ہنسی ہنسی میں تو اِن احمقوں کو ڈستا جا
بقدرِ ذوقِ تماشائے حسن ناممکن
ترسنے میں بھی ہے اِک کیفیت، ترستا جا
تو آپ اپنی ہے شمشیر آپ اپنی سپر
یگانہ باگ اٹھا اپنے بل پہ کستا جا

❖

حاصلِ فکرِ نارسا کیا ہے
تو خدا بن گیا، برا کیا ہے
کیسے کیسے خدا بنا ڈالے
کھیل بندے کا ہے، خدا کیا ہے
آئی کو ٹال دے جبھی جانیں
دم بخود ہے تو پھر خدا کیا ہے
دل ہے اپنی جگہ خدا اپنا
ہم غریبوں کا آسرا کیا ہے
دردِ دل کی کوئی دوا نہ دعا
''یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے''
حسن کے ہتھ کھنڈے ارے توبہ!
درد کیا چیز ہے دوا کیا ہے
لد گئی کل کی بات کل کے ساتھ
یاد آئے تو اب مزہ کیا ہے
نہ سنا ہوگا راگ فطرت کا
جانتے ہو مری صدا کیا ہے
وہی نیرنگیِ طلسم ہوا
موج کیا اور بلبلا کیا ہے
دیدۂ دل سے دیکھ اپنی طرف
چشم حیراں، تجھے ہوا کیا ہے
نور ہی نور ہے، کہاں کا ظہور
اٹھ گیا پردہ اب رہا کیا ہے
رہنے دے حسن کا ڈھکا پردہ
وقت بے وقت جھانکتا کیا ہے
عکس میرا بھی پڑگیا ناگاہ
ارے آئینے کی خطا کیا ہے
وقت کی بات اور وقت کے ہاتھ
سہو کیا چیز ہے، خطا کیا ہے
زہر میٹھا نہ ہو تو زہر ہی کیا؟
دوست جب دے تو پوچھنا کیا ہے
کیا ٹلے گی مشیتِ ازلی؟
اک تسلی سی ہے دعا کیا ہے
اپنے ہی عکس پر ہو چیں بجبیں
کیوں یگانہ یہ ماجرا کیا ہے

❖

آہ یہ بندۂ غریب، آپ سے لو لگائے کیوں
آ نہ سکے جو وقت پر، وقت پہ یاد آئے کیوں
دوست کے انتظار میں دوست کو نیند آئے کیوں
بوئے اُمید پاتے ہی رنگ بدل نہ جائے کیوں
مژدۂ مرگِ نوجواں آج ہی کیا ضرور تھا؟
آج تو دن ہے عید کا، آج قیامت آئے کیوں
کلمہ پڑھوں تو کیوں پڑھوں، سب کی نظر پہ کیوں چڑھوں؟
یادِ خدا تو دل سے ہے، دل سے زباں تک آئے کیوں
لاکھ عتاب کا جواب، ایک خلوصِ بندگی
چینِ جبینِ دوست کو دھیان میں کوئی لائے کیوں
اپنے خیال میں ہے خوش، دل کی ضدیں تو دیکھیے
آپ سے دور کیوں رہے، آپ کے پاس جائے کیوں
خواب و خیال سے ہو پاک، نیند وہی ہے میٹھی نیند
نقشِ خیال نیک و بد نیند میں رنگ لائے کیوں
عیب سے خالی کون ہے؟ حسن کے دل سے پوچھیے
اہل نظر کے سامنے آنکھ جھپک نہ جائے کیوں
منھ جو ذرا اُتر گیا اور بھی گل میں گل کھلا
یوں ہی بقدرِ ذائقہ، حسن بھی غم نہ کھائے کیوں
دید کی التجا کروں؟ تشنہ ہی کیوں نہ جان دوں؟
پردۂ ناز خود اٹھے، دستِ دعا اٹھائے کیوں
بھول بھی جا، بھلا بھی دے، یاد نہ کر، خدا کو مان
تیری زباں پہ بار بار نامِ یگانہ آئے کیوں

❖

دل ایک ہی فتنہ ہے لیکن بیدار نہیں تو کچھ بھی نہیں
ہاتھ میں کس بل لاکھ سہی، تلوار نہیں تو کچھ بھی نہیں
اپنی ڈفلی اپنا راگ، اپنی دوڑ ہے اپنی بھاگ
کہنے میں بات آتی ہے سردار نہیں تو کچھ بھی نہیں
کیا کیا چوٹیں لیتا ہوں اور کیا کیا خالی دیتا ہوں
دیکھنے والے پسِ پردہ سرکار نہیں تو کچھ بھی نہیں
چپکے چپکے ریشہ دوانی، یہ بھی کوئی پینتی ہے؟
للکار نہیں تو کچھ بھی نہیں، جھنکار نہیں تو کچھ بھی نہیں
حجام ہو چاہے تلوریا اک بال تو ٹیڑھا کر دیکھے
اوزار نہیں تو کچھ بھی نہیں، ہتھیار نہیں تو کچھ بھی نہیں
کلمہ پڑھ کے ایسے ویسے کتنے مسلماں بن بیٹھے
بات یہ کچھ دشوار نہیں، دشوار نہیں تو کچھ بھی نہیں
محرابوں میں سجدہ واجب، حسن کے آگے سجدہ حرام
ایسے گنہ گاروں پہ خدا کی مار نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل سے خدا کا نام لیے جا، کام کیے جا دنیا کا
کافر ہو، دیں دار ہو، دنیا دار نہیں تو کچھ بھی نہیں

جتنے کھنچتے جاؤ گے اتنا ہی لپٹتا جاؤں گا
انکار کی لذت، آہا ہا، انکار نہیں تو کچھ بھی نہیں

کہو تو تنہا جی کے دکھا دوں دست بدل یا دست بکار
ہاں مگر اپنے گوشۂ دل میں یار نہیں تو کچھ بھی نہیں

ایک جھلک ہی دکھلا دے تو دور سے جھک کے سلام کروں
اُس پار جگت کے ہوگا کوئی اِس پار نہیں تو کچھ بھی نہیں

دل شکنی یا بُت شکنی تو یاد ہے اب تک یاروں کو
دستِ یگانہ تیرے گلے کا ہار نہیں تو کچھ بھی نہیں

❖

ارے واہ صلح ہوئی تو کیا وہی آگ دل میں بھری رہی
وہی خو رہی، وہی بو رہی، وہی فطرتِ بشری رہی

وہی بندگی، وہی صاحبی، وہی راج اور وہی راج ہٹ
نہ جوابِ تلخ کا حوصلہ، نہ مجالِ فتنہ گری رہی

وہی نیستی، وہی شامتیں تو کہاں کی عید، کہاں کی دید؟
شبِ غم کی صبح ہوئی تو کیا وہی غفلتِ سحری رہی

کوئی رازِ درد چھپائے کیا کہ یہ دردِ دل ہے بری بلا
دمِ واپسیں بھی زبان کو وہی فکرِ پردہ دری رہی

نگہِ کرم کا سوال کیا ہے، عتاب کی بھی خبر نہیں
ترے سنگِ در پہ جبینِ شوق دھری رہی سو دھری رہی

نہ خداؤں کا نہ خدا کا ڈر اِسے عیب جانیے یا ہنر
وہی بات آئی زبان پر جو نظر پہ چڑھ کے کھری رہی

یہ بلائے حسن کہاں نہیں مگر اپنے واسطے قحطِ حسن
تمھیں کیا بتائیں نظر کے ساتھ جو زحمتِ نظری رہی

کوئی چشمِ شوق کے سامنے ہو تو سوجھتی ہے نئی نئی
ترے دم قدم کی بہار تھی کہ طبیعت اپنی ہری رہی

کوئی میری آنکھ سے دیکھتا وہ زوالِ دولتِ رنگ و بو
کہ بہارِ حسن کی شام کو بھی عجیب جلوہ گری رہی

کوئی آرزو تھی چھپی ہوئی، کوئی اقتضا تھا دبا ہوا
دلِ مضطرب میں جبھی تو اِک خلشِ شکستہ پری رہی

وہ گناہ گار ہمیں تو ہیں کہ جمالِ پاک کے سامنے
نظر اٹھتے اٹھتے جھپک گئی، ہوسِ گناہ دھری رہی

عجب اتفاق، بھڑک اٹھی وہ نشے میں دوست کی دشمنی
ارے اِس حقیقتِ تلخ سے مجھے کیوں نہ بے خبری رہی

یہ وہ دل ہے جس میں سوائے حق کسی دوسرے کا گزر نہیں
وہی ایک ذاتِ یگانہ بس، وہی ایک جلوہ گری رہی

رباعیات

فطرت کچھ اور ہے خدا ہے کچھ اور
بالغ نظروں کا منتہا ہے کچھ اور
جس کے دم سے ہے دل کی دنیا روشن
اُس جاگتی جوت کے سوا ہے کچھ اور

کس منہ سے کہے کوئی کہ تو ایسا ہے
ویسا تو نہیں ایک بھی، تو جیسا ہے
ہاں ہے تو سہی مگر نہ جانے کیا ہے
ایسا نہیں، ویسا نہیں، پھر کیسا ہے؟

تازہ مژدہ کوئی سنانا ہے تو آ
اجڑے گھر کو مرے بسانا ہے تو آ
پھر بند نہ ہو جائے کہیں دل کا کواڑ
ایسے میں سویرا ہے، آنا ہے تو آ

ان عقل کے اندھوں میں ہے یہ غُل کیسا؟
میں جز ہوں وہ کل ہے، یہ تعقل کیسا؟
کل ہی کل ہے کہاں کا جُز کیسا جز
جُز کل سے الگ ہوا تو پھر کل کیسا؟

ترسی ہوئی آنکھوں کا تقاضا ہے تو کیا
پھوٹی ہوئی آنکھوں کی تمنا ہے تو کیا
اترے گا کبھی نہ حسنِ بے رنگ کا عکس
روشن ہے تو کیا، آئینہ اندھا ہے تو کیا

منزل کی جستجو میں گم رہتا ہوں
ہنگامۂ آرزو میں گم رہتا ہوں
اُمید کا سبز باغ، اے صلِّ علیٰ
اک عالمِ رنگ و بو میں گم رہتا ہوں

دنیا میں رہ کے راست بازی کب تک
مشکل ہے کچھ آساں نہیں سیدھا مسلک
سچ بول کے کیا حسین بننا ہے تجھے
اتنا سچ بول، دال میں جیسے نمک

ممکن نہیں اندیشۂ فردا کم ہو
ہاں نشۂ غفلت ہو تو ایذا کم ہو
ٹلنے کی نہیں قیامت، اچھا نہ ٹلے
منہ پھیر لو اپنا کہ یہ دھڑکا کم ہو

کیا بھانپتا ہے بھانپنے والے باز آ
حیران ہے کیوں، ٹاپنے والے باز آ
کھنچتی جائے گی اور بھی دور سے دور
آفاق کی حد ناپنے والے باز آ

دنیا سے الگ جاکے کہیں سر پھوڑو
یا جیتے ہی جی مردوں سے ناتا جوڑو
کیوں ٹھوکریں کھانے کو پڑے ہو بیکار
بڑھنا ہے بڑھو، نہیں تو رستہ چھوڑو

نظارۂ بیدار بھی مہمل ٹھہرا
ہے ایک سے بڑھ کے ایک پردہ گہرا
افسانۂ شاہدِ حقیقت باطل
کہتا گونگا ہے اور سنتا بہرا

کیا کیجیے رام رام کرتے ہی بنی
جائز نہ سہی، یہ کام کرتے ہی بنی
چاہا تو بہت، بتوں سے منہ پھیر چلوں
جھکتے ہی بنی، سلام کرتے ہی بنی

سچی شاعری

کہاں کا چرخہ کہاں کا تکلہ — کہاں کا چوک اور کہاں کا چکلہ
خدا خدا کر، خدا خدا کر
کہاں کا گنا کہاں کا پونڈا — کہاں کی لونڈی کہاں کا لونڈا
خدا خدا کر، خدا خدا کر
کہاں کی دولت کہاں کی دنیا — کہاں کا مومن کہاں کا دُھنیا
خدا خدا کر، خدا خدا کر

ماخذ: کلیات یگانہ، تحقیق وترتیب: مشفق خواجہ، سنہ اشاعت: ستمبر 2005، ناشر: فرید بکڈپو (پرائیویٹ)، نئی دہلی

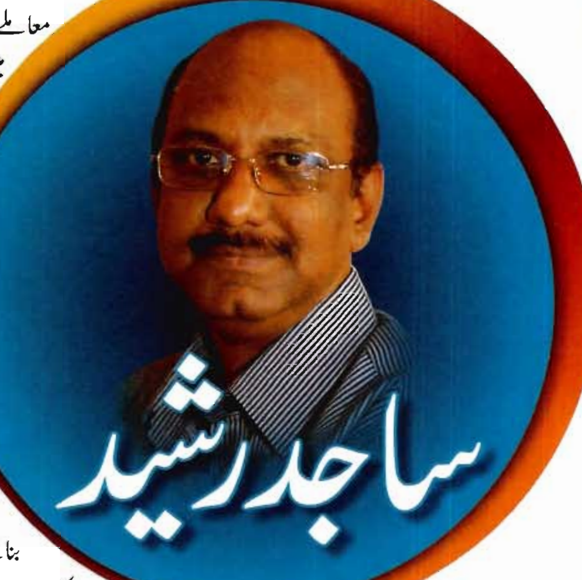

ساجد رشید

بیسویں صدی کے آخری عشرے میں اردو افسانے کے افق پر ابھرنے والے وہ منفرد تخلیق کار ہیں جو کہانیوں کا مواد اپنے اطراف کی سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی میں پھیلی ہوئی تلخیوں سے پورے تخلیقی و جمالیاتی شعور کے ساتھ اٹھاتے تھے لیکن کچھ ایسی بے باکی سے قاری کے سامنے پیش کرتے تھے کہ پڑھنے والا تلملا کر رہ جائے۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے ادبی اور سیاسی صحافت میں بھی آزادیِ اظہار، حق گوئی اور منطقی انداز فکر کے ان معیاروں کو اپنایا کہ اردو فکشن کی طرح اردو صحافت میں بھی انھیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مارکسزم ان کا نظریاتی مرکز اور سیکولرزم ان کی زندگی کا آدرش تھا۔ وہ دنیا میں ہونے والے ہر ظلم اور زیادتی کو برداشت کر سکتے تھے لیکن مذہبی تعصب، خاص طور پر اپنے مسلم ہم مذہبوں کے بعض گروہوں کے تعصب پر وہ تلملا اٹھتے تھے اور ان کی مخالفت میں ان کا قلم شمشیر برہنہ بن جاتا تھا۔ مسلمانوں کی عمومی پس ماندگی کو دیکھ کر ان کا دل کڑھتا تھا، ان کے ساتھ ہونے والی ہر ناانصافی کے خلاف وہ آواز اٹھاتے تھے، لیکن ان ہی مسلمانوں کا دم بھرنے والی فرقہ پرست جماعتوں کے رویے پر ان کا قلم آگ اگلنے لگتا تھا۔ وہ زندگی بھر اس اصول اور منطق پر کاربند رہے کہ مسلم فرقہ پرستی کے خلاف سب سے مضبوط آواز مسلمانوں کی طرف سے اور ہندو فرقہ پرستی کی مخالفت میں پہلی آواز ہندوؤں کی طرف سے اٹھنی چاہیے۔ جب تک سب فرقے اس اصول پر کاربند نہیں ہوں گے تب تک اس ملک سے فرقہ پرستی کا خاتمہ نہیں ہو سکتا۔ ملک میں خبروں کا مرکز بننے والے ہر فرقہ وارانہ معاملے پر وہ اپنے سہ ماہی ادبی رسالے 'نیا ورق' میں ایک طویل اداریہ لکھا کرتے تھے جس کا انتظار لوگوں کو اس شدت سے رہتا تھا کہ رسالہ مارکیٹ میں آتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتا۔

ساجد رشید کو مصوری کا بھی شوق تھا لیکن ان کی سیاسی سماجی اور ادبی و صحافتی مصروفیتوں کے وزن میں یہ شوق خاصا دب کر رہ گیا تھا۔ پھر بھی اپنے افسانوں کے مجموعوں اور ناولوں اور 'نیا ورق' کے سرورق بنانے سے لے کر 'نیا ورق' کے اوراق کی بلیک اینڈ وہائٹ مرقع نگاری تک، انھوں نے اپنے شوق کو کسی نہ کسی طرح جاری رکھا تھا۔ فکشن کے لیے موضوع و مواد وہ حقیقی زندگی کے حقیقی واقعات سے اٹھاتے تھے لیکن اپنے تخیل و تصورات کی بھٹی میں پگھلا کر اس حقیقی واقعے کے اُن پہلوؤں کو ہنرمندی سے سامنے لاتے تھے جو سب کی نظروں سے اوجھل رہ جاتے ہیں، مگر ساجد رشید کی فنکارانہ نظر صاف دیکھ لیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا فکشن مبنی بر حقائق ہوتے ہوئے بھی فکشن محسوس ہوتا تھا۔ ان کے افسانوں کے زیادہ تر کردار و واقعات ان بڑے شہروں یا مہانگروں کی زندگی سے آتے ہیں جنھیں میٹروسٹی کہا جاتا ہے اور جن میں ہماری معیشت، تجارت، اقتصادیات اور صنعت و حرفت سمٹتی چلی جارہی ہے۔ جدید فکشن کے نہایت اہم نقاد پروفیسر گوپی چند نارنگ اپنے مضمون 'ساجد رشید، مہانگری زیرناف اور سماجی ڈسکورس' ('ادب ساز' مطبوعہ 2008) میں لکھتے ہیں:

''ساجد رشید کی جڑیں یوپی کے قصبات میں ہیں، ان کی سائیکی میں قصباتی آرکی ٹائپ بھی ابھرتے ہیں لیکن ان کے شعور نے metropolis ممبئی (مہانگر) کی تیزی سے بدلتی ہوئی کمرشیل فضا میں آنکھ کھولی جہاں برقیاتی ترقی کی تماشا سوسائٹی میں گلوبلائزیشن کی خیرہ کردینے والی ریل پیل و صارفیت نے انسان کو بے حس بنا دیا ہے۔ نیز جھونپڑ پٹیوں اور کھولیوں کی عفونت زدہ جرائم کی دنیا جہاں انسان کی زندگی کیڑے مکوڑوں سے بھی بدتر ہے۔ بڑے میٹروپلس کی پہچان فقط آبادیوں کی ریل پیل اور تضادات سے ہی نہیں ہوتی، وہ ایک جیتا جاگتا ثقافتی وجود بھی ہوتے ہیں۔ ایسے ہر شہر کی اپنی پہچان اور اپنا کردار ہوتا ہے جو وقت کے ساتھ ساتھ نمو کرتا ہے اور منقلب بھی ہوتا رہتا ہے۔ مہانگر کے تہذیبی اور سماجی مسائل کے بارے میں متعدد لوگوں نے لکھا ہے لیکن ساجد رشید کے افسانوں میں جس طرح آج کے میٹرو کا وجود ابھرتا ہے اور جس فن کارانہ سفاکی سے انھوں نے مہانگر کے زیر ناف اور دوسرے پہلوؤں کے بارے میں بیانیہ تشکیل دیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے۔ ان کے زیادہ تر کردار حاشیے کے لوگ ہیں... ان کے یہاں دوسرے مسائل اور موضوعات پر کہانیاں بھی ہیں لیکن جس تخلیقی محویت اور رچاؤ سے انھوں نے آج کے مہانگری تضادات اور ان کے گھناؤنے پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے وہ ان سے خاص ہے۔ اس نوع کے سماجی ڈسکورس میں نفسیاتی مسائل بھی ہیں۔ جرائم پیشہ دادا گیری اور پولس کی بدکاریوں کے مرقعے بھی ہیں، مذہبی منافقت اور ریاکاری کے لاینحل تضادات بھی ہیں۔ وہ ان کی جیتی جاگتی پہچان کو پیش کرتے ہیں اور مہانگر کا وجود اور اس کا subaltern بین السطور میں سانس لیتا معلوم ہوتا ہے۔ ایسی کہانیوں میں 'زندہ درگور'، 'راکھ'، 'جنت میں محل'، 'چادر والا آدمی اور میں'، 'اندھیری گلی'، اور 'بادشاہ بیگم اور غلام' کو ضرور شامل کروں گا...''

ساجد رشید 11 مارچ 1955 کو بلرام پور یوپی کے گاؤں سگد یواہ میں پیدا ہوئے، صرف انٹر تک تعلیم حاصل کی، صحافت کو کریئر بنایا۔ 1984 میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے انھوں نے ناگرک نیائے منچ بنایا، مہاراشٹر میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے کام کیا، 1991 میں بابری مسجد رام جنم بھومی تنازعہ کے عروج کے دنوں میں خیرسگالی کے لیے گاؤں گاؤں گھومے، 2000 میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کے وائس چیئر مین مقرر ہوئے، 11 جولائی 2011 کو دل کے کھلے آپریشن کے بعد صرف 56 سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اردو ناول 'رگوں میں جمی برف' ان کی پہلی تصنیف تھی جو 1975 میں منظر عام پر آئی اس کے بعد ریت گھڑی، نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی، زندگی نامہ، سونے کے دانت، ایک چھوٹا سا جہنم، اور 'ایک مردہ سر کی حکایت' کے عنوان سے ان کے افسانوں کے پانچ مجموعے شائع ہوئے۔ وہ اردو کے واحد افسانہ نگار تھے جنھیں دو مرتبہ کتھا ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ساہتیہ اکادمی نے انھیں 2007 کا ترجمہ ایوارڈ دیا۔ وہ روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی اور ڈیلی مہانگر کے ایڈیٹر بھی رہے۔ روزنامہ جن ستا میں ان کا سیاسی کالم بے حد شوق سے پڑھا جاتا تھا۔

ساجد رشید

راکھ

بیماری اور سفاک موت مل کر بھی شمع کے چہرے کی کشش کو ختم نہیں کر سکے... جمال نے فرش پر رکھی بیوی کی لاش کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ شمع کا مردہ جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا، صرف چہرہ کھلا تھا۔

شمع کی گھنی سیاہ پلکیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ ایک ٹک اس کے سرخ و سفید چہرے کو دیکھ رہا تھا۔ شمع نے پیالی اٹھا کر کوفی کا ایک گھونٹ لیا لیکن اس کی پلکیں بدستور جھکی رہیں۔

''تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا۔'' وہ میز پر تھوڑا جھک گیا۔ میں بہت سیریسلی کہہ رہا ہوں میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

جمال نے شمع سے کل بھی یہی بات کہی تھی، لیکن شمع نے کوئی جواب نہیں دیا تھا صرف جھرجھری لے کر رہ گئی تھی۔ جمال کی اس خواہش کو سن کر وہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ شادی کے اس تصور ہی سے اسے بخار سا ہو جاتا تھا جسے ساری دنیا کی عورتیں تحفظ سمجھتی ہیں۔ بابا کو اگر پتہ چل گیا کہ میں ایک مسلمان لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں تو... سوچ کر ہی وہ کانپ جاتی تھی۔

جمال سے اس کی ملاقات دو برس قبل فوٹو گرافی کے ایک ایگزی بیشن میں ہوئی تھی ، جسے تین امیچر فوٹو گرافرز نے مل کر ترتیب دی تھی۔ شمع کو ایک تصویر بے حد پسند آئی تھی جس کا عنوان تھا 'زندگی' جس میں ایک سی گل کو سمندر کی بپھری موجوں سے کچھ اوپر پرواز کرتے دکھایا گیا تھا۔

شمع نے جب ایگزی بیشن کے ناظم سے اس فوٹو گرافر کے بارے میں پوچھا تو اس نے چشمہ لگائے ایک سانولے سے نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا جس نے ایک ڈھیلی ڈھالی شرٹ اور جینز پہن رکھی تھی۔ وہ ایک عورت سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ جمال کو ایک عمدہ تصویر پر مبارکباد دینے کا خیال ترک کر کے وہ جب گیلری کی سیڑھیاں اترنے لگی تب اس نے سوچا کہ یہ فنکار کی ناقدری ہوگی۔ وہ لوٹ کر ایکزی بیشن ہال میں آ گئی تھی اور اس عورت کے جانے کا انتظار کرنے لگی تھی جو اپنی سوتی ساری سلیولیس بلاوز اور ہنڈلوم کے جھولے کی وجہ سے کوئی آرٹ کرٹیک معلوم ہو رہی تھی۔ اس عورت کے چلے جانے کے بعد شمع نے جمال کے قریب جا کر اپنا تعارف کراتے ہوئے تصویر کی تعریف کی اور دوران گفتگو اس نے بتا دیا تھا کہ وہ جے جے اسکول آف آرٹس میں انسٹرکٹر ہے اور ملازمت کا یہ اس کا پہلا سال ہے۔ دوسرے روز جمال نے جے جے اسکول جا کر شمع کو وہی تصویر تحفے میں پیش کی تھی۔ دونوں کی رسمی ملاقاتیں دوستی میں اور دوستی جلدی ہی محبت میں بدل گئی تھی۔

''جمال! اگر بتیاں کہاں ہیں؟'' جمال نے گردن گھما کر دیکھا اس کا فوٹو گرافر دوست منوج تھا۔ جمال نے وال کیبینٹ کھول کر اگربتی کا پیکٹ منوج کو دیا۔ منوج نے اگر بتیاں شیشے کے ایک گلاس میں ڈال کر شمع کے سرہانے سلگا کر رکھ دیں۔ دھواں دھیرے دھیرے بل کھاتا ہوا فضا میں ایسے تحلیل ہونے لگا جیسے کمرے کے بوجھل ماحول سے وہ بھی افسردہ ہو۔ منوج نے جمال کے قریب آ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔

''کیا تم نے اپنے ڈیڈی کو خبر کر دی ہے؟'' جمال نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''اور شمع کے بابا کو؟'' جمال نے سر جھکا دیا۔ شمع کے بابا کو اس نے دادر ہندو کالونی میں خود جا کر خبر دی تھی انھوں نے شمع کی موت کی خبر ایک سنگین خاموشی کے ساتھ سنی اور اس کے گھر سے باہر نکلتے ہی دروازہ بند کر دیا تھا۔

''شمع اور میں شادی کرنا چاہتے ہیں۔'' جمال کے اس جملے پر شمع کے بابا نے اپنے جنیو میں انگوٹھا ڈال کر اسے دوبار اوپر نیچے کیا اور پھر موٹے چشمے کے پیچھے سے اسے گھورتے ہوئے کہا تھا۔ ''تم جانتے ہو ہم لوگ پونیری برہمن ہیں میرے پتا جی پونے میں اس عمر میں بھی جنم لگن اور مرتیو کی رسمیں کرتے ہیں۔ اور تم ایک مانساہاری مسلمان''، جمال اس سوال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھا اس نے فوراً کہا ''میں دھرم بدل لوں گا۔'' جمال کے اس جواب نے کچن میں ماں کے ساتھ چھپ کر دونوں کی باتیں سن رہی شمع کے دل کے بوجھ کو کم کر دیا تھا۔

''کوئی بھی غیر ہندو، ہندو نہیں بن سکتا۔''

''اور اگر میں آریہ سماجی طریقے سے ہندو بن جاؤں کیا تب بھی آپ مجھے سویکار نہیں کریں گے؟''

''نہیں۔ کبھی نہیں۔'' بابا نے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ''کون کس دھرم میں پیدا ہوگا یہ ایشور کی اِچھا سے ہوتا ہے انسان کی مرضی سے نہیں سمجھے۔''

دوران گفتگو شمع کی ماں نے جمال کے لیے اپنی چھوٹی بیٹی کے ہاتھ سے جب اسٹیل کے گلاس میں پانی بھجوایا تو بابا نے بڑی ملائمیت سے لڑکی سے کہا۔ ''شیشے

کے گلاس میں پانی لاؤ‘‘۔ جمال پانی پیے بغیر ہی اٹھ کر چلا آیا تھا۔ دوسرے روز جمال کو شمع نے بتایا کہ اس کے چلے جانے کے بعد اسے پہلی بار پتہ چلا کہ بابا مسلمانوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں‘‘ وہ کہہ رہے تھے میری بیٹی اگر کسی مہار (چمار) کے ساتھ بھی بھاگ جائے تو مجھے اتنا دکھ نہیں ہوگا جتنا ایک ملیچھ کے ساتھ شادی کرنے سے ہوگا۔‘‘ کہتے ہوئے شمع رو پڑی تھی۔’’میں تمھیں نہیں کھونا چاہتی تھی جمی۔‘‘ ہچکیوں سے اس کے کندھے ہلنے لگے تھے۔

اسی روز جمال نے اپنی والدہ کو شمع کے بارے میں بتایا تھا اور وہ دیر تک خاموشی سے اپنے جوان بیٹے کے اتنے بڑے ارادے پر غور کرتی رہیں پھر کہا۔’’اگر وہ مسلمان ہو جاتی ہے تو میرے خیال میں تمھارے ابو کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔‘‘ جمال دس بارہ دنوں تک شمع سے روز ہی ملتا رہا لیکن مذہب تبدیل کرنے کی تجویز اس کے سامنے رکھنے کی ہمت وہ اپنے میں مجتمع نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک روز سمادر ریسٹورنٹ میں جمال نے شمع سے اسنیکس کے لیے پوچھا تو اس نے یاد دلایا کہ آج اس کا منگل وار کا برت ہے وہ صرف لیمو پانی لے گی... جمال نے کوفی ختم کر لی لیکن وہ اپنا منشا بیان نہ کر سکا۔ شمع نے ٹھنڈے لیمو پانی کے گلاس پر ابھر آنے والے ابخرات کی بوندوں کو انگلی سے پھیلاتے ہوئے کہا۔’’میرے بابا تمھارے ہندو ہو جانے کے بعد بھی تمھیں سویکار کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو میں نے بھی فیصلہ کر لیا ہے۔ میں ہی مسلمان ہو جاتی ہوں۔‘‘

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ شمع اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کر لے گی۔ شمع نے ایک روز خاموشی سے بدن کے کپڑوں کے ساتھ گھر اور مذہب دونوں چھوڑ دیا۔ جامع مسجد میں کلمہ پڑھ کر وہ شما ککلکرنی سے شمع جمال ہو گئی۔ مسجد ہی میں جمال اور شمع کا نکاح ہوا تھا۔

جمال کی بڑی بہن نے کمرے میں شمع کے مردہ جسم کو دیکھتے ہی ایک دبی دبی چیخ ماری اور جمال سے لپٹ کر رونے لگیں۔ جمال کی آنکھیں خشک تھیں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سینے میں کوئی وزنی پتھر رکھا ہوا ہو۔

’’یہ کیسے ہو گیا جمال...‘‘ وہ روتی جاتی تھیں اور کہتیں جاتی تھیں۔

’’خدا کو یہی منظور تھا باجی...‘‘

بڑی بہن نے دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے ہوئے اپنی والدہ اور والد کے بابت دریافت کیا کہ وہ اب تک کیوں نہیں پہنچے؟ پھر اس نے مراٹھی ترجمہ والے قرآن کو کپ بورڈ سے اتارا اور شمع کے قریب بیٹھ کر دھیمی آواز میں تلاوت کرنے لگی۔ شمع عربی تو نہیں پڑھ سکی تھی البتہ وہ کبھی کبھار قرآن کا مراٹھی ترجمہ ضرور پڑھ لیا کرتی تھی۔

جمال کو اس درمیان لنٹاس ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں سینئر فوٹو گرافر کا جاب مل گیا تھا۔ ایجنسی نے ہی اسے بوریولی میں سنگل روم کا ایک فلیٹ بھی الاٹ کر دیا تھا۔ جو میاں بیوی کے لیے کافی تھا وہ اس فلیٹ میں شمع کے ساتھ منتقل ہو گیا تھا۔ لیکن ہفتے کے روز دونوں محمد علی روڑ پر واقع

جمال کے والد کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ شمع نے ایک روز سوچا کہ اتنا عرصہ گزر چکا ہے بابا نہ سہی آئی (ماں) نے تو اس کی غلطی کو معاف کر دیا ہوگا وہ جمال کو بتائے بغیر کالج سے فارغ ہو کر دادر ہندو کالونی پہنچ گئی۔ وہ دروازے پر کھڑی بیل بجاتی رہی لیکن کسی نے دروازہ نہیں کھولا شاید آئی ہول سے اسے دیکھ لینے کے بعد ایسا کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی اس نے ماں کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا تھا۔

شمع نے خود کو جمال کے گھر کی تہذیب کے مطابق ڈھالنے کی پوری کوشش کی تھی۔ رمضان کے روزے اس نے پہلی بار رکھے منگل وار کے برت کا معمول برقرار رہا۔ جمال جب تک گھر نہیں آجاتا وہ کھانا نہیں کھاتی۔ اس نے یہ عادت اپنی آئی سے پائی تھی آئی کہا کرتی تھی، پتی پرمیشور ہوتا ہے اس سے پہلے کھانا نہیں کھانا نہیں چاہیے جمال نے اسے کئی بار سمجھایا کہ ان کے یہاں اس قسم کی کوئی تہذیب نہیں ہے اسے وقت پر کھا لینا چاہیے لیکن وہ ہمیشہ ہنس کر ٹال جاتی۔ لوگ کہتے ہیں کہ محبوبہ جب بیوی بنتی ہے تو اس میں پہلے جیسی کشش نہیں رہ جاتی ہے لیکن شادی کے بعد دونوں کی محبت میں نہ صرف شدت آگئی تھی بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتے تھے۔

کمرے میں شمع کے بے جان جسم کے قریب ہی باجی اور کچھ دوسری رشتے دار عورتیں اور بچیاں قران کی تلاوت کر رہی تھیں۔ ابو اور امی بھی پہنچ گئے تھے۔ امی تو شاید راستے بھر روتی رہی تھیں ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں انھوں نے آتے ہی جمال کو سینے سے لگا کر بھینچ لیا جیسے وہ اس کے سینے کا سارا درد اپنے کلیجے میں اتار لینا چاہتی ہوں۔ تب بھی اس کی آنکھیں خشک رہیں۔

بیٹے غسالہ کو میں نے خبر کر دی ہے وہ بس آتی ہی ہوگی‘‘ انھوں نے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ ابو دروازے کے قریب سوسائٹی کے دوسرے لوگوں کے درمیان اپنی بہو کی ملنساری اور سگھڑپن کی تعریفیں کر رہے تھے۔’’ رمضان کے مہینے میں بہو نے سارے روزے رکھے اور پانچوں وقت نماز ادا کی کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ غیر قوم سے آئی ہے۔ میت میں آنے والے بھی مرحومہ کی انھیں صفات پر تعریفی کلمات ادا کر رہے تھے۔

گزشتہ ایک مہینے سے شمع کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی ڈاکٹر نے یرقان تشخیص کیا تھا اور یہ بھی تنبیہ کر دی تھی کہ بیماری کے سنگین نتائج بھی نکل سکتے ہیں کیوں کہ شمع امید سے تھی۔ جمال نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس کی یہ بیماری اتنی خطرناک ثابت ہوگی ورنہ وہ دفتر سے چھٹی لے کر خود ہی اس کی نگہداشت کرتا۔ یہی سبب تھا کہ اس نے بیماری کے دنوں میں بھی شمع کو منگل وار کا برت رکھنے سے نہیں روکا۔ دو تین روز قبل شمع کو دن میں چار پانچ قے ہوئی تو وہ روہانسی ہو گئی اس نے جمال سے کہا’’ دیوالی میں اپنے بابا اور آئی کا آشیرواد لینے نہیں گئی تھی نا شاید اس کا پاپ ہے۔‘‘ جمال نے اس بات پر اسے محبت بھری ڈانٹ پلائی تھی کہ وہ پڑھی لکھی ہو کر اس طرح کے وہم

رکھتی ہے اس نے کہا تھا ''وہم ہے یا حقیقت میں نہیں جانتی لیکن پنر جنم میں میرا وشواش ضرور ہے میری اوپر والے سے یہی پرارتھنا ہے کہ دوسرے جنم میں بھی وہ مجھے تمھاری ہی پتنی بنائے۔'' اس جملے پر جمال نے بے اختیاری اس کی گرم پیشانی کو چوم لیا تھا۔

کل رات اچانک ہی شمع کی طبیعت بگڑ گئی ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ ڈاکٹر نے دوائیں اور انجیکشن دے کر اس خدشے کا اظہار ضرور کر دیا تھا کہ یرقان اپنے آخری اسٹیج پر ہے اس لیے شمع کو کل سویرے ہی کسی اچھے اسپتال میں داخل کروانا بہت ضروری ہے۔ جمال نے آنکھوں میں ہی ساری رات کاٹ دی۔ انجیکشن کی وجہ سے شمع گہری نیند ضرور سوئی لیکن صبح جاگنے کے بعد اس کی حالت پھر بگڑ گئی۔ شمع کی ایسی حالت دیکھ کر جمال بری طرح نروس ہو گیا تھا اس نے ڈاکٹر کو فون کیا لیکن ڈاکٹر کے آنے سے پہلے ہی شمع بجھ گئی تھی۔

''بیٹے تمام لوگ آ چکے ہیں۔ غسالہ نے میت کو غسل بھی دے دیا ہے۔'' ابو جمال کو قریب بلا کر بولے ''دفن کے لیے کیا سوچا ہے۔ مغرب بعد یا عشا بعد؟''

انھیں جواب دینے کے بجائے جمال شمع کی لاش کو دیکھنے لگا جسے غسل کے بعد کفن پہنا کر دیدار کے لیے رکھا گیا تھا۔ غسل کے بعد چہرہ اب اور نکھر آیا تھا۔ اسے لگا جیسے وہ اٹھ کر کہے گی ''ارے مجھے جگایا کیوں نہیں۔'' اکثر چھٹی کے روز جمال پہلے اٹھ جاتا تو خود ہی چائے بنا کر پی لیتا ناشتہ شمع کے بیدار ہونے پر دونوں ساتھ ہی میں کرتے تھے۔ شمع کو گہری نیند سے جگانے میں اسے اس لیے تکلف ہوتا تھا کہ وہ ہفتہ کے چھ روز بڑے سویرے اٹھ کر گھر کے کام کاج میں جٹ جاتی تھی جمال کو دفتر بھیجنے اور کالج جانے کی تیاری میں اسے کافی وقت لگتا تھا اس لیے عام دنوں میں صبح سویرے اٹھنا اس کی مجبوری تھی۔

''مہرہ صاحب نے کہا ہے کہ ایجنسی کی طرف سے شمع کی ایک Obituary ٹائمز آف انڈیا میں دی جائے۔''

منوج نے ایک کاغذ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

جمال نے کاغذ پر نظر ڈالی۔

شمع جمال

تاریخ پیدائش۔ 18 اپریل بروز بدھ 1968

تاریخ وفات۔ 2 جون بروز منگل 1995

جمال کی نظر تاریخ وفات پر ٹھہر گئی۔ اوہ آج منگل وار ہے۔ شمع کے برت کا دن! شمع نے اسے بتلایا تھا کہ ''ہر منگل وار کو گنیش جی کا برت میں نے جب ہوش سنبھالا ہے تب سے رکھ رہی ہوں۔ کبھی ناغہ نہیں کیا'' اس نے بڑے فخر سے کہا تھا۔ شمع کی آواز بازگشت دیر تک جمال کی سماعت میں جاری رہی۔

''جمال میاں تم نے بتایا نہیں تدفین کب ہوگی؟'' ابو جی نے دوبارہ اسے یاد دلایا۔ جمال نے نم آنکھوں سے شمع کی لاش کی طرف دیکھا سرہانے اگر بتیاں سلگ رہی تھیں۔ دھویں کی پتلی گاڑھی لکیریں فضا میں دھیرے دھیرے رینگ رہی تھیں اماں اور باجی کی تلاوت کی آواز ماحول کو مزید سوگوار بنا رہی تھی۔

''شمع کو قبرستان نہیں شمشان لے جانا ہے۔''

ہیں!!'' جمال کے اس جواب پر ابو کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ چند ثانیوں تک وہ بیٹے کے چہرے کو دیکھتے رہے جو فرط جذبات سے لرز رہا تھا پھر انھوں نے شمع کی لاش کو غور سے دیکھا اور غصے سے لرزتی آواز میں پوچھا ''کیا یہ اس کی اپنی خواہش تھی۔''

''نہیں اس کے اور میرے درمیان کبھی اس موضوع پر بات نہیں ہوئی اور پھر اتنی جلدی یہ سب ہو جائے گا ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

''دیکھو میاں وہ مسلمان ہو چکی تھی اس نے کلمہ پڑھا تھا وہ...'' ابو دانتوں کو بھینچ کر سخت لیکن دھمی آواز میں بولے ''اس نے میرے مذہب سے متاثر ہو کر اپنا مذہب نہیں بدلا تھا مجھے حاصل کرنے کے لیے اس نے مذہب تبدیل کرنے کی رسم ادا کی تھی۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟'' ابو کی آواز غصے سے بلند ہوگئی کمرے اور راہداری میں موجود تمام لوگ چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

میں کہہ چکا ہوں جو مجھے کہنا ہے۔ میں اس کی آتما کو سکون پہنچانا چاہتا ہوں۔''

''کیا جلانے سے اس کی آتما کو سکون مل جائے گا؟'' ان کا لہجہ اتنا ہی تیز اور تلخ تھا امی اور باجی کلام مجید رحل پر بند کر کے باپ بیٹے کے قریب چلی آئیں۔

''ابو ذرا سوچیے تو شمع نے میرے لیے مذہب بدل دیا تو میں اس کی آتما کو سکون پہنچانے کے لیے اتنا بھی نہیں کر سکتا''۔

امی اور باجی نے اسے خدا کا واسطہ دے دے کر سمجھانے کی بہت کوشش کی لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا ''شمع کی آتما کو داہ سنسکار سے ہی سکون ملے گا۔''

ابو زیادہ دیر برداشت نہ کر سکے اور امی کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے سیڑھیوں سے دھم دھم کرتے ہوئے اتر گئے۔ باجی کچھ لمحوں تک اس کا منہ تکتی رہیں پھر شمع کے بے جان چہرے پر ایک نظر ڈال کر برقعہ پہنتے ہوئے وہ بھی چلی گئیں۔ ایک ایک کر کے سارے رشتے دار اور شناسا اپنی خشمگیں نگاہوں کی حدت کو کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ کمرے میں اب صرف اگر بتیوں کا دھواں اذیت ناک خاموشی کے ساتھ پست کر گریہ کر رہا تھا۔

منوج کی دستک پر دروازہ کھلا۔ سامنے شمع کے بابا کھڑے تھے ان کے پیچھے آئی منہ میں پلو دیے ایسے کھڑی تھیں جیسے رو پڑیں گی۔ بجھے ہوئے چہرے اور دھندلی آنکھوں سے انھوں نے منوج کے پیچھے کھڑے جمال کو شاکی نظروں سے دیکھا۔ جمال نے پیتل کی ایک چھوٹی سی کلسی جس کے منہ پر سرخ کپڑا بندھا ہوا تھا، بابا کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ''میں آپ کی بیٹی کو لوٹانے آیا ہوں۔''

بابا نے کلسی کی طرف کانپتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔ آئی دونوں ہاتھوں کو منہ پر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑیں اور جمال کی آنکھوں میں ٹھہرا ہوا آنسوؤں کا سیلاب بھی بہہ نکلا۔

□

خالد انجم

حکیم اجمل خاں

شیدا کی ادبی خدمات

انیسویں صدی کا نصف آخر اور بیسویں صدی کا نصف اول حصہ پورے عالم میں مسلمانوں کے لیے تاریکی لے کر آیا۔ ہندوستان میں بھی اس عہد میں مسلم مخالف سرگرمیاں بے حد بڑھی ہوئی تھیں۔ اور یہاں کے لوگ انحطاط وانتشار کے شکار تھے۔ لہٰذا ایک ایسے قائد کی ضرورت تھی جو عوام کو قومیت وحب الوطنی کے جذبے سے سرشار کردے۔ یہ کام وہی شخص کرسکتا تھا جس میں شرافت اور شائستگی، حلم ومروت اور ایثار وقربانی کا جذبہ ہو۔

1857 کے بعد مسلمانوں کی خوش قسمتی رہی کہ انھیں سرسید اور حکیم اجمل خاں جیسے قائد ملے، جن کی قائدانہ صلاحیتیں اوج کمال تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ان کو مسلمانوں کے روشن ماضی پر پوری دسترس حاصل تھی اور اپنے زمانے کے مسائل کو دور کرنے کا ہنر بھی معلوم تھا۔ جن پر چل کر قوم کو روشن مستقبل کی طرف گامزن کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ مسلمانوں کی ترقی تعلیم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا اس کمی کو دور کرنے کے لیے ادارے قائم کیے۔

اگر سرسید کی قربانیوں کا ثمرہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ملا، تو حکیم اجمل خاں کے ایثار وقربانی کا نمونہ جامعہ ملّیہ اسلامیہ ہے۔ جس کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے ملک و بیرون ملک کا سفر کیا۔ اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ترک موالات کی تحریک سے پیدا شدہ درسگاہ جامعہ ملیہ کے ابتدائی عہد میں، حکیم اجمل خاں جیسا مخلص و مربّی نہ ملتا، تو آج یہ ادارہ ہمارے سامنے اس حالت میں موجود نہ ہوتا۔ کیوں کہ علی برادران نے جامعہ ملّیہ اسلامیہ کو قومی رضا کاروں اور کارکنوں کی ایک تربیت گاہ بنانا چاہا، لیکن حکیم صاحب ایسا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ملک کی آزادی کے لیے اہل ملک کو ذہنی اور تعلیمی آزادی کی ضرورت زیادہ ہے۔ لہٰذا وہ اس بات کے لیے بضد رہے کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کو ایک مستقل درسگاہ کا درجہ دیا جائے۔ لیکن جامعہ کو ایک بڑا ادارہ بنانے کی راہ میں مالی مشکلات اور وسائل کی کمی سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ ان پریشانیوں نے حکیم اجمل خاں کو آرام کا موقع کم ہی دیا۔ اور جامعہ کے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے انھوں نے لوگوں کی مالی مدد پر ہی انحصار نہیں کیا۔ بلکہ وہ ذاتی ملکیت کا بڑا حصہ صرف کرتے تھے۔ اور ایک مرتبہ جامعہ کے اساتذہ کی تنخواہیں ادا کرنے کے لیے انگوٹھی بھی ذاکر صاحب کے حوالے کردی۔ جو ان کی ادارے سے بے لوث وابستگی کا ثبوت ہے۔ اس عہد کے جامعہ کی صورت حال کے بارے میں قاضی عبدالغفار نے لکھا ہے:

”جامعہ کے اخراجات کا ایک حصہ حکیم صاحب اپنی جیب سے ادا کرتے تھے اور کبھی دیکھنے والوں کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی کہ جامعہ کو بغیر عام چندوں اور رؤسا کے عطیات کے کیوں کر چلایا جارہا ہے۔ ان کا دست کرم پردہ میں رہ کر دراز ہوتا تھا اور ان کے چند ہی احباب اس امر سے باخبر تھے کہ آخر زمانے میں خود حکیم صاحب کی ذاتی آمدنی کا کتنا حصہ جامعہ کی نذر ہوا کرتا تھا۔“ (حیات اجمل، ص 426)

حکیم اجمل خاں کی پوری زندگی قربانیوں کی عظیم داستان ہے۔ جو ایک نامور طبیب کے ساتھ ہی قیادت کی اعلیٰ صفات سے پُر شخصیت تھے۔ ان کی کامیابی وکامرانی کا ثبوت ہندوستانی دواخانہ، طبیہ کالج اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہے۔ انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، خلافت کمیٹی اور جمیعۃ علما کا صدر ہونا فعال رہنما ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ انھوں نے خلافت تحریک کا افتتاح کیا اور ان کی ہردلعزیزی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ ہندو مہاسبھا کی مجلس استقبالیہ کے اول و آخر مسلمان صدر بھی بنے۔ وہ تمام عمر طبقاتی کشمکش اور ذاتی اختلافات کو دور کرنے کے لیے سرگرداں رہے۔ ان کا دل عوام کے دلوں کے ساتھ دھڑکتا تھا۔ ان کی نظر سماج کے ہر طبقے کے مسائل پر یکساں تھی۔ عوام کی زبوں حالی اور تنگ دستی کو سہنا، ان کے لیے آسان نہیں ہے۔ ان کی اس خوبی کو بیان کرتے ہوئے محمد علی جوہر لکھتے ہیں:

”حکیم صاحب ملک وملت کی حالت کا آئینہ تھے۔ جو حالت ملک وملت کی ہوتی تھی اس کا صحیح عکس ان کے قویٰ کی کمزوری اور قلب کی کیفیت میں نمایاں ہوتا رہتا تھا۔ سب سے زیادہ افسوس ناک حالت خود اس شہر کی تھی جو ہندوستان کا تاریخی مرکز، اسلامی حکومت کی یادگار اور حکیم صاحب کے خاندان کا وطن تھا۔ ہندو ہو یا مسلمان کیا کوئی دہلی کا باشندہ کہہ سکتا ہے کہ حکیم صاحب نے اس پر کبھی کوئی احسان نہیں کیا تھا۔“ (مضامین محمد علی حصہ اوّل، ص 434)

حکیم صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ ہندوستانی طریقہ طب کو جدید سائنسی ایجادات سے ہم آہنگ کرکے طب کی دنیا میں انقلاب پیدا کرنا ہے۔ وہ برطانوی حکومت کے ہندوستانی طب سے متعلق، مخالف رویے کو مسترد کرکے یہ باور کرانے میں کامیاب ہوئے کہ یونانی، آیورویدک اور مغربی تینوں طریقہ ہائے علاج مساوی ہیں۔ ان میں فرق صرف طبی لوازمات کا ہے۔ جس کو جدید تحقیق کے ذریعے دور کیا جاسکتا ہے۔ ان کی اسی کوشش وکاوش کے لیے برطانوی حکومت نے انھیں ’حاذق الملک‘ کے خطاب سے نوازا، جس کو انھوں نے تحریک خلافت کی ابتدا میں واپس کردیا۔

حکیم حافظ محمد اجمل خاں شیدا دہلوی کی ادبی خدمات کو صحافت اور شاعری کے زمرے میں رکھ کر بحث کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے بھی سرسید کی طرح مسلمانوں کو سماجی، اقتصادی اور تعلیمی ترقی سے ہمکنار کرنا چاہا اور ادب وصحافت میں ملکی وقومی زندگی کے اتنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں کہ ان کی حیثیت دستاویز سے کم نہیں ہے۔ صحافت میں ان کے خیالات کا ترجمان ’اکمل الاخبار‘ نامی ہفت روزہ ہے۔ جو ان کے والد حکیم محمود خاں کے قائم کردہ پریس ’اکمل المطابع‘ سے شائع ہوتا تھا۔ یہ اخبار ان کے دادا حکیم اکمل خاں کی یاد میں یکم جنوری 1866 کو بلی ماران سے جاری ہوا۔ اور اس کے صفحات کی تعداد آٹھ ہے۔ ابتدا میں اس کی ادارت کی ذمے داری حکیم واصل خاں کی رہی لیکن کچھ عرصے بعد یہ فریضہ حکیم اجمل خاں نے پورا کیا۔ اس اخبار کو موضوعات کی رنگارنگی نے عوام میں بے حد مقبول بنایا۔ یہ اخبار لوگوں کے دکھ درد کو دور کرنے اور مسائل کے حل کی ترکیب بھی بتاتا تھا اور ان مسائل کی آگہی کے ساتھ ہی دفاع کی قوت بھی دیتا تھا۔ اسی اخبار کے ذریعے مردم شماری سے متعلق حکومت کے منصوبے کا انکشاف ہوا۔ اس میں مرزا غالب کے مضامین بھی شائع ہوئے۔ اس اخبار کے متعلق ظفر احمد نظامی لکھتے ہیں:

”اسی اخبار کو پہلی بار ممتاز شاعر غالب کی تصویر شائع کرنے کا اعزاز بھی حاصل ہوا۔ اس جریدے میں خبروں کے علاوہ لوگوں کے نظریات و خیالات بھی شائع ہوتے رہتے تھے اور عصری، سماجی، تعلیمی، معاشی اور سیاسی موضوعات پر اس کے ایڈیٹر کے اداریوں کو بڑی اہمیت

حاصل تھی۔'' (حکیم اجمل خاں، ص 48)

یہ زمانہ صحافتی طور پر بے حد نازک اور آزمائش کا تھا۔ کیوں کہ انگریزوں کی عقابی نظریں صحافیوں پر تھیں اور ان کی ذراسی چوک یا حقیقت بیانی پر بڑی سے بڑی سزا متعین کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد میں دو قسم کے اخبار شائع ہوئے۔ ایک وہ جو برطانوی حکومت کی تعریف وتحسین کرتے دوسرے وہ اخبار جو آزادی کے خواہاں تھے اور عوام کے مسائل کو پیش کرتے تھے۔ چوں کہ حکیم اجمل خاں کو اخبارات کی طاقت کا اندازہ تھا۔ لہٰذا 'اکمل الاخبار' کا استعمال انھوں نے عوامی ترسیل کے لیے کیا اور برطانوی حکومت کو یہ باور کرایا کہ ملکی معاملات میں اعتدال وتوازن قائم رکھے، ورنہ اس کے دوررس نتائج اچھے نہیں ہونگے، جس کی تلافی ناممکن ہوگی۔ انھوں نے 'اکمل الاخبار' کے 26 جنوری 1894 کے شمارے میں لکھا:

''جہاں اخبارات میں مخالفت پھیلی، اسی وقت گورنمنٹ خائف ہوجاتی ہے۔ حاکم وقت یا پارلیمنٹ اخبار کی آزادی کو نہیں روک سکتے کیوں کہ آزادرایوں کا بند ہونا ہی ملک کو ازحد نقصان دیتا ہے بلکہ تباہ کردیتا ہے۔'' (اکمل الاخبار، 26 جنوری 1894)

ان کے کالم جہاں ایک طرف ہندوستانیوں میں قومیت اور حب الوطنی کے جذبات بیدار کرنے کا وسیلہ بنے، وہیں دوسری طرف اس بات پر بھی اصرار کرتے ہیں کہ ہندوستانیوں کو چاہیے کہ ان محبان وطن کو مشعل راہ بنائیں، جنھوں نے قوم کے لیے اپنی جان کی قربانی دی اور اپنے مقاصد کے حصول کے لیے خود کو وقف کردیا۔

جہاں تک ان کے شعری ذوق کا تعلق ہے تو عدم مصروفیت کی وجہ سے کبھی بھی شاعری میں وقت صرف نہیں کیا۔ ان کا ادبی ذوق پرلطف اور پاکیزہ تھا۔ وہ بنیادی طور پر مذہبی انسان تھے، جس کا اثر جامعہ پر بھی ہوا۔ اس کے نصاب میں قدیم وجدید علوم بھی شامل کیے گئے اور اس میں مذہبی اور سیکولر مضامین بھی داخل نصاب ہوئے۔ انھوں نے 1921 کے تقسیم اسناد کے جلسے میں خطبہ صدارت پیش کرتے ہوئے کہا:

''ہمارا مقصد... ایسے مسلمان پیدا کرنا ہے جو اپنے مذہب سے صرف واقف ہی نہیں بلکہ اس پر سختی سے عامل بھی ہوں۔ وہ جدید علوم سے ضرور واقف ہوں لیکن نمونہ ہوں اسلامی طرز زندگی کا:

از یک آئین مسلماں زندہ است
پیکر ملت ز قرآں زندہ است''

(حکیم اجمل خاں، ص 4)

حکیم اجمل خاں کو عربی، فارسی، اردو اور انگریزی زبانوں پر یکساں عبور حاصل تھا۔ انھیں اردو اور فارسی شاعری میں بھی امتیاز حاصل تھا۔ وہ اپنی بات صاف اور سادہ زبان میں بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے شاعری ذہنی آسودگی کے لیے کی۔ وہ اپنا کلام اپنے احباب یا صاحب طرز ادیبوں کے درمیان سناتے تھے۔ ان کی نظم کے یہ اشعار شاعرانہ حیثیت کے ضامن ہیں:

تباہی میں ہے کشتی قوم کی اے ناخدا ہمت
اندھیری رات ہے اور موج پر ہے باد طغیانی
تجھے وقت کرم ہرگز گوارا ہو نہیں سکتا
کہ خادم سب ترے آزاد ہوں اور ایک زندانی
آہ از دل شیدا تا بلب نمی آید
درد و بے زبانی ہاست اشک وخونفشانی ہاست
مرنا بھلا ہے ضبط کی طاقت اگر نہ ہو
کتنا ہی درد دل ہو، مگر آنکھ تر نہ ہو
اٹھے جو آگ سینے سے، دبادوں اس کو اشکوں سے
شب ہجراں میں نالے سے مرا لب آشنا کیوں ہو
ملو خلوت میں، اور دو تم مجھے درس شکیبائی
کرم تم میں نہ ہو تو دل مرا صبر آزما کیوں ہو
بھلا تو، اور گھر آئے مرے، کیونکر یقیں کرلوں
تخیل کیوں نہ ہو میرا، تری آواز پا کیوں ہو

ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم اجمل خاں قومی زبوں حالی اور انگریزوں کی دی ہوئی قید وبند کی صعوبتوں سے بہت آزردہ تھے اور غموں کا سیلاب آنے پر بھی خوشی سے قبول کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ کیونکہ اگر زندگی میں غم نہ ہو تو خوشی کا کوئی احساس ہی نہ ہو۔ وہ اپنے خاندان کے پہلے شخص تھے، جس نے اردو شاعری کی طرف رجوع کیا۔ ان کی شاعری کا انداز شستہ اور شائستہ ہے۔ جدت طرازی سے ان کو خاص لگاؤ ہے۔ اور قوم کی زبوں حالی اور عوام کی بیکسی سے ان کی روح کراہ اٹھتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

میں کہاں سے لاؤں دوائے دل، میں کروں تو چارہ درد کیا
نہ اثر نوائے عراق میں، نہ کشش حدی حجاز میں
وہاں بخشش سے تو کردے سبک، تو دم میں دم آئے
یہاں تو بار عصیاں سے گھٹا جاتا ہے دم میرا
پردۂ محمل میں پھر جنبش ہے، اے ہمدم ٹھہر
کچھ اشارے مجھ سے وہ حور ارم کرنے کو ہے

ان کے کلام میں منظر نگاری اور فطرت کی عکاسی کی گئی ہے، جس میں ان کے جذبات اور امنگوں کی بہاریں ہیں اور جب یہ شعری آہنگ اختیار کرتی ہیں، تو ان کا تخیل لامحدود کائنات میں داخل ہوجاتا ہے۔ اور یہ کلام بے ساختہ ان کی زبان پر آتا ہے:

وہ سر ہی کیا کہ جس میں تمھارا نہ ہو خیال
وہ دل ہی کیا کہ جس میں تمھارا گزر نہ ہو
مل جاؤ تم تو شب کو بڑھا لیں گے تا ابد
مانگیں گے یہ دعا کہ الٰہی سحر نہ ہو

الغرض ان کے کلام میں خیالات کی نیرنگی اور معنی آفرینی نے زمانے کو مرغوب کیا اور ادب میں بھی اہم اضافے کیے۔ ان کی پوری زندگی اسلامی طرز زندگی اور ہندوستانی آدرشوں کی مثال ہے۔ حکیم صاحب کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے قاضی عبدالغفار لکھتے ہیں:

''یہ مختصر مجموعہ کلام جس بزرگ کا نقش تخیل ہے وہ اصطلاحاً شاعر نہیں۔ نسبتی، صفاتی اور اضافی تشخص سے قطع نظر مسیح الملک حکیم اجمل خاں عہد گزشتہ کی دلنواز وضع داریوں اور صحبتوں کا تنہا ایک نمونہ ہیں، جن کے دم سے، یادش بخیر، شاہی دلی کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ ان کے خاندان نے کم وبیش سو برس سے جہاں آباد میں تہذیب قدیم کے بہترین نقوش محفوظ رکھا ہے۔ وہ صحبتیں برہم ہوگئیں، وہ لوگ نہ رہے، وہ علم نوازیاں اور قدردانیاں نہ رہیں... ان کا کلام شاذ ونادر ہی کبھی پہنچا، اس مختصر اور محدود صحبت میں پڑھا گیا اور سننے والوں نے مزے لے لے کر سنا اور بیاض میں درج ہوا۔'' (مقدمہ دیوان شیدا)

مجموعی طور پر حکیم صاحب ہمہ جہت خدمات کی فہرست میں 'دیوان شیدا' کو اضافی حیثیت حاصل ہے۔ جس کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے برلن سے شائع کیا۔ جس میں اردو اشعار کے ساتھ فارسی کلام کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ اس میں نظموں کی تعداد اٹھاسی ہے۔ اس دیوان کا دوسرا ایڈیشن 'نقش شیدا' کے عنوان سے مجلس یادگار اجمل لاہور سے شائع ہوا۔ بسمل سعیدی نے ان کی شاعری کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

بیاں کیا وصف تیری شاعری کے ہوسکیں شیدا
تجھے تسلیم کرتے تھے سبھی دہلی کے خاقانی

ان کی اردو کتابوں میں ''رسالہ طاعون، حاذق اور افادات مسیح الملک'' ہیں۔ آخر الذکر کتاب میں مریض کی ہسٹری، تشخیص وتجویز اور علاج کی تدابیر بیان کی گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ حکیم اجمل خاں ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ بہترین طبیب، گداز دل شاعر، قومی مصلح، رہنما، نڈر صحافی اور سچے انسان تھے۔ ان کی عظمت اور خوبیوں کا اعتراف زمانہ ہمیشہ کرے گا۔

□

Mohd Khalid Anjum Usmani
122/1, Zakir Nagar, Jamia Nagar, New Delhi-25

خواجہ عبدالمنتقم

ہندوستان میں عدلیہ کا تاریخی پس منظر

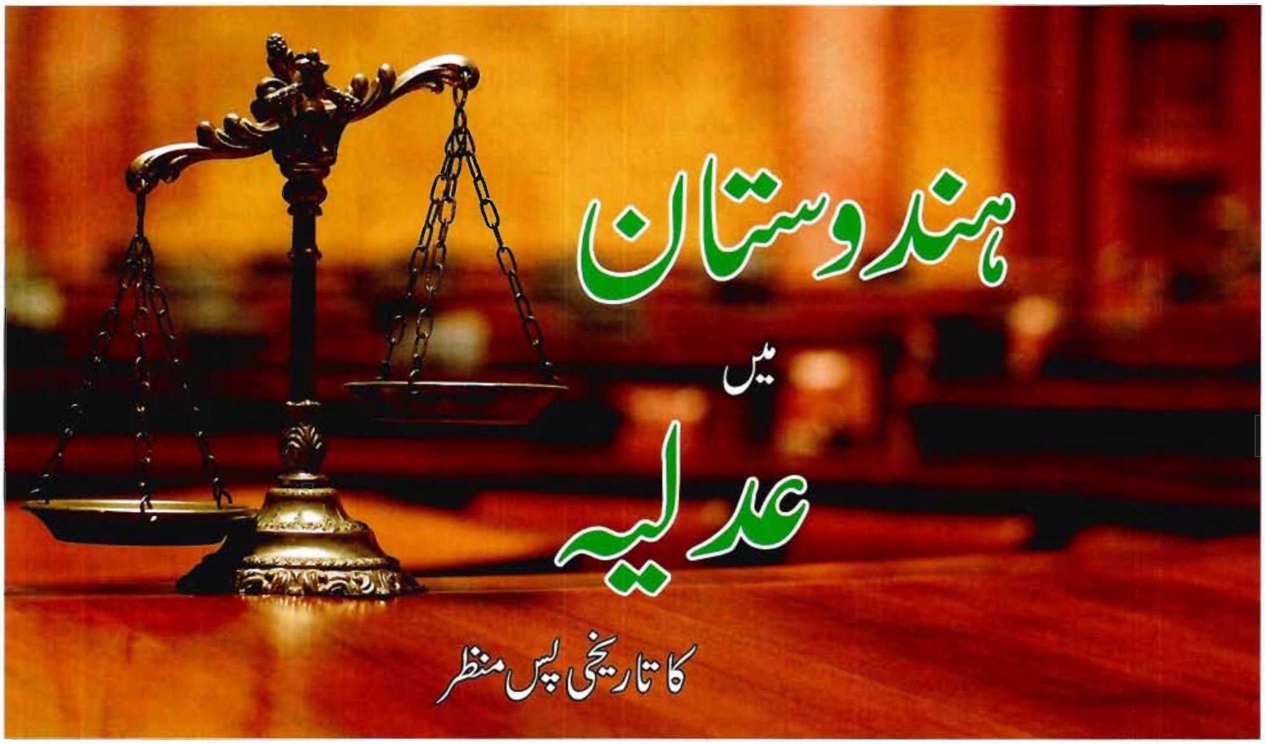

عدلیہ کا تصور اور اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ اس دنیا کی۔ جیسے جیسے معاشرہ، جسے آج ہم سول سوسائٹی کہتے ہیں، وجود میں آتا رہا ویسے ویسے قانونی و عدلیاتی نظام بھی کسی نہ کسی شکل میں ظہور پذیر ہوتا رہا۔ ہندوستان کا قانونی و عدلیاتی نظام دنیا کے قدیم ترین نظاموں میں سے ایک ہے۔ یہ اپنی ہزار ہا سال کی تاریخ میں دنیا کے لیے ایک مثالی نظام بنا رہا۔ یہ تاریخ کے مختلف ادوار میں بدلتا رہا مگر اس پر کبھی قدغن نہیں لگا اور یہ ہمیشہ رواں دواں رہا۔ اس نے دیگر ممالک کے نظاموں سے بھی بہت کچھ لیا اور اسے اپنے نظام کا حصہ بنایا۔ اگر چہ ہماری توجہ اس وقت موجودہ نظام کی طرف مرکوز ہے مگر موجودہ نظام کو سمجھنے کے لیے کم از کم مختصر طور پر یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ آخر ہمارے اس قانونی و عدلیاتی نظام کا ارتقا مختلف ادوار میں کس طرح ہوا اور اس میں وقت کے ساتھ ساتھ کیا کیا اہم تبدیلیاں آتی رہیں۔

قدیم ہندوستان میں نظام عدل

قدیم ہندوستان میں دراوڑوں کا اپنا ایک عدالتی نظام تھا۔ آریاؤں نے اسے کچھ تبدیلیوں کے ساتھ اپنایا۔ نظام عدل گستری کا مطلب تھا 'دھرم' کے وسیع تصور کو قانونی شکل دینا۔ دھرم سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ جان ٹی پلیٹس کی اردو کلاسیکل ہندی اور انگریزی ڈکشنری کے مطابق دھرم نام ہے قانون کا، قواعد و ضوابط کا، دستور کا، معمول کا، چلن کا، رواج کا، ذات پات کی روایات کو قائم رکھنے کا، مذہبی رسومات ادا کرنے کا، زندگی کے ہر شعبے میں ایک ضابطہ اخلاق اپنانے کا، اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دینے کا اور اپنی ذمے داریوں و موجبات کے تئیں مخلص اور باعمل ہونے کا۔ دھرم کا تصور ایک ایسا تصور ہے جس کے بارے میں ہندو دانشوروں و دیگر لوگوں نے، جن میں قانون کے ماہرین، مذہبی امور پر دسترس رکھنے والے اہل علم حضرات و مورخین شامل ہیں، اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے مگر یہاں یہ موضوع بحث نہیں ہے۔ ہمارا مقصد یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قدیم دور میں شعبۂ قانون میں اس تصور کی ایک اپنی اہمیت تھی۔

Hindu Jurispudence یعنی ہندو اصول قانون یا ویوہار دھرم شاستر کا دھرم کی اصطلاح سے گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے جو وید، پران وسمرتی وغیرہ میں پیش کیا گیا ہے۔ ویدوں کو مقدس کتابیں تصور کیا جاتا تھا۔ مختلف سمرتیوں کی اپنی اپنی اہمیت تھی لیکن شعبہ قانون و انصاف رسانی کے میدان میں منوسمرتی کی حیثیت کلیدی رہی۔ قدیمی دور میں تمام معاملات میں، خواہ وہ دیوانی کے ہوں یا فوجداری کے، تمام فیصلے منوسمرتی کے مطابق ہی کیے جاتے تھے۔ مقامی عدالتوں، اپیلی عدالتوں کا تصور بھی اس دور میں موجود تھا حالانکہ اس کی شکل موجودہ دور سے مختلف تھی۔ اگر کوئی شخص مقامی عدالت کے فیصلے سے مطمئن نہیں ہوتا تھا تو وہ ملک کی اعلیٰ عدالت میں اپیل کرسکتا تھا اور اس فیصلے کے خلاف اپیل سننے کا اختیار راجہ کو ہوا کرتا تھا۔ راجہ کی عدالت میں راجہ خود ہوتا تھا اور اس کے ساتھ کچھ دیگر جج ہوتے تھے اور ساتھ ہی اس کے مذہبی مشیر بھی ہوتے تھے لیکن یہ سب لوگ راجہ کو صرف صلاح یا مشورہ دے سکتے تھے مگر حتمی فیصلہ راجہ کے اپنے ہاتھ میں ہی ہوتا تھا۔ عدالت میں آنے سے قبل ثالثی کا بھی اپنا ایک نظام تھا۔ ان ثالثوں کو تین زمروں میں بانٹا گیا تھا۔ پہلے زمرے میں اعزہ آتے تھے، دوسرے میں متعلقہ پیشے، تجارت و کاروبار سے تعلق رکھنے والے لوگ اور تیسرے زمرے میں معززین شہر۔ ان میں سے پہلے زمرے کے فیصلے کی اپیل دوسرے زمرے کے روبرو، دوسرے کی تیسرے کے روبرو اور تیسرے کی مقامی عدالت کے روبرو کی جاسکتی تھی۔ پانچ پنچوں کا فیصلہ اس دور کی ایک عام بات تھی۔ گاؤں کے مکھیا کو گاؤں کے لوگوں کے لیے موجودہ قانونی زبان میں ایک جج، منصف یا مجسٹریٹ کی حیثیت حاصل ہوتی تھی۔

مسلم دور حکومت میں نظام عدل

سلاطین دہلی نے اس دور کے عدلیاتی نظام میں تبدیلیاں کیں اور انصاف رسانی کے لیے قاضیوں کا تقرر کیا۔ مغلوں نے ہندو پنچایتی نظام کی جگہ ایک ایسا

عدلیاتی نظام قائم کیا جو اسلامی، پرشین اور مقامی ہندو نظام کی ملی جلی شکل تھی۔ مقامی سطح پر ہندوؤں کے مذہبی امور سے متعلق معاملات کا فیصلہ پنچایتیں کرتی تھیں۔ باقی معاملات کا فیصلہ صوبائی اور مقامی سطح پر قاضی کیا کرتے تھے۔ فوجداری معاملوں میں مذہبی بنیاد پر کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا لیکن ہندوؤں کے سول اور مذہبی معاملات کا فیصلہ ان کے رسم و رواج اور ذات پات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے برہمنوں سے مشورے کے بعد کیا جاتا تھا۔ پنچایت کا جو فیصلہ ہوتا تھا اس کی اپیل قاضی کی عدالت میں کی جاتی تھی۔ مغلوں کے دور میں سب سے اعلیٰ عدالتی افسر قاضی القضات ہوتا تھا یعنی آج کی عدالتی زبان میں چیف جسٹس۔ اس کے فیصلے کے خلاف اپیل کا اختیار سماعت صرف بادشاہ کو ہی ہوتا تھا۔ اکبر نے اپنے دور حکومت میں ملک کے عدلیاتی نظام میں کافی تبدیلیاں کیں جن میں سے کچھ اہم تبدیلیاں درج ذیل تھیں:

1. اس نے سب کے لیے ایک شہریت اور ایک عدلیاتی نظام قائم کیا۔
2. اس نے ہندو یاتریوں پر لگائے جانے والا ٹیکس اور جزیہ بھی ختم کر دیا۔
3. اس نے ہندوؤں اور عیسائیوں کو بالترتیب مندر و گرجا بنانے کی اجازت دی اور ستی کی رسم کو قانونی طور پر ختم کرنے اور اس قسم کے واقعات پر کڑی نظر رکھنے کے لیے حتی الامکان کوشش کی۔

انگریزی دورِ حکومت میں عدلیاتی نظام

اس دور میں عدلیاتی نظام کا آغاز کنگ جارج کے 1726 میں جاری کردہ اس چارٹر کے ساتھ ہوا جس میں پریسیڈنسی ٹاؤنس یعنی بمبئی، کلکتہ اور مدراس کے عدلیاتی نظام میں یکسانیت لانے کی بات کہی گئی تھی۔ ہندوستان کے موجودہ عدلیاتی نظام میں آخری عدالت کے فیصلے کے خلاف انگلستان میں پریوی کونسل کے روبرو اپیل کا تصور بھی اسی چارٹر کی دین تھا۔ پریوی کونسل میں اپیل داخل کرنے کا سلسلہ بھی اسی سال یعنی 1726 میں شروع ہوا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے 1773 میں ایسٹ انڈیا کمپنی ریگولیٹنگ ایکٹ 1773 نافذ کیا گیا۔ اس قانون کی رو سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا کنٹرول حکومت برطانیہ کے تحت آ گیا اور کولکاتا میں فورٹ ولیم میں موجودہ عدلیاتی نظام کو ختم کر کے وہاں سپریم کورٹ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور یہ کورٹ 26 مارچ 1774 کو قائم کی گئی۔ یہ باقاعدہ ایک نظیری عدالت تھی اور اسے رعایا کی تمام شکایات کو سننے اور ان میں فیصلے دینے کا پورا پورا اختیار تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بنگال، بہار اور اڑیسہ میں دیے گئے فیصلوں کے خلاف اختیار سماعت حاصل تھا۔ اس کے بعد مدراس اور بمبئی میں بھی اسی طرز پر دو اور سپریم کورٹ قائم کی گئیں۔ ان کا قیام کنگ جارج سوم کے چارٹرس مورخہ 26 دسمبر 1800 اور 8 دسمبر 1823 کے ذریعے وجود میں آیا۔ اس طرح پہلے مدراس میں سپریم کورٹ بنائی گئی اور اس کے بعد بمبئی میں۔

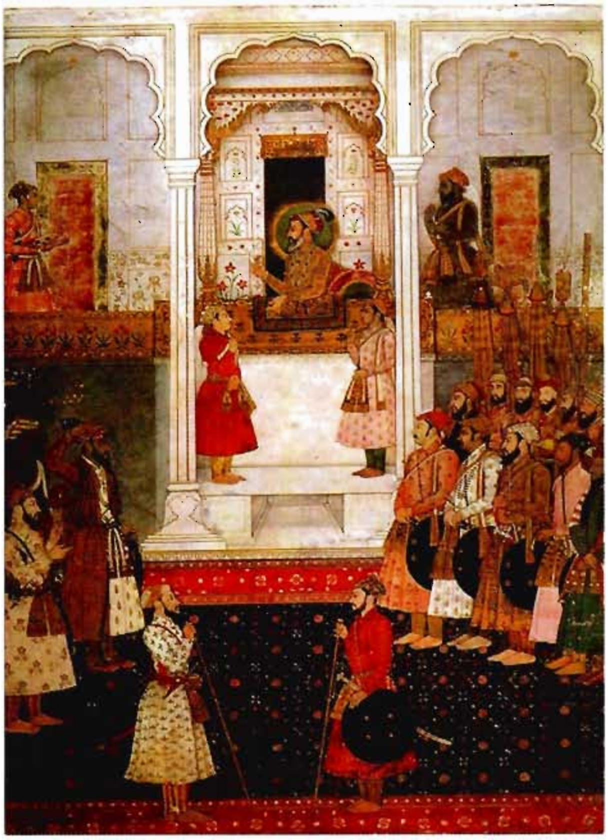

مغل نظام عدل کا ایک منظر

پریوی کونسل نے ہندوستان میں قانون کی بالادستی کے تصور کو استحکام دینے کے معاملے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا۔ پریوی کونسل کی عدلیاتی کمیٹی کو ایک باقاعدہ مستقل قانونی کمیٹی کی شکل دے دی گئی ہے جو قانون کے ماہرین پر مشتمل تھی اور جسے برٹش پارلیمنٹ کے ذریعے منظور کیے گئے 1833 کے ایکٹ کی رو سے برٹش کالونیوں میں وہاں کی عدالتوں کے ذریعے کیے گئے فیصلوں کے خلاف اپیلیں سننے کا اختیار دیا گیا۔

The Indian Council Act, 1861، اس ایکٹ کے ذریعے ہندوستان کے عوام کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے اور ان کے مطالبات میں کچھ مطالبات پر ہمدردانہ غور کرتے ہوئے گورنر جنرل کی ایگزیکیوٹیو کونسل میں غیر سرکاری ارکان کو بھی شامل کرنے کی اجازت دے دی گئی تھی اور اس طرح ہندوستان کے لوگوں کو پہلی مرتبہ وضع قانون سے متعلق امور میں شرکت کرنے کا موقع ملا لیکن بعد میں ہندوستان کے لوگوں کو اس بات کا احساس ہوا کہ یہ محض ایک دکھاوا تھا اور غیر سرکاری ارکان پر اس قدر پابندیاں عائد کی گئی تھیں کہ وہ کوئی اہم کردار ادا نہیں کر سکتے تھے اور ان کے پر پوری طرح کٹے ہوئے تھے۔

The Indian High Court Act, 1861، اس ایکٹ کے ذریعے مدراس، کلکتہ اور بمبئی کی سپریم کورٹ اور اس وقت پریسیڈنسی ٹاؤنس میں صدر عدالتوں کو ختم کر کے وہاں ہائی کورٹیں قائم کی گئیں اور انھیں سول، کریمنل و دیگر معاملوں میں اختیار سماعت عطا کیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ انھیں ابتدائی و اپیلی اختیار سماعت دے کر ایک مضبوط عدالتی نظام کی بنیاد ڈالی۔

The Indian Council Act, 1892، ہندوستان کے لیے مقرر کیے گئے سکریٹری آف اسٹیٹ نے خود اس ایکٹ کی وضاحت کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس کا مقصد حکومت ہندوستان کے کام کاج کو وسیع سے وسیع تر بنانا ہے اور ساتھ ہی غیر سرکاری عوام کو سرکار کے کام میں زیادہ سے زیادہ شرکت کرنے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ 1892 کے اس ایکٹ کی اغراض کو دھیان میں رکھتے ہوئے مرکزی اور صوبائی کونسلوں میں ارکان کی تعداد میں اضافہ کیا گیا اور کونسلوں کو اس بات کا اختیار دیا گیا کہ وہ کچھ شرائط کے تابع سالانہ بجٹ وغیرہ پر بحث کر سکتی ہیں اور متنازعہ امور کی بابت حکومت سے رجوع کر سکتی ہیں۔

Morley-Minto reforms and the Indian Council Act, 1909، ان اصلاحات کو

1909 کے ایکٹ کے ذریعے روبہ عمل لایا گیا اور ان اصلاحات کی بابت یہ کہا گیا کہ یہ اصلاحات عوام میں کافی مقبول ہو چکی ہیں۔ اس ایکٹ کے ذریعے مرکزی قانون ساز کونسل اور صوبائی کونسلوں کے ارکان کی تعداد میں بڑے پیمانے پر اضافہ کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں قانون ساز کونسلوں کو بہت سے معاملات میں اس حد تک خودمختاری عطا کی گئی تھی کہ وہ امور متعلقہ کی بابت آزادانہ فیصلے کرسکتی ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مصرحہ ایسے امور کی بابت نہ صرف بحث کرسکتے تھے بلکہ موزوں تجاویز پر بھی غور کرسکتے تھے اور مناسب فیصلے لے سکتے تھے۔

Montagu- Chelmsford report and the Government of India Act 1919

انڈین نیشنل کانگریس کے مطالبات کے پیش نظر برٹش حکومت نے اس بات پر غور کرنا شروع کردیا تھا کہ ہندوستان کے نظم ونسق اور انتظام وانصرام کے معاملے میں ہندوستان کے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ حصے داری دی جانی چاہیے اور وہاں کے بلدیاتی اداروں کو مضبوط سے مضبوط تر بنایا جانا چاہیے تاکہ وہاں کے عوام یہ محسوس کرسکیں کہ ان کو بتدریج ہی سہی لیکن آخرکار مکمل اختیارات کبھی نہ کبھی ضرور حاصل ہوں گے۔ اس ایکٹ کی خاص باتوں میں سب سے اہم بات صوبوں میں ایک دوہری حکومت قائم کرنا تھا یعنی گورنر کچھ امور کی بابت فیصلے وزرا کی مدد سے کریں گے اور اس کی جواب دہی لجسلیٹو کونسل کو ہوگی جب کہ دیگر امور کی بابت گورنر اور ان کی ایگزیکیٹو کونسل ہی فیصلے کرے گی۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ انتظامی معاملات کو دو حصوں میں بانٹ دیا گیا تھا یعنی مرکزی اور صوبائی۔ تیسری بات یہ کہ مرکزی Legistature کو بہتر نمائندگی کا موقع دیا گیا تھا اور اسے دو ایوانی شکل دی گئی تھی۔ اس میں ایک ایوانِ بالا تھا جس میں 60 میں سے 34 ممبروں کا انتخاب کیا جاتا تھا اور ایک ایوانِ زیریں تھا جس میں 144 ارکان میں 104 کا انتخاب کیا جاتا تھا۔

The Government of India Act,

1935۔ سائمن کمیشن کی رپورٹ کے بعد بار بار کیے جانے والے مطالبات کے مدنظر The Government of India Act, 1935 منظور کیا گیا۔ اس ایکٹ کی رو سے صوبوں اور ہندوستانی ریاستوں کی ایک فیڈریشن بنائی گئی تھی البتہ ریاستوں کو اس بات کی آزادی تھی کہ وہ اس وفاق میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے علاوہ

برطانوی نظام عدل کا ایک منظر

6 صوبائی قانون ساز Legislatures کو دو ایوانی Legislatures میں تبدیل کردیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کچھ توضیعات کے تابع قانون وضع کرنے سے متعلق اختیارات کی مرکز اور صوبوں کے مابین اس طرح تقسیم کردی گئی تھی کہ ان دونوں کے الگ الگ اور بالکل واضح اختیارات ہوں اور ایک دوسرے کے دائرۂ اختیار میں کبھی بھی مداخلت نہ کریں۔ علاوہ ازیں ایک فیڈرل کورٹ بھی قائم کی گئی جسے ابتدائی، اپیلی اور مشاورتی اختیارِ سماعت عطا کیا گیا تھا۔

فیڈرل کورٹ پہلی آئینی عدالت تھی اور یہ وہ واحد عدالت تھی جس کا علاقائی اختیار سماعت پورے ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا اور اسے مختلف صوبوں یا فیڈرل ریاستوں کے مابین جو تنازعات پیدا ہوتے تھے ان کی بابت بھی ابتدائی اختیار سماعت حاصل تھا۔ ہائی کورٹ کے دیے گئے فیصلوں، ڈگریاں یا حتمی احکام کے خلاف فیڈرل کورٹ میں اپیل کی جاسکتی تھی۔ اس طرح ہندوستان کی فیڈرل کورٹ بلاشبہ ایک ایسی عدالت تھی جسے ابتدائی اپیلی اور مشاورتی اختیار حاصل تھا۔ جس طرح آج ہماری تمام عدالتیں سپریم کورٹ کے دیے گئے فیصلوں کی پابند ہیں اسی طرح اس دور میں فیڈرل کورٹ اور پریوی کونسل کے ذریعے دیے گئے فیصلے ملک کی تمام عدالتوں کے لیے قابل پابندی تھے۔

The Cabinet Mission , 1946۔ کیبنٹ مشن 4 مارچ 1946 کو ہندوستان آیا تھا۔ اس مشن نے سفارشات کی شکل میں مندرجہ ذیل تجاویز پیش کی تھیں۔ اول یہ کہ بھارت کی ایک یونین ہوگی جس میں برٹش انڈیا اور ہندوستانی ریاستیں شامل ہوں گی۔ کچھ محفوظ موضوعات اور امور کو چھوڑ کر تمام امور کی بابت ریاستوں کو مکمل حقوق حاصل ہوں گے اور کراؤن کی ناقابل تسخیر اہمیت ختم ہوجائے گی۔ دوئم یہ کہ نیا آئین وضع کرنے کے لیے قانون ساز اسمبلی کے انتخاب کی بابت بھی سفارش کی گئی تھی۔ تیسرے یہ کہ ایک ایسی عبوری حکومت کی سفارش کی گئی تھی جسے تمام سیاسی جماعتوں کی حمایت حاصل ہو۔ اس کے علاوہ اور بھی تجاویز پیش کی گئی تھیں جنھیں یہاں تفصیل سے پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ کیبنٹ مشن کی تجاویز کو منظور کرلیا گیا تھا اور آئین ساز اسمبلی کے لیے جولائی 1946 میں الیکشن کرایا گیا تھا۔

The Indian Independence Act,

1947، جہاں تک ہندوستان کی آزادی کا سوال ہے اس ایکٹ کی اپنی خصوصی اہمیت ہے چونکہ اس کے ذریعے بالترتیب 14 اگست اور 15 اگست 1947 کو دو آزاد مملکتیں وجود میں آئیں اور برٹش پارلیمنٹ کی خودمختاری اور جواب دہی کا خاتمہ ہوگیا۔ اس کے ساتھ ساتھ کراؤن کا کوئی اختیار باقی نہیں رہا اور وہ تمام بااختیار گورنر جنرل اور صوبائی گورنر جو اپنی شان وشوکت اور پھوں پھاں کے لیے جانے جاتے تھے اور جن تک ہندوستان کی عوام کی رسائی نہایت مشکل بلکہ چند پسندیدہ شخصیتوں کو چھوڑ کر تقریباً ناممکن تھی محض ریاستوں کے آئینی ہیڈ بن کر رہ گئے اور قانون ساز اسمبلی کو اپنی پسند کا آئین منظور کرنے کی اجازت دے دی گئی۔

■

ماخذ: ہندوستانی نظام قانون: خواجہ عبدالمنتقم، سنہ اشاعت 2012، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

بارہویں پاس طلبا اپنے کریئر، سبجیکٹ اور پڑھائی کو لے کر تذبذب میں رہتے ہیں۔ بہت سے طلبا اپنے دوستوں کی دیکھا دیکھی مضامین منتخب کر لیتے ہیں، خواہ وہ ان کی پسند کا نہ ہو۔ پھر بعد میں طلبا کو اپنے کریئر کے متعلق بہت سی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر طلبا اپنی پسند سے سبجیکٹ کا انتخاب کریں تو یقیناً وہ اپنے مستقبل کو روشن کر سکتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں سائنس، آرٹس اور کامرس اسٹریم کے طلبا کے لیے نئے پروفیشنل کورسز آج تقریباً تمام شعبوں میں دستیاب ہیں جن کی مدد سے آپ اپنی صلاحیت و ہنر کو بلندیوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ قابل غور بات یہ ہے کہ معروف یونیورسٹیوں کے زیادہ تر کالجوں میں روایتی اور پروفیشنل دونوں ہی کورسز میں داخلے کے لیے انٹرنس ایگزام پاس کرنا ہوتا ہے۔ اچھے اداروں میں کیمپس پلیسمنٹ کی بنیاد پر اس طرح کے ڈگری ہولڈروں کو آسانی سے اچھی ملازمتیں بھی مل جاتی ہیں۔ اس لیے اپنی دلچسپی سے متعلق تمام کورسز کے بارے میں پوری معلومات ہو۔

سائنس

روایتی کورسز: اس کے تحت میتھس، فزکس، کیمسٹری، بوٹنی، زولوجی، جیولوجی، ایگریکلچر سائنس، ہارٹی کلچر سائنس، کمپیوٹر سائنس، اسٹیٹسٹکس وغیرہ مضامین میں بی ایس سی (جنرل) اور بی ایس سی (آنرس) کا کورس کرنے کے لیے داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

پروفیشنل کورسز: میتھس، فزکس، کیمسٹری کے بہت کم طلبا کو یہ معلومات ہے کہ انجینئرنگ برانچ میں الیکٹرانکس، کیمیکل، میکینیکل، الیکٹریکل وغیرہ اہم ہیں، جبکہ روبوٹک ٹیلی کمیونکیشن، ایرو اسپیس انجینئرنگ، میٹالرجیکل، پٹرولیم، آٹو موبائل، انسٹرومنٹیشن، پروڈکشن، لیدر انجینئرنگ، ٹیکسٹائل، نیوکلیئر مینوفیکچرنگ، ایگریکلچر انجینئرنگ جیسی برانچوں کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ مثلاً جینیٹک انجینئرنگ، ایرو ناٹیکل انجینئرنگ، الیکٹرانک اینڈ ٹیلی کمیونکیشن، ساؤنڈ انجینئرنگ، ایگریکلچر انجینئرنگ، انوائرمنٹل انجینئرنگ، کمپیوٹر انجینئرنگ، اوشن انجینئرنگ، سیرامک انجینئرنگ، نینوٹیکنالوجی میں اہم ہیں۔

جینیٹک انجینئرنگ: سائنس اور انجینئرنگ کی یہ ایک نئی برانچ ہے جس میں ایسی موروثی خصوصیات کا مطالعہ بہت ہی گہرائی سے کیا جاتا ہے۔ جینیٹک انجینئر کی مانگ خاص طور سے میڈیکل، فارماسٹکل اور ایگریکلچر سکٹر میں زیادہ ہے۔

ایئرو ناٹیکل انجینئرنگ: اگر آپ ایئرو ناٹیکل انجینئرنگ کی پڑھائی کرتے ہیں تو آپ ایئر کرافٹ، اسپیس کرافٹ، میزائل وغیرہ کی ڈیزائننگ، ٹسٹنگ، ڈیولپنگ، پروڈکشن اور رکھ رکھاؤ کے بارے میں معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ایئر کرافٹ مینٹیننس انجینئر کی مانگ میں ان دنوں کافی اضافہ ہوا ہے۔

الیکٹرانک اینڈ ٹیلی کمیونکیشن: بازار میں اس کے پروفیشنل کی مانگ ہے۔ اس کے تحت الیکٹرانک آلات، سافٹ ویئر ڈیزائن، سگنل و امیج پروسیسنگ وغیرہ کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ اس کے پروفیشنل کو ٹرانس میشن انجینئر، نیٹ ورکنگ انجینئر وغیرہ کے طور پر کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔

ساؤنڈ انجینئرنگ: فلم، ٹی وی، ریڈیو، ملٹی میڈیا وغیرہ میں ساؤنڈ انجینئر کے لیے مواقع ہیں۔ اس کے تحت مختلف الیکٹرانک اور میکینکل آلات کا استعمال کر کے ساؤنڈ ریکارڈنگ، ایڈیٹنگ، مکسنگ وغیرہ کام کیا جاتا ہے۔

ایگریکلچر انجینئرنگ: زراعت اور اس کے متعلق مختلف سرگرمیوں جیسے اینمل ہسبنڈری، ڈیری، پالٹری وغیرہ کا مطالعہ ایگریکلچر انجینئرنگ کے تحت کیا جاتا ہے۔

انوائرمنٹل انجینئرنگ: اس کے تحت ماحولیاتی توازن، صنعتی کیمیکل کا نمٹارا، جنگلی جانوروں کا تحفظ وغیرہ موضوع آتے ہیں۔ انجینئرنگ کی یہ برانچ آج کافی اہم ہوگئی ہے۔

کمپیوٹر انجینئرنگ: اس کے تحت ہارڈ ویئر یا سافٹ ویئر میں سے کسی میں بھی کریئر کی راہ بنائی جا سکتی ہے۔ تقریباً تمام آئی ٹی ادارے اس کے لیے بہتر مانے جاتے ہیں۔

اوشن انجینئرنگ: اس کا تعلق سمندری ماحول کے مطالعہ سے ہے۔ اس میں سول، میکینکل اور الیکٹرانک مضامین کی معلومات کے ساتھ ساتھ نیول آرکٹیکچر اور اپلائیڈ اوشن سائنسز جیسے مضامین کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

سیرامک انجینئرنگ: ٹیبل ویئر، فائبر آپٹکس اور گلاس کے مختلف پروڈکشن کے تیار کرنے کے عمل سے لے کر طرح طرح کے الیکٹرانک آلات کے پروڈکشن میں سیرامک انجینئرنگ کی مدد لی جاتی ہے۔ اس کے پروفیشنل کی بیرون ممالک میں زبردست مانگ ہے۔

نینو ٹیکنالوجی: انجینئرنگ کے طلبا نینوٹیکنالوجی کی پڑھائی پی جی سطح پر کر سکتے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی، الیکٹرانکس، انرجی، فارماسٹیوٹکس، کیمیکلس، انوائرمنٹ، کاسمیٹک، سیکورٹی وغیرہ شعبے میں بڑے پیمانے پر اس تکنیک کا استعمال ہو رہا ہے۔ ایم ٹیک نینوٹیکنالوجی کے لیے اہلیت کسی بھی انجینئرنگ و ٹیکنالوجی برانچ میں بی ای/بی ٹیک یا ایم ایس سی ہے۔

نان انجینئرنگ کورسز میں ریڈیولوجی سائنس، کمرشیل پائلٹ ٹریننگ، میرین سائنس وغیرہ کریئر کے خاص میدان ہیں۔ بارہویں کے بعد این ڈی اے کے امتحان میں بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ پی سی ایم مضامین کے طلبا کے لیے مرین انجینئرنگ، پٹرولیم، مائننگ جیسے ابھرتے سیکٹر بھی ہیں جن میں روشن مستقبل کے کافی امکانات ہیں۔

بایولوجی سے ڈاکٹر کے علاوہ بی ڈی ایس، بی فارمہ وغیرہ کے علاوہ بایوفزکس، بایوکیمسٹری، بایوانفارمیٹکس، بایو انجینئرنگ، بایوٹیکنالوجی، مائیکرو بایولوجی، آڈیو اینڈ اسپیچ تھراپی، میڈیکل لیب ٹیکنالوجی، آپتھیلمولوجی، بی ٹیک (ڈیری ٹیکنالوجی)، بی ایس سی (فاریسٹ)، بیچلر آف میڈیکل ریکارڈ سائنس، بی ایس سی (جینیٹکس)، آکیوپیشنل تھراپی، فزیوتھراپی، ایکوا کلچر، فوڈ ٹیکنالوجی، ایگریکلچر، ہارٹی کلچر، پیرامیڈیکل کورسز وغیرہ میں بھی مواقع دستیاب ہیں۔

کامرس

روایتی کورسز: اس کے تحت بی کام (جنرل)، بی کام (آنرس) وغیرہ میں داخلہ لیا جا سکتا ہے۔

بارہویں تک اس کی تعلیم حاصل کرنے والے زیادہ تر طلبا آج بھی مارکیٹ میں بی کام اور ایم کام کی ڈگری لے کر جا رہے ہیں اور اولڈ از گولڈ کی طرز پر کام کر رہے ہیں۔ 21 ویں میں کامرس اسٹریم کے طلبا آگے چل کر لانگ ٹرم اور شارٹ ٹرم، دونوں کو ذہن میں رکھ کر اپنا کریئر آسانی سے بنا سکتے ہیں۔

بی کام آنرس: بی کام آنرس ایک اسپیشلائزڈ کورس ہے، جسے کرنے کے بعد عام طور پر طالب علم کسی بینک، فائنانشیل انسٹی ٹیوٹ، سرکاری و غیر سرکاری ادارے اور صنعت وغیرہ میں کام کر سکتے ہیں۔ ان اداروں میں بی کام آنرس کے طلبا کو تمام شعبوں میں کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ چاہے وہ مارکیٹنگ

ہو، بہی اکاؤنٹ کا ذمہ سنبھالنا ہو یا پھر انتظامی امور دیکھنا۔

بی کام پروگرام: اس میں بنیادی طور پر طلبا کو فائنانشیل اکاؤنٹنگ، اکنامکس، بزنس ادارے، مینجمنٹ، کمپنی لا، مارکیٹنگ، انسانی وسائل، اسٹیٹسٹکس، ای کامرس، مارکیٹنگ اور انگریزی میں کمیونی کیشن وغیرہ پڑھایا جاتا ہے۔ اس میں اچھے مارکس لانے پر آگے ایم کام میں داخلے کا راستہ آسان ہوجاتا ہے۔ بی کام پروگرام میں داخلہ بی کام آنرس کے مقابلے میں کم مارکس پر مل جاتا ہے۔ اس میں طلبا کو صنعتوں کے متعلق ٹریننگ دینے پر بھی زور دیا جاتا ہے۔

سی ایس: سی ایس یعنی کمپنی سکریٹری شپ کا کورس عام طور پر بارہویں کے بعد کیا جاتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف کمپنی سکریٹریز آف انڈیا ملک میں مختلف مقامات پر واقع سینٹروں کے ذریعے تین مرحلوں میں کورس پیش کرتا ہے۔ کمپنی سکریٹری بننے کے دو راستے ہیں۔ اول بارہویں کے بعد اور دوسرا گریجویشن کے بعد۔ بارہویں پاس طلبا کو تین اسٹیج کا کورس کرنا ہوتا ہے۔ پہلے اسٹیج پر فاؤنڈیشن، دوسرے ایگزیکیٹو اور تیسری سطح پر پروفیشنل پروگرام ہوتا ہے۔ سی ایس کمپنی کی انتظامی ذمے داریوں کو سنبھالنے کا کام کرتا ہے۔ کمپنی میں رہنما ہدایات پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں، اس کی ترقی کس سمت میں ہو رہی ہے، اسے کمپنی سکریٹری دیکھتا اور جائزہ لیتا ہے۔ اسے لا، مینجمنٹ، فنانس اور کارپوریٹ گورننس جیسے کئی موضوعات کی معلومات رکھنی ہوتی ہے۔ کارپوریٹ قانون، سیکورٹی قانون، کیپٹل مارکیٹ اور کارپوریٹ گورننس کا علم ہونے کی وجہ سے سی ایس کمپنی کا اندرونی قانونی ماہر اور کمپلائنس آفیسر ہوتا ہے۔

سی اے: چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا کورس انسٹی ٹیوٹ آف چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ آف انڈیا کراتا ہے۔ یہ کورس تمام ڈسپلن کے طلبا کو روزگار کی الگ راہ دکھاتا ہے۔ عام طور پر ہائی اسکول میں کامرس پڑھنے والے یا بی کام کے طلبا کا یہ سب سے پسندیدہ کورس ہے، کیونکہ اس کے نصاب میں کامرس کا حصہ زیادہ ہے۔ بی کام کے بہت سے نصاب کو سی اے میں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ روایتی کریئر کے طور پر سی پی ٹی امتحان پاس کرکے سی اے یعنی چارٹرڈ اکاؤنٹنسی کا کورس جوائن کیا جاتا ہے اور تین سطحوں پر اسے مکمل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بعد کسی بھی کمپنی، بینک، فائنانشیل انسٹی ٹیوٹ کے ساتھ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، ایکوئٹی اسٹاک، ٹریزری یا کسی کمپنی میں آڈٹ ڈپارٹمنٹ میں جا سکتے ہیں۔ سی اے بن کر خود کی پریکٹس کر سکتے ہیں۔

کوسٹ اکائونٹنسی: کوسٹ اکاؤنٹنسی کا کورس اور کام سی اے سے ملتا جلتا ہے۔ ملک میں اشیا کی اصل قیمت کا اندازہ کرنے کے کام کوسٹ اکاؤنٹنٹ کرتا ہے۔ اس کے لیے بھی کورس اور ٹریننگ کی ضرورت پڑتی ہے۔ دی انسٹی ٹیوٹ آف کوسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹنٹ آف انڈیا اس کے لیے مختلف مراحل میں کورس مکمل کراتا ہے۔ اسے مکمل کرنے والے طلبا کو کوسٹ اکاؤنٹنٹ اور اس سے وابستہ عہدوں پر کام کرنے کا موقع ملتا ہے۔ کوسٹ اکاؤنٹنٹ بننے کے لیے 12 ویں پاس طالب علم کو پہلے فاؤنڈیشن کورس کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لیے دی انسٹی ٹیوٹ آف کوسٹ اینڈ ورکس اکاؤنٹنٹس آف انڈیا میں درخواست دینی ہوتی ہے۔ ایڈمشن کے لیے جون اور دسمبر میں داخلہ امتحان ہوتا ہے۔ فاؤنڈیشن کورس کے بعد انٹر میڈیٹ کورس کرنا ہوتا ہے اور پھر سی اے کی طرح ہی فائنل امتحان دے کر کورس مکمل ہوتا ہے۔ اس کورس کو خط و کتابت کے ذریعے بھی کیا جاسکتا ہے۔

فائنانشیل اسٹڈیز: کامرس کے طلبا کے لیے فائنانشیل اسٹڈیز کا کورس بھی کئی دہائیوں سے مختلف تعلیمی اداروں میں کرایا جارہا ہے۔ یہ بی کام آنرس سے تھوڑا الگ ہے۔

یہ فائنانس کے شعبے میں اسپیشلائزیشن کی طرف لے جاتا ہے۔ سرکاری کے علاوہ آج یہ کورس پرائیویٹ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بھی چلایا جارہا ہے۔ اس کے بعد طلبا فائنانشیل اسٹڈیز میں ایم اے کر سکتے ہیں۔ دہلی یونیورسٹی سے ایسے طلبا فائنانس میں ایم اے کر سکتے ہیں۔

معاشیات: معاشیات آنرس کی تعلیم ویسے تو آرٹس اور سوشل سائنس سے وابستہ سمجھی جاتی ہے، لیکن کاروباری سرگرمیوں سے متعلق ہونے کی وجہ بی کام کے طلبا اس میں مزید دلچسپی لیتے ہیں۔ بارہویں میں کامرس کی تعلیم حاصل کرنے والے بہت سے طلبا آگے چل کر اقتصادیات میں اسپیشلائزیشن کی طرف بڑھتے ہیں۔ وہ معاشیات سے بی اے اور ایم اے کرتے ہیں۔ آگے چل کر مختلف کاروباری، مالیاتی اور بینکنگ اداروں میں ماہر کے طور پر کام کرتے ہیں۔

ریاضی آنرس: کامرس کے ایسے طلبا، جنھوں نے ریاضی میں بہت اچھے نمبر حاصل کیے ہیں، ان کے لیے ریاضی اور اس سے متعلق اسٹیٹسٹکس اور آپریشنل ریسرچ جیسے کورس بھی کالجوں میں دستیاب ہیں۔ داخلے کے دوران لازمی طور سے ریاضی کی مانگ کی جاتی ہے۔ بی ایس سی ریاضی یا بی ایس سی کے اسٹیٹسٹکس کے کورس کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طویل عرصے سے چل رہے ہیں۔

کمپیوٹر سائنس: کامرس کے طلبا، جنھوں نے بارہویں میں کمپیوٹر سائنس کی تعلیم حاصل کی ہے، وہ گریجویشن میں کمپیوٹر سائنس سے اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ بی ایس سی کمپیوٹر سائنس یا بیچلر ان کمپیوٹر اپلی کیشن میں ایسے طلبا کو بخوبی داخلہ دیا جاتا ہے۔ کمپیوٹر میں ڈپلومہ کورس کے ذریعے بھی آپ اپنی پڑھائی جاری رکھ سکتے ہیں۔

پروفیشنل کورسز: کامرس کے بعد بی بی اے، بی بی ایس، بیچلر آف ایکچوری سائنس، ایل ایل بی، اکاؤنٹنگ اینڈ فائنانس، بیچلر آف فائنانشیل اینڈ انویسٹ منٹ انالائسس، بیچلر آف فارین ٹریڈ مینجمنٹ کورسز کا بھی ذکر کیا جاسکتا ہے۔ کارپوریٹ کلچر کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شعبے میں آگے بڑھنے کے لیے انگلش اور انٹرنیٹ پر کام کرنے کی معلومات ضروری ہیں۔

آرٹس

روایتی کورسز: ہسٹری، اکنامکس، جغرافیہ، سوشیولوجی، سائیکولوجی، پالٹیکل سائنس، میتھس، فلاسفی، اردو، ہندی، انگریزی، فارسی، سنسکرت، ہندوستانی دیگر زبانیں، غیر ملکی زبانیں وغیرہ سبجیکٹ میں بی اے اور بی اے آنرس میں داخلہ لیا جاسکتا ہے۔

پروفیشنل کورسز: بی اے، ایل ایل بی (آنرس)، بی اے (ماس کمیونکیشن)، بیچلر ان فائن آرٹس، بیچلر ان ایلیمنٹری ایجوکیشن، نرسری ٹیچرس ٹریننگ، بیچلر ان ٹورزم اسٹڈیز، ڈپلومہ ان فیشن ٹیکنالوجی، بیچلر آف سوشل ورک، بیچلر آف فزیکل ایجوکیشن، فٹ ویئر ڈیزائننگ، اکسسریز ڈیزائننگ، بیچلر آف ویزوول آرٹس وغیرہ میں داخلہ لیا جاسکتا ہے۔ لا میں وکالت کے علاوہ بھی مواقع ہیں۔ ٹیچنگ شعبے میں پروفیسر بھی بنا جاسکتا ہے۔ انکم ٹیکس، سیل ٹیکس اور ٹیکسیشن میں بھی کریئر بنایا جاسکتا ہے۔ کارپوریٹ لائیر بھی بنا جاسکتا ہے۔ آج کل لیگل پروسیس آؤٹ سورسنگ بھی ایک نیا سیکٹر ہے جس میں غیر ملکی کمپنیاں ہندوستانی لا کا کام ہندوستان میں ایجنسیوں سے کرواتی ہیں۔ سول جج کا امتحان بھی دے سکتے ہیں۔

بارہویں بورڈ کے امتحان میں مارکس اگر کم ہوں تو بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے میں ہنر اور صلاحیت کی بنیاد پر سرٹیفکیٹ اور ڈپلومہ سطح کے کورس کا سہارا لے کر کریئر میں چار چاند لگا سکتے ہیں۔

■

SYED.FAKHRE IMAM, F-57/12, 3rd Floor, Sir Syed Road, Batla House, Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025

مصنف: ایلا مہتہ، مترجم: الطاف فاطمہ

(گجراتی افسانہ)

دھواں

''با''... آج شام پانچ بجے والی ٹرین سے واپس آ رہی ہیں۔ شوبھا نے کلائی والی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ابھی تو چار ہی بجے ہیں۔ ایک گھنٹہ پڑا ہے۔ ایک اتھاہ اور گہرے خلا کے احساس کا ساگر موجیں مار رہا تھا اور وہ ان موجوں کی لپیٹ میں گھری ہوئی تھی۔ اب کچھ کرنے کو باقی تو تھا نہیں۔ ایک انتظار کے سوا۔

میز پر پڑی کتابوں کے ڈھیر میں سے اس نے انگریزی کی ایک کتاب اٹھالی۔ پہلے ہی صفحے پر ایک بالکل ننگی عورت کی تصویر تھی۔ خالص طبی اور جراحی کے نقطۂ نظر اور مقصد سے بنائی ہوئی یہ تصویر مصور کی چابکدستی اور مہارت کا منہ بولتا ثبوت تھی کہ بدن کا ایک ایک رونگٹا واضح اور نمایاں تھا۔ اس نے کتاب کو زور سے بند کر کے میز پر پٹخ دیا۔ کمرے سے نکل کر بالکنی میں جا کھڑی ہوئی۔ تیسرے پہر کی چلچلاتی دھوپ یہاں سے وہاں تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی حدت اور تمازت ہر ہر کونے کھدرے اور چیز کے جگر تک اتری ہوئی تھی۔ اس پورے ماحول پر دھوپ اس طرح پھیلی ہوئی ہے جیسے میرے اندر اور باہر چھایا ہوا اتھاہ اور بیکراں سناٹا، میری رگ میں اترا جا رہا ہے.. وہ سوچتی رہی اور یہ خلا عام کھوکھلا پن نہیں ہے۔ بلکہ ٹھوس کثیف اور نہ سمجھ میں آنے والا احساس ہے۔ بس اب شفق پھولنے ہی کو ہے پر شام کا یہ منگاری روپ بھی اوجھل ہو جائے گا۔ گھور اور کالی رات کے اندھیرے چاروں اور اترنے لگیں گے۔ ایک مدھم سی تھکی تھکی مسکان ہونٹوں پر لیے وہ نیچے اتر آئی تھی۔

ساڑھے چار بجے کے قریب اپنی کار اسٹیشن کی طرف لے جاتے ہوئے ڈاکٹر شوبھا نے اپنے آپ کو ملامت کی۔ ''اب تم نیورائک ہوتی جا رہی ہو شوبھا۔ اب تو یہ سورج، سورج نہیں ایک کالی ٹکیہ ہی دکھائی دیتا ہے۔''

ایک دم ہی جیسے پیٹ میں ایک گولہ سا گھوم گیا۔ یہ سوچ کر کہ پتہ نہیں گھر بالکل ٹھیک ٹھاک تھا کہ نہیں۔ ہر چیز اپنی جگہ پر تو ہے نا... خیال ہی خیال میں اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ آٹومیٹک طور پر چلتی ہوئی فلم کی طرح ایک ایک کمرہ پوری صفائی ستھرائی اور سجاوٹ کے ساتھ سامنے آتا رہا۔ کونہ کونہ آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ ایک دم صاف ستھرا۔ پھر بھی کوئی نا کوئی بھول چوک تو ہو ہی گئی ہوگی۔ سچی بات یہ ہے کہ کلینک اور پریکٹس کی مصروفیتیں اس کے اور اس کی گرہستی کے درمیان حائل رہتی تھیں۔ اس کی ساس کو ہر بات کا پتہ رہتا تھا۔ ہر چیز پر ان کی نگاہ رہتی تھی۔ ہر طرح کی کوتاہی اور کمی کی خبر رہتی تھی اور اس کو تو بس تھوڑا سا ہی وقت ملتا تھا ستانے اور کمر ٹکانے کا۔ چلو خیر جب تک 'با' کو پتہ نہ چلے تب تک ہی غنیمت ہے۔ گاڑی چلاتے چلاتے ایک دم ایک ہول سی اٹھی۔ جیسے پیٹ کی گہرائیوں سے برف کی ٹھنڈی سلاخ ابھر کر چلتی چلتی حلق میں آ کر اٹک گئی ہو۔ جھرجھری سی آئی۔ ایک اور ہاتھ پیر ٹھنڈا کر دینے والے خیال نے اس کو بوکھلا دیا۔ ''باپ رے! بڑی بھول ہوگئی سبود کی فوٹو پر سے دھول صاف کرنا تو یاد ہی نہ رہا اور تصویر کے فریم پر ڈالا ہوا پھولوں کا ہار تو سوکھ کر کھڑنک ہو گیا تھا۔ مرجھائے ہوئے ہار کو اتار کر تازہ تازہ پھولوں کا ہار ڈالنا تو یاد ہی نہیں اور اس کے ساتھ ہی تو باپو جی کا فوٹو ہے اور 'با' کا تو یہ ہے نا کہ باہر سے آتے ہی سیدھی اس طرف جاتی ہیں۔

خشک ہار کی پیلی اور مرجھائی ہوئی پتیوں کے ہالے میں سبود کی سیاہ اور سفید تصویر میں اس کا سدا مسکراتا ہوا مکھڑا، بالکل ایسا ہی ہے جیسے پچھلے برس کے دیوالی کارڈ پر چھپا ہوا کرشن مہاراج کا مکھڑا۔ وہی کارڈ جو اب ردی کاغذوں کے ڈھیر میں سب سے اوپر پڑا ہوا ہے۔

اس خیال کے ساتھ ہی ایک اور ایسی بات یاد آ گئی، کہ شوبھا کے ہاتھ بڑی مشکل سے ہی اسٹیئرنگ پر قابو رکھ سکے۔

''وہ ایش ٹرے، اس کی راکھ.. وہ ٹیلی فون کے پیچھے رکھی ہوئی کم بخت ایش ٹرے۔ نہیں معلوم کہ صاف بھی کر دی تھی کہ نہیں۔ بھئی وہ اس میں چندروز ٹیلی فون پر بیٹھ کر باتیں کرتے کرتے بے تحاشہ سگریٹ پیتی اور راکھ جھاڑتی رہی تھی نا۔''

اب فرض کرو کہ ''با'' یہ پوچھ بیٹھیں کہ ''یہ یہاں ٹیلی فون کے پیچھے ایش ٹرے رکھنے کی ضرورت کیا تھی؟''

اب کیا کروں! ہے رام اب اتنا سے کہاں کہ گھر واپس جاؤں اور ٹیلی فون کے پیچھے رکھی ایش ٹرے ہٹا کر کہیں اور رکھ دوں۔

مجبوراً گاڑی چلتی رہی، وہ کار پارک میں چھوڑ کر اسٹیشن کے اندر داخل ہوگئی۔ ٹرین بالکل ٹھیک وقت پر پہنچ گئی، سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا۔ شوبھا اسٹیئرنگ وہیل سنبھال کر خاموشی سے بیٹھ گئی تو ''با'' برابر والی سیٹ پر بیٹھ چکی تھیں۔ ایک دوسرے میں گتھے ہوئے اور بالکل جام ٹریفک میں سے بچ بچا کر نکلنے کی کوشش میں لگاتار

ہارن دینے اور رہ رہ کر بریک لگانے کے ساتھ ساتھ چیونٹی کی چال سے رینگ رینگ کر گاڑی کو نکال کر اپنے راستے پر ڈالنے کے داؤں پیچ کا اسے اچھی طرح تجربہ تھا۔ سو اس وقت بھی ٹریفک کے شکنجے میں پھنسی گاڑی کو بخیر وعافیت نکال لے ہی گئی۔ بالکل مکینیکل انداز میں۔

پورے راستے ''با'' بولتی رہیں۔ جوابًا وہ بولتی رہی۔ اس کی آواز اور باتوں کو سن کر ہی ''با'' کو ایسا لگا جیسے سفر کی ساری تھکن اور بے آرامی دور ہوگئی۔ باتوں نے شوبھا کے چہرے کو دمکا دیا تھا۔ ایک رونق سی آگئی تھی منہ پر۔ شوبھا کی باتیں تو کنبے اور پریوار ہی کے گرد گھومتی تھیں یہ تو اس کا سدا کا دستور تھا، اس کا تو ہر کام ہی حسب معمول اور ایک ڈھرے پر ہی ہوا کرتا تھا۔ کنبے اور پریوار کی بات کا ہندوستان میں یہ ہے کہ اس کی کوئی انت نہیں ہوتی جیسے کنبے برادری کی لمبائی اور پھیلاؤ لمبا چوڑا ویسے ہی ان کی بات چل پڑے تو بالکل ہی اپنے پریوار سے چلتی چلتی خالاؤں، چچیوں، پھوپھیوں، ممانیوں سے بڑھتی بڑھتی بھانجے بھانجی اور بھتیجا بھتیجی سے بھی آگے رشتوں ناتوں بلکہ ناتے پرناتے پر بھی پہنچ کر رکتی نہیں۔ حد یہ کہ دور کے وہ کنبے ناتے دار تک زیر بحث آجاتے ہیں جو کبھی کبھار صرف شادی و غم کے موقعے ہی پر نظر آتے ہیں۔

کار سڑک پر دوڑی چلی جا رہی تھی۔ خیر اس کو تو دوڑتے ہی رہنا تھا۔ ''با'' کے منہ سے نکلی ہوئی باتوں کے بول کار کی کھڑکی کے شیشوں کے باہر نکل نکل کر تیسرے پہر کی شام کی ہوا کے ساتھ اڑے چلے جا رہے تھے۔ شوبھا اب بالکل چپ تھی... اس کا دھیان تو دور کہیں ٹیلی فون کے پیچھے پڑی سگریٹوں کی راکھ سے بھری ایش ٹرے کی راکھ میں سے ہوا کے ساتھ ساتھ اڑتی دھول کی طرف تھا۔

آخر کو گھر آ ہی گیا۔ گاڑی روکتے ہی ملازم کو بلانے کے لیے دو لگاتار ہارن دیے، تاکہ وہ سامان اتار کر اندر لے جائے اور خود با کا انتظار کیے بنا ہی گاڑی سے نکل سیڑھیاں لانگھتی پھلانگتی ٹیلی فون تک جا پہنچی۔ ارے ایش ٹرے تو غائب ہے۔ اچھا خیر بھاڑ میں جائے، ہوگی کہیں۔ ارے بھئی خود ہی تو میں نے صبح صبح وہاں سے اٹھا کر الماری میں چھپا دی تھی۔

گاڑی سے اترتے ہی ''با'' سیدھی تصویروں کی طرف چلی گئی تھیں۔ بابو جی اور سبود... دھول کے غبار تلے چھپے مسکرا رہے تھے۔ شوبھا کو دلہن بن کر اس گھر کی چوکھٹ پر اترے چار ماہ ہی گزرے تھے کہ بابو جی اور سبود دونوں کا اکٹھے ہی ٹریفک کے حادثے میں دیہانت ہوگیا تھا۔ ایک بار ایسا ہوا کہ بلوری شیشے کا ایک تازہ تازہ نئے شگوفوں سے سجا ہوا گلدان زمین پر گر کر چور چور ہوگیا تھا۔ بس شیشے کے ان ہی ان گنت بے شمار کرچیوں کی طرح وہ اپنے جیون کے ہر ہر لمحے کو چن چن کر سمیٹتی رہی تھی۔ ایک طرف ڈال دینے کے لیے۔

''با'' نے بڑے دھیان اور پیار سے تصویروں پر جمی دھول کو صاف کیا۔ پھر فرش پر ماتھا ٹیک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر اٹھ کر وہ با کی طرف مڑ کر دھیمی سی ملامت انگیز آواز میں بولی: ''شوبھا پیاری اس تصویر پر اتنی ڈھیر ساری دھول کہاں سے لا کر جمع کر دی۔ یقیناً تم کو تازہ پھول ڈالنا اور سارے طور طریق تو یاد ہی رہے ہوں گے۔''

آدمی نہ کام کرنے کے سو بہانے تراش لیتا ہے، بیماری کے، ملاقاتیوں کے آنے اور ایسے ہی دوسرے عذر کرسکتا ہے۔ پر شوبھا کو الفاظ مل ہی نہ سکے، وہ چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گئی۔

بالکنی کے جنگلے سے ٹیک لگائے کھڑی سوچ رہی تھی۔ اب ''با'' اشنان کرنے اور دھونے دھلانے میں لگی ہوں گی۔ اچانک ہی اس کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ہلچل سی ہونے لگی، ایک تیز خواہش کے تحت معلوم ہوا تھا کہ اس کی انگلی اور انگوٹھے کی رگ رگ تڑپ رہی ہے۔ دھڑک رہی ہے۔

جب رہ نہ سکی تو بھاگ کر کمرے کے اندر گئی سگریٹ کا پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگا لیا۔ جلدی دو چار کش لیے بھوکے ٹوٹے کی طرح بے صبری سے۔ ہائے رام! کیسی لالسا ہوتی ہے۔ جیسے کسی پیاسے کو پانی پی کر تسکین ہو جاتی ہے۔''

ایک سگریٹ پھونک چکی تو اسی کے جلتے ہوئے ٹکڑے سے دوسرا سگریٹ جلا لیا... اب یہ دوسرا بھی ''با'' کے باہر آنے سے پہلے پہلے ختم ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے کھڑے کھڑے ہی تیزی سے سوٹے لگانے اور گہرے گہرے کش کھینچنے شروع کر دیے۔

پر سوچنے کی بات ہے یہ چوری چھپے کام کب تک چلے گا اور کب تک یہ راز اس کی ساس کی نظروں پر آشکار نہ ہوگا۔ آخر کب تک چوری چوری کام چلے گا... کلینک! ہاں خیر کلینک میں بیٹھ کر تو آرام سے پیا جاسکتا ہے۔ پر یہ دھڑکا تو پھر بھی رہے گا نا کہ نہ جانے کب ''با'' ٹہلتی ہوئی منہ اٹھائے آنکلیں۔

غسل خانے کے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز نے اس کے خیال کے تسلسل کو توڑ دیا۔ جلدی سے سگریٹ پھینک کر کنکھیوں سے ادھر دیکھا ''با'' ابھی اندر ہی تھیں۔ باہر نہیں آئی تھیں۔ اطمینان کی گہری سانس لے کر قریب والے بید کے صوفے میں دھنس گئی۔ اف تو یہ ہے... یہ زندگی... اس کا بے انت پھیلاؤ اور کٹھورتا.. وقت لمحہ لمحہ سیکنڈ سیکنڈ گزرتا رہتا ہے اور پھر یہ کہہ دنیا کی کوئی طاقت دھکا دے کر اسے پیچھے نہیں کرسکتی۔ آگے بڑھنے سے نہیں روک سکتی۔ اف.. یہ وقت...

اچانک تھکن کی ایک لہر اس کے اندر اٹھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میلوں پیدل چل کر آئی ہو اور سر پر بھاری بوجھ اٹھائے بھاری قدموں چلتی ہوئی تھکن سے چور، چور... اب کچھ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ جی چاہتا تھا بس یوں ہی بیٹھی رہے، سگریٹ ہاتھ میں لے کر۔

''آج کیا کلینک نہیں جانا تمھیں'' ''با'' کی آواز سنائی دی۔

''بس اب جا رہی ہوں۔'' پرس اٹھا کر اس کا کھٹکا بند کیا۔ پر اسی طرح صوفے میں دھنسی بیٹھی رہی۔ کلینک کا مستقبل مایوس کن تھا، اس کے خیال سے ہی وحشت ہو رہی تھی۔

وہاں آکر اس کے انتظار میں بیٹھنے والوں کی صورتوں پر افسردگی اور مایوسی برستی ہوئی دیکھی۔ کچھ تو جینے کا آسرا بھی چھوڑ بیٹھے تھے۔ ان کے بارے میں سوچنا تو فنا اور عدم کی وادی میں اترنے کے برابر تھا۔ ہر طرف یہی صدائیں سننے میں آتی تھیں: ''ڈاکٹر میرے حلق سے تو ایک بھورا بھی نہیں اترتا۔ کچھ بھی تو نہیں کھایا جاتا، کل سے سوڈگری بخار ہے تپ چڑھی ہوئی ہے، پیر کی سوجن تو ذرا بھی کم نہیں ہوئی۔'' کچھ گلے پھولے ہوئے غدودوں کی وجہ سے گڑگڑا رہے تھے۔ کچھ گلٹیاں اور ٹیومر ایسے جان لیوا تھے کہ جیتے جی جان چھوڑنے والے نہ تھے۔ معالج اور مرض کے درمیان مسلسل رسہ کشی جاری تھی۔

ایک لمبی اور گہری سانس لے کر وہ اٹھنے ہی کو تھی کہ ادھر سے ''با'' آنکلیں، شوبھا کو بیٹھا دیکھ کر انھوں نے بید کی کرسی کھینچ کر صوفے کے سامنے کرلی اور اس پر بیٹھ گئیں۔

''ارے شوبھا کیا زوردار بیاہ تھا۔ سچ بڑا مزہ آیا۔ اب دیکھو نا... میں نے کتنے سال بعد کوئی بیاہ دیکھا ہے، بس تمھاری شادی کے بعد پہلی بار گئی ہوں۔ تمھارے نہ جانے کا ماما جی کو بڑا دکھ تھا۔ میں نے تو ان کو بہت سمجھایا کہ بھئی وہ ڈاکٹر ہے اور اس کو اپنے کام کی بڑی لگن ہے... ہر دم اپنے مریضوں کی چنتا ہی لگی رہتی ہے۔ وہ کیسے سب کو چھوڑ کر یہاں چلی آتی... کیوں ٹھیک کہا نا میں نے؟ ہاں کوئی جھوٹ تو نہیں کہا۔''

لو... اب ان کی بات کا جواب دو... ''با'' اپنی بات

پوری کر کے اس کی طرف سے کسی جواب یا کسی بھی بات کی منتظر تھیں۔ ٹھیک بات ہے نا کہ بات کا جواب بات سے دیا جائے، بھئی ایک نے کوئی بات اٹھائی دوسرے نے بات میں بات نکالی۔ یہ سوال جواب دھرپنچ، لینا دینا نہ ہو تو گھر تو بس گھر ہی نہ رہے۔ جمی ہوئی ٹھٹری ہوئی برف کی سل بن کر رہ جائے۔ ایک مصور کی پہلودار اسٹل لائف کی تصویر کی طرح، سو جواب میں کچھ کہنا لازم ٹھیرا تو اس نے بات کی۔ خاموشی کے وقفے کو توڑا تو آواز کی جھنکار کچھ زیادہ ہی تھی۔ ''دلہن بن کر کیسی لگ رہی تھی... اندو... بہت بھاری جوڑا پہنا تھا؟''

''ہاں... ہاں تو اور کیا... اور انھوں نے وہ میک اَپ کرنے والی لڑکی گھر بلائی تھی، پورے سو روپے لیے اس نے پرواہ کیا میک اَپ کیا تھا۔ اندو تو گڑیا لگ رہی تھی۔''

''با'' نے بات کرتے کرتے زبان روک لی اور پھر سنبھل کر بولیں: ''پتہ ہے شوبھا... کبھی کبھی مجھے بڑی ہنسی آتی ہے۔ یہ سوچ کر کہ یہ جو ماڈرن لڑکیاں ہیں نا یہ سب کی سب گڑیائیں ہی تو لگتی ہیں۔ رتی برابر جوان میں کوئی آئیڈیلزم ہو۔ بالکل بے آدرش۔ گھٹیا خیالات کوئی سوجھ بوجھ ہوتی ہی نہیں۔''

شوبھا شام کے سناٹے میں گھلتی تاریکی کو گھورتی رہی۔ شام کے سائے تیزی سے دھرتی پر اترتے چلے آرہے تھے اور اس کی نگاہیں تاریکی کے قلب میں گھسی جا رہی تھیں۔

''اچھا اب اٹھو چلو تم کو دیر ہو رہی ہے۔'' ''با'' نے کہا۔

شوبھا نے خاموشی سے اٹھ کر زینے کے کٹھرے کا سہارا لیا اور دھیرے دھیرے زینہ اترنے لگی۔ سیڑھیاں اتر کر وہ گھر سے باہر آ گئی۔ گاڑی میں بیٹھ کر کار اسٹارٹ کرتے کرتے رک گئی۔ کچھ سوچ کر انجن بند کر دیا۔ ''چلو آج پیدل ہی کلینک چلتے ہیں، ٹہلتے ہوئے۔'' کلینک گھر سے اتنی دور تو نہ تھا اور آج اس کا جی بھی نہ چاہ رہا تھا گاڑی چلانے کو۔

کلینک میں مریضوں کا ہجوم اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جیسے بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ ایک نظر ان کی طرف ڈالتے ہوئے آگے بڑھی تو سب سے پیچھے ادھیڑ عمر کا صاف ستھرے اور معقول لباس میں جو شخص بیٹھا تھا، اس کو دیکھتے ہی مسکرا کر بولا۔ ''میں بڑی دیر سے آپ کے انتظار میں بیٹھا ہوں...''

دونوں کی نگاہیں چار ہوئیں تو شوبھا نے بھی جواب میں کچھ کہنے کے بجائے مسکرانے پر ہی اکتفا کیا۔ الفاظ کا سہارا لیے بغیر ہی جیسے بات ہو گئی... خوف کی ایک لہر شوبھا کے اندر دوڑ گئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے یہ شخص اس کی سوچ اور دلی خیالات کو پڑھ سکتا ہے، بڑی آسانی سے جان سکتا ہے۔ جلدی سے اس نے اپنی نظریں دوسری طرف پھیر لیں اور کرسی پر تن کر سیدھی بیٹھ کر اس نے معذرت کے طور پر کہا ''مجھے افسوس ہے مجھے دیر ہو گئی۔'' بات بہت معمولی تھی پر ایک خاص خشک لہجے اور اونچی آواز میں جیسے کسی کو سنا کر کہہ رہی ہو۔ ایک کے بعد ایک مریض اس کے پاس آتے گئے کسی کو اس نے کہا کہ کسی اسپیشلسٹ سے مشورہ کرے، کسی کو ایکسرے اتروانے کی ہدایت کی اور بعض کو صرف اسپرین استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ یہ

سب اس کے روزمرہ دستور کا حصہ تھا اور مریضوں کی قطار کے پیچھے، سب سے آخر میں بیٹھے شخص کی مسکراتی ہوئی نظریں جیسے اس کو تقویت دیتی اور اعتماد اور حوصلے کی روشنی برقی قوت کی طرح بجتی رہتی۔ تاہم اس کے اندر ہی اندر ایک اور موج اور رو بھی چڑچڑاہٹ، بے دلی اور تھکن سے بھرپور جاری رہتی اور ایک خیال اور خواہش کے تحت وہ اس سب کو نظر انداز کر دینا چاہتی تھی۔

چوری چوری وہ اس کی طرف دیکھتی۔ وہ اس کو اپنی طرف دیکھتے پا کر مسکراتا تو وہ بوکھلا جاتی، اس کی مسکراہٹ سے اس کو عجیب سا دکھ محسوس ہوتا۔ کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے اردگرد پھلجھڑیاں سی چھوٹتی ہوں جیسے کوئی شریر سا بچہ پھلجھڑی ہاتھ میں لیے اس کو زور زور سے گھما رہا ہو، اور وہ اس میں جھڑتے آگ کے چمکتے پھولوں اور جگنوؤں کے گھیرے میں آ گئی ہو۔

زیادہ تر مریض جا چکے تھے اور اب اس کی باری تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر وہ میز کی طرف گیا۔ اچانک ہی شوبھا کے اندر سگریٹ کی طلب شدت سے انگڑائیاں لینے لگی، اپنی انگلیوں سے ایک سگریٹ کھینچ کر نکالا، وہ فوراً اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اپنے لائٹر سے اس کا سگریٹ سلگایا...

''شکریہ''

تب وہ اس کے سامنے والی کرسی پر جم کر بیٹھ گیا۔

''لتیکا کل رات سے بڑی بیمار ہے ڈاکٹر۔ کیا آپ کرپا کر کے اس کو دیکھنے چلیں گی؟''

اس کی آواز میں بھی اس کی مسکراہٹ کی طرح ہراساں اور سراسیمہ کر دینے والا آسیبی اسرار تھا۔ یہ بات اس نے اتنے دھیرج اور نرمی سے کہی تھی۔ تاہم دعوت اسی ایک اشارے ایک کنائے میں چھپی تھی۔ یہ لہجہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا کہ اس کی بات ضرور مان لی جائے گی۔ ان کہے بولوں اور شبدوں کی تہہ میں چھپی یہ بات جیسے کہتا ہو کہ مجھے سب پتہ ہے ہاں میں اچھی طرح جانتا ہوں۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی ''آؤ چلتے ہیں... ایک دو دن اور دیکھتے ہیں پھر ہو سکتا ہے کہ کسی اسپیشلسٹ سے مشورہ لینا پڑے۔''

اس نے شوبھا کا کالا بیگ اٹھا لیا اور اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ آگے بڑھ کر اس کے لیے کار کا دروازہ کھول دیا، تھوڑے سے توقف کے بعد وہ اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ بڑی نرمی اور دھیرج سے دروازہ بند کر کے اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔

ویسے تو لتیکا ابھی تک ٹھیک نہ ہوئی تھی پر یہ حال بھی نہ تھا کہ ڈاکٹر کو گھر بلایا جائے۔ اس کے باوجود شوبھا نے ساری شام لمبے عرصے سے بیمار بوڑھی کنواری خاتون اور اس کے کنوارے بھائی کے ساتھ گزاری۔ دونوں نے مل کر اپنی حد بھر اس کی شام کو رنگین اور روشن کرنے کی کوشش کی۔ بڑی دیر وہ بیٹھی بھائی بہن کی سیدھی سادھی بہتی ندی کے دھارے کی طرح مسلسل بے تحاشہ چٹ پٹی باتوں کے مزے لیتی رہی۔ ایسی مزے دار باتیں جن کی جھنکار اور بازگشت ایک گھر کے در و دیوار میں جان ڈال دیتی ہے اور جن کی وجہ سے گھر، گھر معلوم ہوتا ہے۔ ان باتوں میں وہ اتنی مگن ہو گئی کہ اجنبی ہونے کا ڈر بھی زائل ہو گیا۔ اب وہ ان کے درمیان بلا خوف و خطر بیٹھی تھی۔ ان کے

ساتھ باتوں نے اس کے گرد ایک مضبوط حصار تان دیا تھا کہ جیسے ریشم کے خول کے اندر وہ ریشم کے کیڑے کی طرح محفوظ ہوگئی ہے۔

''ڈاکٹر کرپا کر کے آج ہمارے ساتھ بھوجن کرلو'' لتیکا نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ان کی بات پر شوبھا اچھل پڑی تھی۔

''ارے ساڑھے نو بج گئے۔'' با ''تو راہ دیکھ رہی ہوں گی۔ واپس جو آگئی ہیں۔'' وہ ان سے معذرت کرنے لگی۔

''نہیں شکریہ... بہت دیر ہوگئی ہے۔ پھر کبھی سہی۔''

''بھئی مجھے آپ کے ٹیسٹ کا کوئی پتہ نہیں کہ کیا پسند ہے کیا نہیں۔ ویسے میرے پاس باہر کے مختلف برانڈوں کے سگریٹ اور شرابیں رہتی ہیں۔'' وہ کہنے لگا۔

''ارے نہیں... یہ تو کبھی کبھاری کا شغل ہے۔'' منہ ہی منہ میں کہتی ہوئی وہ ٹیلی فون کی طرف مڑگئی۔ کلینک پر فون کر کے کمپاؤنڈر کو ہدایت کی کہ ''کلینک بند کردے، آج اتنا ہی کافی ہے۔'' اب وہ بہت گھبرائی ہوئی اور ڈری ہوئی تھی۔ اتنی دیر لگادی اس نے۔ ایسے فضول بے کار ہنسی ٹھٹھوں میں... بے ضرورت لطیفے اور باتیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ زندہ ہوتی جارہی ہے۔ زندگی اس کے اندر از سرِ نو داخل ہورہی ہے۔ یہی تو وہ چاہتی نہیں تھی۔ اپنے اندر انگڑائی لیتی ہوئی زندگی کی ذرا سی رمق بھی اس کو پریشان کردیتی تھی۔

وہ اس کو اپنی کار پر گھر تک چھوڑنے آیا۔ اس کا کالا بیگ اٹھا کر اس کے پیچھے زینہ چڑھنے لگا تو اس نے روک دیا۔

''نہیں... بس شکریہ...''

اپنی جگہ سے ہلے بغیر بڑی نرمی اور ملائمت سے اس شخص نے پوچھا ''تو کیا آپ کے دوبارہ بلانے کے لیے دیدی کو پھر بیمار پڑنا ہوگا۔ ایسا نہیں ہوسکتا کہ آپ پھر بھی چکر لگائیں، صرف ملنے کے لیے... ہم نے واقعی آپ کی اس ملاقات کو بڑا انجوائے کیا۔ بات یہ ہے کہ ہم دونوں بہت اکیلے اور تنہا ہیں۔''

اب وہ زیادہ دیر یہاں رک نہیں سکتی تھی۔ منہ ہی منہ میں ''ہاں کیوں نہیں یقیناً...'' کہتی ہوئی تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی۔

گھر میں گھستے ہی دروازے پر ہی اگربتی کی خوشبو کا ایک بھپکا اس کے سواگت کو موجود تھا... وہ بیٹھک کے کمرے میں داخل ہوگئی، میز پر رکھی سبود اور باپو جی کی تصویروں کے فریموں پر پھولوں کے موٹے موٹے تازہ ہار پڑے ہوئے تھے۔ ان کے سامنے اگربتیوں کا ایک پورا گچھا جل رہا تھا۔ پوری فضا اور کمرے کا ماحول خوشبودار دھوئیں کے مرغولوں کی لپیٹ میں بڑا بوجھل بوجھل سا ہورہا تھا۔ تصویروں کی طرف منہ کیے بیٹھی ''با'' گیتا کا پاٹھ کرنے میں مصروف تھیں۔

چپ چاپ آہستہ سے وہاں سے گزرتی ہوئی وہ اپنے بیڈروم کی طرف چلی گئی۔ اپنے پرس میں سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور الماری میں چھپا دیا اور غسل خانے میں جا کر خوب اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا۔ اینٹی

سپٹک کی کلیاں کیں اور بیٹھک میں واپس آگئی۔ ''با'' اب گیتا کا پاٹھ ختم کرچکی تھیں۔

''میں ایک مریض کو دیکھنے چلی گئی تھی، وہاں دیر ہوگئی۔'' یہ کہتے ہوئے وہ کھانے بیٹھ گئی۔

اچانک ہی ''با'' کے ہاتھ جہاں کے تہاں معلق رہ گئے۔ شوبھا کو یاد آگیا وہ اچھل کر سبود کی تصویر کے آگے جا کھڑی ہوئی۔ سبود اس کے سامنے مسکرا رہا تھا۔ بے جان اور بہت دور دراز سے آتی ہوئی مسکان، تازہ اور شاداب پھولوں کے حلقے میں آتی ہوئی مردہ اور دور افتادہ مسکان۔ جب وہ دونوں کھانا کھارہی تھیں تو ''با'' مستقل باتیں کیے چلی جارہی تھیں۔ پر شوبھا کے کانوں کے پار مشکل سے ہی کوئی بات جا پارہی تھی۔ وہ تو جیسے اب تک لتیکا ہی کے گھر بیٹھی تھی۔ آفٹر شیو لوشن کی تیز خوشبو ہلکے پھلکے قہقہے...'' آپ دیکھیں نا... ہم کتنے اکیلے ہیں...'' اس کی آنکھیں اس کے منہ سے نکلنے والے شبد... وہ تو ابھی تک انھیں کے درمیان موجود تھی یہی کچھ اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں، یہی کچھ اس کے کان سن رہے تھے۔

''ارے ہم تو بالکل اکیلے ہیں۔'' اور یہ الفاظ اس نے صاف طور پر اپنے کانوں سے سنے تو اچھل پڑی، حیران رہ گئی ارے یہ تو ''با'' کہہ رہی تھیں۔ اس نے ان کی طرف دیکھا۔ ہاں وہی تو تھیں اب تک بولے ہی چلی جارہی تھیں۔

''ارے یہی تو میں نے تمھارے ماما جی سے کہا۔ آپ ہماری چنتا نہ کریں بھیا... تو کیا ہوا جو ہم اکیلے ہیں۔ میں اور میری شوبھا تو سارے جگ سے ہی نیارے ہیں۔'' شوبھا نے کھاتے کھاتے پلیٹ کو گھورا۔ ''با'' کہہ رہی تھیں:

''ارے ماما تو تیری بہت تعریف کرتے ہیں۔ ان کا تو منہ نہیں تھکتا تیری تعریف کرتے۔ وہ تو کہتے ہیں کہ شوبھا تو سنت سادھنی ہے۔ اس کا جیون تو ایک سلگتی ہوئی اگربتی ہے کہ آپ جل رہی ہے اور دوسروں تک کیا پورے جگ کو اپنی مہک بانٹ رہی ہے۔ ارے وہ تو ستی ساوتری ہے۔'' یہ کہتے کہتے ''با'' کی آواز ٹوٹ گئی۔ شوبھا نے اپنی ساس کی طرف دیکھا اور تیوری چڑھالی۔ ''با'' اپنے سامنے والے کونے کو جس طرف تصویریں رکھی تھیں گھورنے لگیں۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چل دی۔

''با'' نے فرش پر گری ہوئی کوئی چیز اٹھالی۔

''شوبھا یہ کیا؟'' ''با'' کی آواز تڑختی ہوئی لگ رہی تھی۔ جیسے دھوپ میں تپتی ہوئی سوکھی پیاسی بنجر زمین تپتے تپتے ایک بار ہی تڑخنے اور چٹخنے لگتی ہے اور اس میں بڑے بڑے شگاف پڑنے لگتے ہیں۔ اپنی لرزتی ناتواں انگلیوں سے اس نے جلے ہوئے سگرٹ کا ٹکڑا اٹھالیا۔

(گجراتی زبان سے سیما شرما نے انگریزی میں ترجمہ کیا۔)

◻

ماخذ: بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل اور ہندی افسانے 'سچ کہانیاں'، تالیف: کالی برائے خواتین، ترجمہ: الطاف فاطمہ، ناشر: عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور (پاکستان)

ہماری واٹر پالیسی

جمال نصرت

ہماری واٹر پالیسی یا پانی کے سلسلے سے ہماری حکمت عملی کس طرح کی ہونی چاہیے؟ ہمارے ملک کے پاس دنیا کا 4فی صد پانی ہے اور زمین 2.4 فی صد ہی ہے اس لحاظ سے ہمارا فی ایکٹر دنیا سے 16 فی صد زیادہ پانی کا مالک ہے مگر دوسری طرف ہماری آبادی دنیا کی آبادی کا 16 فی صد ہے اور ایک عام ہندوستانی دنیا کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں صرف چوتھائی پانی کا حقدار ہے۔ ہمارے قریب 75 فیصد لوگ کھیتی سے ہی اپنی روزی روٹی چلاتے ہیں۔ اس لیے ہمارے لیے پانی اور اس کی حکمت عملی اور بھی اہم ہو جاتی ہے۔ ہاں رقبے کے حساب سے ہم پانی دار ہیں۔ لیکن آبادی ہمیں پانی پانی کر رہی ہے۔

پانی بہت اہم ہے۔ پانی سے ہی زندگی ہے۔ یہ ضرورت بھی ہے ایک قیمتی چیز بھی ہے۔ ہمارے یہاں پانی اور برف ملا کر بارش کی شکل میں $4000x10^9$ کیوبک میٹر پانی برستا ہے جس میں صرف $690x10^9$ کیوبک میٹر زمین کے اوپر اور $432x10^9$ کیوبک میٹر زمین کے نیچے چلا جاتا ہے جسے ہم حاصل کر سکتے ہیں اور باقی تین چوتھائی سمندر کی نذر ہوتا ہے ہمارے یہاں بارش صرف تین مہینوں میں ہوتی ہے جو کہ راجستھان میں کم سے کم 200 ملی میٹر اور میگھالیہ میں 11000 ملی میٹر زیادہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ پانی جمع کرنے کے وسائل صرف ندی، تالاب، نالے، جھیلیں، زمین کے اندر اور پیڑ پودھے ہیں۔

ایک ہندوستانی کی 1950 میں پانی کی حصے داری 5000 کیوبک میٹر فی سال تھی جو 2000 میں گھٹ کر 1800 اور یہ اعداد 2050 میں صرف 1200 کیوبک میٹر رہ جائیں گے اور وہ ایک مشکل وقت ہوگا۔ پلاننگ کرنا کہ سینچائی، گھریلو کام، پن بجلی، صنعت، اور نیویگیشن (Navigation) میں بانٹنا اور بھی مشکل ہو جائے گا۔ فی الحال ترجیحات کچھ اس طرح ہیں۔ پینے کا پانی، سینچائی، پن بجلی، ماحولیات، صنعت جس کا کھیتی سے تعلق ہو۔ صنعت، نیویگیشن، اور پھر دیگر۔

پانی کو ہمیشہ اہم مانا گیا ہے اور اس پر اہل عقل نے صلاح دی ہے کہ سات اصولوں کو ذہن میں رکھنا چاہیے جو درج ذیل ہیں:

(1) پانی کے علم میں بہت سمجھ کی ضرورت ہے۔
(2) اس کے ناپنے میں سچائی اور ایمانداری ہونی چاہیے۔
(3) اس کے جمع کرنے میں عقل کا استعمال ہو۔
(4) اس کے بٹوارے میں انسانیت ضروری ہے۔
(5) اس کے بچانے میں ایمانداری پہلی شرط ہے۔
(6) اس کے استعمال میں مدد کا جذبہ ہونا چاہیے۔
(7) اس کی بربادی پر سزا کا حکم ہو۔

1950 میں ہماری اناج کی پیداوار 500 لاکھ ٹن تھی۔ جو 2000 میں بڑھ کر 2080 لاکھ ٹن ہو گئی۔ یہ ایک کارنامہ ہی کہا جا سکتا ہے جو ہماری واٹر پالیسی کی ہی وجہ تھی جس کو کاشت کاروں، انجینئروں، اور پلاننگ کرنے والوں نے سرانجام دیا۔ اب یہ پیداوار بڑھ کر 2400 لاکھ ٹن ہو گئی ہے۔ ہمارا 2025 کا نشانہ 3500 لاکھ ٹن ہے جب ہماری آبادی بہت زیادہ بڑھ چکی ہوگی اور ہر قابل کاشت حصہ کام میں لیا جا رہا ہوگا۔ ہم نے ستمبر 1987 میں حکم نامہ کی شکل میں انہی حکمت عملی بنائی اور پھر اپریل 2002 میں اس میں تبدیلیاں کی گئیں۔ پانی جو ہماری زمین پر برستا ہے وہ کس کا ہے یہ بھی ایک اہم نکتہ ہے۔ اس کے علاوہ چونکہ پانی بننے اور اجڑنے کی وجہ ہے اس لیے ماحول کو بھی اور زیادہ ترجیح دیے جانے کی ضرورت ہوگی۔ ہماری موجودہ واٹر پالیسی کے اہم نکات اس طرح ہیں۔

(1) خبررساں سسٹم — ملک اور صوبوں میں پانی برسنے، دھوپ، گرمی، برف گرنے کا پورا حساب رکھا جائے۔ اور مل بھی سکے۔

(2) پانی کا حساب— کل کتنا برسا، دھوپ سے کتنا اڑ گیا، پہاڑوں پر کتنی برف پگھلی۔ زیر زمین کتنا پانی نکالا گیا۔ کتنا سمندر میں چلا گیا، کتنا بھاپ بن کر اڑا کتنا آدمیوں، جانداروں، تالابوں، ندیوں، جھرنوں میں الگ الگ گیا۔

(3) حساب رکھنے کا طریقہ — ملک، صوبے، ضلع، تحصیل، بلاک میں ایک ہی طرح سے ایک ہی اکائی میں رکھا جائے جس سے سمجھنے اور خبر بھیجنے میں دشواری نہ ہو ان سب کے لیے ایک جیسے پروفارمے رائج ہوں اور اس حساب کو رکھنے والے افراد کی ذمے داری کا تعین کیا جائے۔

(4) اولیت — استعمال الگ الگ ہیں مگر اولیت ہوں گی۔ پینے کا پانی، سینچائی، پن بجلی، ماحولیات، کھیتی والی صنعتیں، صنعتیں، نیویگیشن اور اس کے بعد دوسری ضرورتیں۔

(5) زیر زمین پانی — زمین کے نیچے کا پانی بڑی تیزی سے نکالا جارہا ہے اور پانی کی سطح بڑی تیزی سے نیچے جارہی ہے۔ اس پر مناسب قانون اور حدبندی کرنے کی ضرورت ہے۔

(6) پروجیکٹ پلاننگ — جتنا پانی کسی تحصیل، یا صوبے میں ہو اس کی مناسبت سے اگلے استعمال اور منصوبوں کو منظوری دی جائے۔

(7) پینے کا پانی — یہ پانی صاف اور اچھے ذائقے کا ہو اور معیار کے حساب سے ہو جو کہ طے ہیں۔

(8) سینچائی کا پانی — یہ پانی پینے کے پانی سے کم اچھا تو ہوسکتا ہے لیکن ایسا قطعی نہیں جس سے فصلوں اور جانوروں کو نقصان ہو۔

(9) آبادکاری اور جگہ بدلنا — پانی کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے۔ نئے منصوبوں کی وجہ سے اکثر لوگوں کو اپنی جگہ اور گھر چھوڑنے پڑتے ہیں۔ ان کے لیے جگہ، رہائش اور روزگار کا انتظام کیا جائے اور معاوضہ بھی دیا جائے۔

(10) اقتصادی وسائل — لوگوں کو دیے جانے والے پانی کی مناسب قیمت وصول کی جائے۔ یہ رقم ایسی ہو کہ سرکار پانی کا انتظام کرنے کے لائق بنی رہے۔ یہ دام اتنے کم بھی نہ ہوں کہ لوگ پانی کو برباد کریں اور اتنے زیادہ بھی نہ ہوں کہ لوگ پانی جیسی اہم چیز کو لے بھی نہ سکیں۔

(11) پانی اور حق — پانی کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ پانی اس کا ہے جہاں پانی برستا ہے، یا جس کی زمین سے نکالا جاتا ہے یا جو لاکر پانی پہنچاتا ہے۔ یہ سب ٹھیک ہوسکتا ہے مگر وہی اس کا انتظام بھی کرے جو اس کا استعمال کرتا ہے۔ وہی آمدنی اور خرچ کا بھی حساب رکھے۔

(12) نجی لوگوں کی حصے داری — اکثر لوگ پانی اپنی صنعتوں، اپنے بڑے بڑے فارموں یا کاروباروں کے لیے یک مشت نہروں، اور ٹیوب ویلوں سے لیتے ہیں۔ اس کا بھی مناسب انتظام ہو۔

(13) پانی کا معیار — سطحی اور زمینی پانی کے معیار کیسے ہوں یہ بتائے گئے ہیں۔ ان کی برابر جانچ بھی ضروری ہے۔ سیور کے پانی کے لیے بھی مناسب انتظام اور ان کے معیار کی وجہ سے اخراج کا معقول انتظام ہو۔ نامناسب ہونے پر سزا کا بھی تعین ہو۔

(14) پانی کے زون — ملک میں پانی کی موجودگی اور فراہمی کے حساب سے زون بنائے جائیں، جس سے وہاں کے لیے خاص قسم کے احکام جاری کرنے میں سہولت ہو۔

1950 میں ہماری اناج کی پیداوار 500 لاکھ ٹن تھی۔ جو 2000 میں بڑھ کر 2080 لاکھ ٹن ہوگئی۔ یہ ایک کارنامہ ہی کہا جاسکتا ہے جو ہماری واٹر پالیسی کی ہی وجہ تھی جس کو کاشت کاروں، انجینئروں، اور پلاننگ کرنے والوں نے سرانجام دیا۔ اب یہ پیداوار بڑھ کر 2400 لاکھ ٹن ہوگئی ہے۔ ہمارا 2025 کا نشانہ 3500 لاکھ ٹن ہے جب ہماری آبادی بہت زیادہ بڑھ چکی ہوگی اور ہر قابل کاشت حصہ کام میں لیا جارہا ہوگا۔

(15) پانی بچانا — پانی کی اہمیت جگ ظاہر ہے۔ پانی بچانا ملک کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے مناسب قانون اور بیجا استعمال کرنے والوں کو سزا دی جائے۔ اصول، طریقے اور صلاح بھی لوگوں کو دی جائے جس سے عمل درآمد آسان ہو۔

(16) باڑھ کا پانی — ہماری 20 فی صد زمین باڑھ کی زد میں ہے۔ پچھلے 50 سالوں میں 3 فیصد کو بچایا گیا ہے۔ باقی کے لیے بھی کام ہو اور اسے بچایا جائے۔

(17) ندی اور سمندر میں بہہ جانے والی مٹی — بہت زیادہ مٹی ہر سال ندیوں اور سمندر میں پہنچ جاتی ہے۔ اس سے رقبہ گھٹ رہا ہے۔ سمندر اتھلے ہورہے ہیں۔ ان کو بچایا جائے۔

(18) سوکھے والے علاقے — جہاں بارش کم ہوتی ہے، وہاں کے لیے خاص پروگرام بنائے جائیں۔ زمین سے نکالنے اور پانی کے جمع کرنے کا بھی طریقہ ڈھونڈھ کر منصوبے بنائے جائیں۔

(19) منصوبوں کی جانچ — منصوبے بہت بنتے ہیں، شروع بھی ہوتے ہیں، لیکن کبھی کچھ زمین نہ ملنے کبھی مقدمے ہوجانے۔ کبھی معاوضہ نہ بٹنے وغیرہ کی وجہ سے ان کے پورے ہونے میں بہت سال بیت جاتے ہیں۔ ان کو دیکھا جائے اور ذمے داریوں کا یقین بھی کیا جائے۔

(20) پرفارمینس میں اضافہ — جس مقصد کے لیے یہ منصوبہ بنا تھا ان سے اس مناسبت سے فائدہ اگر نہیں ہورہا ہے تو اس کو دیکھا جائے۔ اکثر کوئی معمولی سی ترمیم اسے زیادہ فائدے والا بنا سکتی ہے۔ اس کو بھی دیکھ کر مشورے لیے جائیں۔

(21) مرمت اور نیاپن — سائنس اور تکنالوجی کی نئی نئی ترقیوں کو اپنے منصوبوں میں شامل کرلیا جائے اور یہ برابر دیکھا جائے کہ اس سے اور زیادہ فائدہ کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔ منصوبوں کو موثر بنایا جاسکتا ہے۔

(22) بچاؤ — بہت دھن لگا کر منصوبے تیار ہوتے ہیں، ڈیم، بندھے، نہریں تالاب، ٹیوب ویل، وغیرہ وغیرہ۔ ان کو خراب ہونے اور بچاؤ کا بھی مناسب انتظام رکھنا چاہیے۔ فرداً فرداً دیکھ کر اقدام کیے جائیں۔ جس سے فائدہ برابر ملتا رہے۔

(23) سائنس کی نئی ایجادات — اپنے اور باہری ملکوں میں پانی کے سلسلے سے بہت سی نئی ایجادات ہورہی ہیں۔ یہ پریشانی عالمگیر ہے تو اس کی جانکاری اور اس کا عمل درآمد جتنی جلدی ہوگا وہ اتنا ہی اچھا بھی ہوگا۔ اس پر عمل ہو۔

(24) ٹریننگ — کوئی ایک محکمہ اتنے سبھی نکتوں پر ماہر نہیں ہوسکتا اور اپنے محکمے کے کام کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے نئی تکنیک کے حساب سے کرنے کے لیے سبھی میں تعلق ہو اور خلوص بھی ہو۔ ایک دوسرے کو ٹریننگ دیں۔

یہ اہم نکات ہیں مگر ضروری ہے کہ سب لوگوں کو معقول وقت پر مناسب مقدار میں واجب قیمت پر معیاری کا پانی ملے اور اس اہم عنصر کی فراہمی میں غلط لوگوں کو سزا بھی دی جائے۔ اگر ضروری ہو تو حکمت عملی میں ضرورت کے مطابق تبدیلیاں بھی لائی جائیں۔

■

Prof. Jamal Nusrat, Roshni, 509/148,
Old Hyderabad, Lucknow - 226007 (UP)

اختناق الرحم

مشرف علی

اختناق الرحم عربی زبان میں باؤ گولہ کو کہتے ہیں اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ عربی زبان میں 'اختناق' کے لفظی معنی 'گھٹ جانے' کے ہیں اور 'الرحم' کے لفظی معنی 'بچہ دانی' کے ہیں۔ چونکہ اس مرض میں مریضہ کو اپنے رحم کے مقام پر گھٹن جیسی تکلیف محسوس ہوتی ہے اسی مناسبت سے اس مرض کو عربی زبان میں 'اختناق الرحم' کے نام سے موسوم کردیا گیا اسی طرح عرف عام میں 'باؤ گولہ' کہنے کی وجہ یہ ہے کہ مریضہ کو اپنے شکم میں گیس کے ایک گولے کے اٹھنے کا احساس ہوتا ہے جو کہ تھوڑے ہی وقفہ کے بعد اپنے گلے میں اٹکا ہوا بتاتی ہے۔ لاطینی زبان میں اس کو ہسٹیریا Hysteria کہتے ہیں جس کو Dissociative Disorder کے طور پر شمار کیا جاتا ہے جو کہ ایک قسم کا Syndrome ہے۔ اس مرض کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں افعال عصبیہ گاہ مختل ہوجاتے ہیں گاہے مفقود ہوجاتے ہیں اور مریضہ شدت جذبات سے بے قابو ہوجاتی ہے یا حد معقولیت سے تجاوز کرجاتی ہے۔ اطبائے قدیم میں سے بعض نے اس کو اعصابی اور بعض نے دماغی اور بعض نے رحم کی خرابیوں سے پیدا ہونے والا مرض قرار دیا ہے۔ لیکن غور وخوض کے بعد نتیجتاً یہ تینوں ہی اعضا وقوع مرض کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں مثال کے طور پر دماغ میں پائے جانے والے ایک حصہ Hypothlamus سے ہارمون کی ریزش کے عدم تناسب یا دماغ سے نکلنے والے اعصاب رحم کو بقدر حاجت غذا فراہم کرنے میں اپنا رول ہم آہنگی سے ادا نہ کرپانے یا پھر رحم کے آلام زدہ ہونے کے نتیجے میں دماغی توازن برقرار نہ رہنے یا اعصاب کے افعال کی بدنظمی کے نتیجے میں اختناق الرحم جیسی ماہیت المرضی کیفیت رونما ہوتی ہے۔

ماہیت المرضی کیفیت: اختناق الرحم یا ہسٹیریا کو اطبائے قدیم اعصابی مرض اس بنیاد پر کہتے ہیں کیونکہ اکثر و بیشتر یہ مرض رحم کے مبتلائے مرض ہونے کے بعد ہی ظہور پذیر ہوتا ہے اور جیسا کہ ہم جانتے ہی ہیں کہ رحم کا تعلق اعصاب ہی کے ذریعہ دماغ سے ہوتا ہے اسی لیے اعصابی مشارکت کے طور پر رحم کے مرضی اثرات دماغ تک پہنچتے ہیں اور اختناق الرحم جیسی کنڈیشن ظہور میں آتی ہے اسی لحاظ سے بعض اطبائے قدیم اس مرض کو امراض دماغیہ میں شمار کرتے ہیں۔ انھوں نے دماغی مرض ہونے کی ایک وجہ اور بیان کی ہے وہ یہ کہ رحم کے اندر مواد فاسدہ کے بکثرت اجتماعی کے سبب رحم کے اندر سمیت وعفونت پیدا ہوجاتی ہے جس کے الجزات دماغ پر غیر طبعی اثرات مرتب کرتے ہیں جس کے نتیجے میں دورہ کی شکل وقوع میں آتی ہے جس کی نوعیت یہ ہوتی ہے کہ رحم مواد ردیہ کی عفونت سے اذیت محسوس کرکے سکڑتا ہے اس کنڈیشن کو اطبا تشنجی کیفیت سے تعبیر کرتے ہیں اور اسی تشنجی کیفیت کے احساسات دماغ تک صعود کرتے ہیں علاوہ ازیں دیگر شکل یہ ہے کہ مواد فاسدہ سے زہریلے اجزا جذب ہوکر عروق کے ذریعے بالائی جانب صعود کرتے ہیں جو کہ دماغ میں پہنچ کر مرضی کیفیات پیدا کرتے ہیں اور بعض اوقات رحم کے اندر دم حیض رک جانے سے بھی رحم کی زود حساسیت تشنج کا سبب بنتی ہے اور بعض اوقات مواد ردیہ رحم میں نفوذ کرکے اختناق الرحم جیسی مرضی کیفیت کا باعث بنتے ہیں۔ انھیں اطبائے قدیم کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے علامہ نفیس نے فرمایا کہ ''جب رحم

عام طور پر اختناق الرحم کے دورے کی کیفیت صرع کے دورے جیسی ہی ہوتی ہے البتہ اس مرض میں مریضہ آہستہ سے گر کر بے ہوش ہوتی ہے اور دورہ کے ساتھ ہی محرک و مدرک قوتوں میں ضعف لاحق ہوجاتا ہے بلکہ دورہ کے وقوع سے قبل ہی مریضہ کے حواس باختہ ہوجاتے ہیں اور مریضہ کسل و ماندگی کا احساس کرنے لگتی ہے اور اچانک دونوں پیروں کی پنڈلیوں میں ضعف و ناتوانی محسوس ہونے لگتی ہے اور جسم کی رنگت ماند پڑنے لگتی ہے۔ آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں اور پیڑو کے مقام سے اوپر کی طرف کسی شے کے صعود کا احساس ہونے لگتا ہے جس کی رسائی قلب تک محسوس ہوتی ہے اور اس کے بعد ہی اس کی عقل مفلوج ہوجاتی ہے اور دفعتاً بے ہوشی آجاتی ہے۔ اعضا کی حس و حرکت باطل ہوجاتی ہے۔

میں زہریلے مادے بکثرت مجتمع ہوجاتے ہیں تو قلب و دماغ ایک قسم کی اذیت محسوس کرنے لگتا ہے ان ہی زہریلے مادوں کے دفعیہ کے لیے طبیعت کی آمادگی دوروں کی شکل میں درپیش آتی ہے اور پوشیدہ طور پر ان مادوں کو قدرے قد سے تحلیل کر کے دفع کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے جس سے کچھ دنوں کے بعد اس مرض کے عارضے موقوف ہوجاتے ہیں اور مریضہ افاقہ پاکر صحت یاب ہوجاتی ہے۔

تجزیے کے مطابق یہ مرض ایسی خواتین میں بیشتر دیکھا گیا ہے جو کہ اپنے احساسات کو دوسروں کے سامنے بیان کرنے میں قاصر رہتی ہیں بالخصوص وہ عورتیں جو اپنی سوشل پوزیشن کو سوسائٹی کے سامنے حقیر گمان کرتی ہوں طب جدید میں بھی اس مرض کے پنپنے کی بات ایسی ہی عورتوں میں بتائی جاتی ہے جو مختلف قسم کی سماجی بندشوں، مذہبی پابندیوں وغیر مناسب خانگی ماحول کے زیر دباؤ نفسیاتی کش مکش میں گرفتار ہوں اور اپنی صعوبتوں کے تدارک کی التجا اپنے اہل خانہ کے سامنے نہ کرسکیں یہی وجہ ہے کہ یہ مرض درمیانہ عمر کی عورتوں، مراہق بچیوں اور اسکول جانے والی دوشیزاؤں میں زیادہ عام ہوتا ہے۔

علامات: اس مرض کی علامات مختلف مریضاؤں میں جداگانہ طور پر دیکھنے کو ملتی ہیں۔ البتہ پچاس فی صدی علامات نظام اعصاب کے متاثر ہونے جیسی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ مرض دوروں، یا نوبتوں کی شکل میں رونما ہوتا ہے جو کہ بعض مریضاؤں میں طویل وقفہ کے بعد اور بعض مریضاؤں میں بعجلت وجود میں آتے ہیں۔

عام طور پر اختناق الرحم کے دورے کی کیفیت صرع کے دورے جیسی ہی ہوتی ہے البتہ اس مرض میں مریضہ آہستہ سے گر کر بے ہوش ہوتی ہے اور دورہ کے ساتھ ہی محرک و مدرک قوتوں میں ضعف لاحق ہوجاتا ہے بلکہ دورہ کے وقوع سے قبل ہی مریضہ کے حواس باختہ ہوجاتے ہیں اور مریضہ کسل و ماندگی کا احساس کرنے لگتی ہے اور اچانک دونوں پیروں کی پنڈلیوں میں ضعف و ناتوانی محسوس ہونے لگتی ہے اور جسم کی رنگت ماند پڑنے لگتی ہے۔ آنکھیں اشکبار ہوجاتی ہیں اور پیڑو کے مقام سے اوپر کی طرف کسی شے کے صعود کا احساس ہونے لگتا ہے جس کی رسائی قلب تک محسوس ہوتی ہے اور اس کے بعد ہی اس کی عقل مفلوج ہوجاتی ہے اور دفعتاً بے ہوشی آجاتی ہے۔ اعضا کی حس و حرکت باطل ہوجاتی ہے۔ حتیٰ کہ مریضہ بات چیت کرنے سے بھی قاصر ہوجاتی ہے جب کہ اشارتاً تدارک تکلیف کی التجا کرنے کی کوشش کرتی رہتی ہے مگر آواز منہ سے باہر نہیں نکلتی اور اسی طرح دیگر حرکات ارادیہ بھی معدوم ہوجاتی ہیں۔ کچھ مریضائیں دفعتاً چیخ مار کر گر پڑتی ہیں اور بآواز بلند گریہ وزاری کرنے لگتی ہیں اور اپنے ہاتھ کے اشارے سے اپنے گلے میں کسی گولے کے اٹکے ہونے کی شکایت کرتی ہیں اور اپنے سر کو پیچھے اور گلے کو آگے کی طرف ابھارنے کی کوشش کرتی ہیں جس کا مقصد گلے میں اٹکا ہوا محسوس ہونے

والا گولہ نکالنے کی کوشش کرنا ہوتا ہے اور بار بار اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور بعض مریضائیں سینہ کوبی کرنے لگتی ہیں یا پھر اپنی رانوں پر دست زنی کرنے لگتی ہیں اور کبھی کبھی اپنی آنکھوں کو ملنے لگتی ہیں۔ دست و پا تشنج زدہ ہونے کی وجہ سے کبھی اٹھتی ہیں اور کبھی لیٹتی ہیں اور بعض مریضائیں اپنے سر کے بالوں کو نوچنے لگتی ہیں۔ بعض مریضائیں اپنے پاس و پڑوس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو کاٹنے دوڑتی ہیں اور بعض مریضاؤں پر ہذیانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ تنفس میں بے قاعدگی اور سرعت پیدا ہوجاتی ہے دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے اور مریضہ سرد آہیں بھرنے لگتی ہے۔ شکم منتفخ معلوم ہونے لگتا ہے اور وہ عنق ممتلی ہوجاتی ہیں۔ چہرے پر سرخی آجاتی ہے دست و پا سرد پڑجاتے ہیں۔ کچھ وقفے کے بعد دورہ کی شدت میں کمی آجاتی ہے اور مریضہ کو لرزہ طاری ہونے لگتا ہے۔ اس دوران مریضہ کو چھونے پر ایک دم چونک پڑتی ہے اور بعض مریضائیں دورہ ختم ہونے کے بعد بے ہوش ہوجاتی ہیں اور بے خبر پڑی رہتی ہیں اور دوبارہ دورہ پڑنے پر مذکورہ علامات کم وبیش پھر عود کر آتی ہیں اور یہ دورے متعدد بار واقع ہوسکتے ہیں۔ دورہ کے اختتام پر مریضہ یا تو رونے لگتی ہے یا پھر ہنسنے لگتی ہے یا پھر بحالت سکوت بستر پر پڑی رہتی ہے اور بعض مریضاؤں کو تے آکر نیند آجاتی ہے اور پھر دورہ کی کیفیت رفع ہوجاتی ہے اور مریضہ جب سو کر جاگتی ہے تو خود کو صحت یاب محسوس کرتی ہے۔

اختناق الرحم کے دورے عام طور پر ایام حیض ہی کے دوران وقوع میں آتے ہیں جو کہ چند دقیقوں سے لے کر چند گھنٹوں تک قائم رہ سکتے ہیں اور بعض مریضاؤں میں کئی کئی یوم تک بھی دورہ کی مدت برقرار دیکھی گئی ہے۔

دو دوروں کے درمیان کے وقفہ کی علامات: اسی وقفے کے دوران کی علامات بھی سبھی مریضاؤں میں یکساں ظاہر نہیں ہوتیں بلکہ الگ الگ مریضاؤں میں جدا جدا علامات دیکھی گئی ہیں۔ مثال کے طور پر بعض مریضائیں اس وقفے کے دوران شاداں و فرحاں دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے برخلاف بعض مریضائیں گریہ وزاری کرتی دیکھی گئی ہیں۔ اسی طرح بعض مریضائیں اس وقفے کے دوران خود کو لائق وفائق خیال کرتے ہوئے اعزا و اقارب کے سامنے ڈینگیں مارنے لگتی ہیں جب کہ بعض مریضائیں اپنے کو کمترین سمجھ کر ہمدردی کی خواہاں ہوتی ہیں اور بعض کے اندر اپنے عزائم میں استحکام و استقلال قائم نہیں رہتا بلکہ ان کے خیالات میں توہم غالب رہتا ہے اور ان کے احساسات تیز ہوجاتے ہیں۔ علاوہ ازیں بعض مریضاؤں کے جرم بدن پر چبھن کا احساس ہونے لگتا ہے اور گاہے مکمل بدن المناک بتانے لگتی ہیں۔ بعض مریضائیں جوارح میں سنسناہٹ کی شکایت بتاتی ہیں جب کہ بعض مریضائیں بے حس و حرکت صاحب فراش رہتی ہیں۔ بعض مریضاؤں کی چال بے ڈھنگی ہوجاتی ہے اور بعض میں فالج اسفل جیسی کنڈیشن پیدا ہوجاتی ہے جب کہ اعضا میں حس بدستور موجود رہتی ہے بعض فالج نقصی کا شکار ہوجاتی ہیں جب کہ چہرے و زبان فالج زدہ نہیں لگتے

کچھ مریضائیں فالج الحرافی کی شکار لگتی ہیں لیکن ان میں بھی مثانہ ومعائے مستقیم فالج کے اثرات سے عاری ہوتے ہیں یعنی ایسی مریضہ کو اگر استادہ رہنے کو کہا جائے تو وہ بغیر سہارے کے کھڑی رہ سکتی ہیں اور اگر چلنے کو کہا جائے تو بآسانی چہل قدمی کرنے لگتی ہے۔

بعض مریضائیں اس وقفہ کے درمیان ہونے والی معمولی تکالیف کو عظیم ترین خیال کرنے لگتی ہیں اور بے انتہا اذیت کی موجودگی کا اظہار کرتی ہیں ایسی مریضہ کے سامنے اگر ہمدردی کا اظہار کیا جائے تو صعوبات کے مظاہرے میں اضافہ ہوجاتا ہے یعنی مریضہ کی گریہ و بکا میں تزید واقع ہوجاتا ہے اور اگر اسے بے رغبتی و بے اعتنائی کے ساتھ رعب ڈال کر ڈانٹ دیا جائے تو مریضہ سکوت اختیار کرلیتی ہے۔

بعض مریضاؤں میں غیرارادی حرکات میں اضافہ ہوجاتا ہے اور آواز بیٹھ جاتی ہے اور بعض اوقات نفخ شکم میں اتنا تکثر واقع ہوجاتا ہے کہ ناظرین کو حمل کا شبہ ہونے لگتا ہے جب کہ آلۂ مسماع الصدر سے معائنہ کرنے پر قراقر شکم موجود ملتی ہیں۔ بعض مریضاؤں کو ناموافق اشیا کے خورد و نوش کی خواہش بڑھ جاتی ہے اور بعض میں اختناج قلب اور بعض میں غشی وقوع پذیر ہوجاتی ہے بعض مریضاؤں کو خشک کھانسی آنے لگتی ہے اور بعض کو قبض ہوجاتا ہے جب کہ بعض کو اسہال لاحق ہوجاتے ہیں۔ اسی طرح بعض کو احتباس بول اور بعض کو سلسل البول کی شکایت سے دوچار ہونا پڑتا ہے الغرض اس مرض کی علامات وعوارضات مختلف مریضاؤں میں اتنے مختلف ہوتے ہیں کہ جن کا احاطہ دقت طلب ہے۔

علاج و تدابیر: اختناق الرحم کا علاج جداگانہ طور پر درج ذیل دو حصوں میں کیا جاتا ہے: (1) دورہ کی حالت میں (2) وقفہ کی حالت میں۔

(1) دورہ کی حالت میں علاج بالتدبیر کے طور پر مریضہ کی قوت محرکہ و مدرکہ کو بیدار کرنے کے لیے مریضہ کے کانوں کے قریب زور زور سے اس کا نام لے کر پکارتے ہیں اور مریضہ کے بدن کو شدت کے ساتھ جھنجھوڑیں اور اس کے ہاتھوں و پیروں کو مختلف جہات میں موڑیں ساتھ ہی اس کے اہل خانہ سے دریافت کریں کہ مریضہ بحالت صحت کس چیز سے خائف رہتی تھی اگر وہ کسی چیز سے ڈرتی تھی تو وہ چیز اچانک اس کے سامنے لاکر پیش کردیں۔ علاوہ ازیں علاج بالدوا کے طور پر پیاز کا عرق نچوڑ کر دو تین قطرے مریضہ کی حلق میں ٹپکائیں اسی طرح تیز بدبودار اشیا جیسے ہینگ یا بدبودار موزے، جوتے بھی سنگھانا مفید ثابت ہوتا ہے۔ مریضہ کے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ماریں اس کے پیروں کے تلوؤں کی مالش کریں۔

(2) وقفہ کے دوران علاج و تدابیر: مستقل و شافی علاج کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ان اسباب کو دفع کرنے کی کوشش کریں جو وقوع عرض کے لیے معین و مددگار ہوں۔ مثلاً بعض مریضاؤں کی شادی کرنا بھی مفید ثابت ہوتا ہے اسی طرح مریضہ کی الجھن و پریشانی کا سبب اگر اہل خانہ کی بے التفاتی ہو تو اس کو دور کریں بعض مریضائیں رہائشی ماحول سے تنفر ہوتی ہیں ایسی صورت میں تبدیلیِ مکان کا مشورہ دیں۔ بعض اوقات نسوانی امراض بھی اس کے اسباب ہوتے ہیں ایسی حالت میں کسی ماہر امراض نسواں طبیبہ سے علاج کرائیں۔ بعض اوقات نفسیاتی و دماغی امراض بھی اس مرض کا باعث ہوتے ہیں اس کنڈیشن میں ماہرین امراض نفسانیہ و دماغیہ سے علاج کرائیں۔

اختتام دورہ کے بعد ہوش آجانے پر مریضہ کو اس بات کا یقین دلائیں کہ یہ کوئی مہلک مرض نہیں ہے اور دورے کی آمد کے وقت اگر وہ خود پر قابو رکھے اور ہمت سے کام لے تو یہ دورہ ملتوی بھی ہوسکتا ہے۔

پیرس کے ڈاکٹر جین مارٹین اختناق الرحم کی ایک مریضہ پر ہپناٹزم کا تجربہ کرتے ہوئے

ادویاتی نسخہ جات کو اسباب کی روشنی میں مرتب کرنا چاہیے مثال کے طور پر اختناق الرحم کا سبب اگر احتباس حیض ہے تو مدرات حیض ادویہ استعمال کرائی جائیں، اسی طرح سبب مرض اجتماع مواد فاسدہ ہے تو منضج و منقی فضلات ادویہ دیں اگر سبب ضعف دماغ ہے تو مقوی دماغ دواؤں سے افاقہ ممکن ہے اور ضعف اعصاب کے واسطے مقوی اعصاب ادویہ کا استعمال مفید ہے۔ اسی طرح ضعف رحم کی صورت میں مقوی رحم دواؤں ہی سے نجات مل سکتی ہے اور ساتھ ہی تسکین اضطراب قلب و دماغ کے لیے ادویہ مسکنہ کے استعمال کو ترجیح دی جانی چاہیے۔

طب جدید میں چونکہ اس مرض کو نفسیاتی مرض ہی خیال کیا جاتا ہے لہٰذا اطبائے جدید اس مرض میں منومات و مسکنات قلب و دماغ دافع غم وہم و مزیل رنج والم ادویہ ہی کا استعمال بہتر قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے برخلاف طب یونانی میں اس مرض کے اسباب میں دماغ و اعصاب و رحم کی حساسیت کے مدنظر دماغ و اعصاب اور رحم میں مستعمل ادویہ سے نسخہ جات تجویز کیے جاتے ہیں۔

نسخہ حب برائے اختناق الرحم: سنبل الطیب، اسارون، کافور، ہینگ، ہر ایک ایک گرام مشک خالص 80 ملی گرام ترکیب تیاری تمام دواؤں کو ہاون دستہ میں کوٹ کر عرق بادیان میں گوندھ کر 70 ملی گرام کی گولی بنائیں۔

مقدار خوراک و ترکیب استعمال: ایک عدد گولی عرق بادیان 20 ملی لیٹر کے ساتھ بوقت صبح استعمال کرائیں۔

نسخہ حب اختناق الرحم دیگر: عود صلیب، ہینگ، مشک ہر ایک 4 گرام جند بیدستر 7 گرام تمام ادویہ کوٹ پیس کر عرق دارچینی یا عرق بادیان میں گوندھ کر 40 ملی گرام کی گولیاں بنائیں۔

مقدار خوراک و ترکیب استعمال: 2 عدد گولی بوقت صبح ہمراہ عرق بادیان 20 ملی لیٹر استعمال کرائیں۔

■

Dr. Musharraf Ali
122, Tajukhel, Shahjahanpur - 242001 (UP)

نثار احمد صدیقی

خواجہ احمد عباس کی فلمیں

ہندوستانی فلم انڈسٹری میں خواجہ احمد عباس کا نام ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس میدان میں ان کی خاص اہمیت اس لیے ہے کہ انھوں نے فلم کو زندگی سے قریب ترلانے کی کوشش کی اور اس طرح زندگی کو پیش کیا جیسی کہ وہ حقیقت میں ہے۔ ادب کی طرح انھوں نے اپنی فلموں میں بھی حقیقت پسندی کے رجحان کو اہمیت دی۔

اگر چہ باکس آفس پر ان کی فلمیں کبھی کامیاب نہیں ہوئیں لیکن ان کی فلموں کو کافی سراہا گیا اور انھیں عزت ملی جو بہت کم لوگوں کے حصے میں آتی ہے۔

فلم کی چمکتی دمکتی اور مصنوعی سج دھج سے بھری جھوٹ موٹ کی اس دنیا میں جہاں ہر ایک کا مقصد لوٹ کھسوٹ کے سوا کچھ اور نہیں، جہاں بے سر وپا کہانیوں، سستے ناچ گانوں، بے ہودہ مزاق، بے وجہ مار دھاڑ اور قتل و خون جیسے واقعات پیش کر کے عوام کے مزاق کو بگاڑنا انھیں دماغی عیاشی مہیا کرنا ہے، خواجہ احمد عباس نے فلم انڈسٹری کے اس رواج کو توڑا اور اپنی ایک الگ راہ متعین کی۔ ان کی فلموں کا ایک سماجی مقصد ہوتا تھا۔ انھوں نے جتنی فلمیں بنائیں اسی مقصد کو سامنے رکھ کے بنائیں۔

ادیب ہو یا فلم کا ہدایت کار اسے زندگی کے گہرے تجربے اور مشاہدے کی ضرورت ہے۔ خواجہ احمد عباس نے بھی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور زندگی کے بے شمار تجربے ان کے ساتھ تھے، جنھیں انھوں نے اپنی کہانیوں اور فلموں میں پیش کیا۔ اپنی ہر فلم میں انھوں نے کسی نہ کسی اہم مسئلے کو موضوع بنا کر پیش کیا۔ اپنے مقصد کے حصول کے لیے انھیں اکثر اوقات مالی نقصانات سے دوچار ہونا پڑا۔

خواجہ احمد عباس نے اپنی قلمی زندگی کا آغاز کوئی پینتالیس سال قبل اس زمانے کے بمبئی کے مشہور اخبار 'بمبئی کرانیکل' میں فلمی مبصّر کی حیثیت سے کیا تھا۔ اس کے علاوہ بابو راؤ پٹیل کے مشہور انگریزی رسالے، فلم انڈیا، میں بھی ان کے تبصرے اور مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان کے بے لاگ تبصروں نے فلم انڈسٹری میں دھوم مچادی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلکتہ کے نیو تھیٹرز، پونا کی پر بھات کمپنی اور بمبئی کی 'بمبئی ٹاکیز' کا بول بالا تھا۔ دیوی بوس، پی سی بروا، شانتارام اور ہمانسو رائے جیسے ہدایت کاروں کی دھوم تھی اور جن کی بنائی ہوئی فلمیں کلاسک کا درجہ رکھتی تھیں۔ اس زمانے میں پی سی بروا کی فلم 'زندگی' پر ان کا تبصرہ بڑا چونکا دینے والا تھا۔ انھوں نے اس فلم پر بڑی سخت تنقید کی تھی۔ کیونکہ زندگی کے بارے میں بروا کا رویہ قنوطیت پسندی کا تھا۔ بر خلاف اس کے انھوں نے شانتارام کی فلموں کی بڑی تعریف کی تھی جن میں انسانیت کا درس دیا گیا تھا، 'سنت تکارام'، 'دنیا نہ مانے' اور 'آدمی' نے انھیں بے حد متاثر کیا تھا۔ جن میں انسانی قدروں کو پیش کیا گیا تھا۔ اکثر فلم ساز خواجہ احمد عباس کو شانتارام کا ایجنٹ کہنے لگے کیونکہ وہ شانتارام کی فلموں کی ہمیشہ تعریف کرتے تھے اور دوسرے فلم ساز کی فلموں کو برا بھلا کہتے تھے۔ ان ناراض فلم سازوں نے انڈین موشن پکچرز پروڈیوسرز ایسوسی ایشن میں قرارداد منظور کرائی کہ وہ 'بمبئی کرانیکل' کا مقاطعہ کریں گے جب تک کہ خواجہ احمد عباس کو نکال نہیں دیا جاتا۔ انھوں نے اخبار کے مالکان کو الٹی میٹم دے دیا۔ لیکن اس کا نتیجہ الٹا نکلا۔ خواجہ احمد عباس کی تنخواہ سو روپے سے بڑھا کر ایک سو اسی روپے کر دی گئی۔ اکثر فلم سازوں نے ان کو رشوت دینا چاہی کہ وہ ان کی فلموں کی تعریف میں لکھیں لیکن خواجہ احمد عباس نے ان کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی۔

ان دنوں بمبئی کرانیکل میں کنہیا لال آرٹ اور فلم کے مبصر تھے اور خواجہ احمد عباس ان کے معاون کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ جب کنہیا لال کا انتقال ہو گیا تو یہ جگہ خواجہ احمد عباس کو مل گئی۔ اس زمانے میں خواجہ احمد عباس نے فلموں کے لیے تقریباً سترہ کہانیاں لکھیں اور فلم سازوں کو بھیجیں لیکن فلم ساز ان کی کہانی واپس کر دیتے تھے۔ انھوں نے اٹھارویں کہانی 'نیا سنسار' لکھی۔

خواجہ احمد عباس فری لانس صحافی تھے اور فلموں کی تشہیر کا کام بھی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ انھوں نے دیویکا رانی کے بارے میں ایک مضمون لکھا ہمانسو رائے کو یہ مضمون بہت پسند آیا۔ انھوں نے خواجہ احمد عباس کو دوسرے دن صبح چھ بجے بلایا، اور 'بمبئی ٹاکیز میں افسر تعلقات عامّہ کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے کہا۔ خواجہ صاحب نے جز وقتی طور پر افسر تعلقات عامّہ کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا۔

یہاں انھوں نے ایس مکرجی کو اپنی کہانی 'نیا سنسار' سنائی جو ایک ایماندار صحافی کے بارے میں تھی جو سچائی کا علم بلند کرنے کے جرم میں اخبار سے نکالا جاتا ہے اور اس طرح خود اپنا اخبار نکالتا ہے۔ کہانی میں نیا پن تھا اس لیے کہانی کافی پسند کی گئی۔ اس کہانی کا معاوضہ انھیں سات سو پچاس روپے ملا۔ اس فلم میں صحافی کا کردار اشوک کمار نے کیا تھا۔ یہی وہ فلم تھی جس سے اشوک کمار کی ادا کاری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ فلم 1941 میں بنی تھی۔ 'نیا سنسار' کے بعد کہانیوں کا ایک 'نیا' دور شروع ہوا، ان میں ہر فلم کا نام 'نیا' یا 'نئی' سے شروع ہوتا تھا مثلاً 'نئی دنیا' (1942) 'نئی کہانی' (1943) 'نیا ترانہ' (1944)۔

1945 میں شانتارام نے ان کی لکھی ہوئی کہانی 'ڈاکٹر کوٹنس کی امر کہانی' پر فلم بنائی۔ دراصل یہ کہانی ان کی انگریزی میں لکھی ہوئی کتاب سے ماخوذ تھی۔ ہندوستانی ڈاکٹروں کا ایک دفد اس زمانے میں چین گیا تھا۔ جس میں ڈاکٹر کوٹنس بھی شامل تھے۔ یہ کہانی حقیقی واقعے پر بنی تھی اس میں دکھایا گیا تھا کہ کس طرح ایک ہندوستانی ڈاکٹر جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے اور ان کی جان بچانے کی خاطر اپنی جان دے دیتا ہے۔

اسی دوران خواجہ احمد عباس نے انڈین پیپلز تھیٹر کے لیے ایک ڈراما 'زبیدہ' لکھا۔ اس کے ڈائرکٹر بلراج ساہنی تھے۔ اس ڈرامے میں پہلی بار دیو آنند نے کام کیا تھا۔ اس کے علاوہ دمتی ساہنی، چیتن آنند، عذرا ممتاز اور خود بلراج ساہنی نے کام کیا تھا۔ 1946 میں خواجہ احمد عباس نے اپنی پہلی فلم 'دھرتی کے لال' کی ہدایات کاری کی۔ یہ فلم بنگال کے قحط کے متعلق تھی جو ایک بنگالی ڈرامے اور کرشن چندر کے مشہور افسانے 'ان داتا' پر بنی تھی۔ اس میں بلراج ساہنی شمبھو مترا، تروپتی مترا اور انور مرزا نے کام کیا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ قحط پڑنے کی

وجہ سے لوگ اپنے گاؤں چھوڑ کر روٹی کی تلاش میں شہر یعنی کلکتہ آتے ہیں۔ اور یہاں آ کے بھوکوں مرتے ہیں اور استحصال کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یہ ہندوستان کی پہلی حقیقت پسند فلم تھی اور اس وقت بنی تھی جب ستیہ جیت رے کا وجود بھی نہیں تھا۔ اس کی موسیقی پہلی بار روی شنکر نے دی تھی۔ یہ پہلی فلم تھی جو باہمی تعاون کی بنیاد پر بنی تھی خواجہ احمد عباس نے مختلف لوگوں اور دوستوں سے قرض لے کر فلم بنائی تھی۔ جب بمبئی میں یہ فلم نمائش کے لیے پیش کی گئی تو اسی دن فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا اور فلم چل نہ سکی اس طرح زبردست مالی نقصان ہو گیا۔ اور خواجہ احمد عباس چار سال تک اس قرض کی ادائیگی کرتے رہے۔

برصغیر کی تقسیم سے پہلے 1947 میں انھوں نے چترا پروڈکشن کے لیے ’آج اور کل‘ کے نام سے لاہور میں ایک فلم کی ہدایت دی تھی لیکن اس کے فوراً بعد برصغیر کی تقسیم ہو گئی اور سارے ہندوستان میں فسادات شروع ہو گئے اور یہ فلم بھی فسادات کی نذر ہو گئی۔ انھوں نے فلم کے لیے کہانیاں لکھیں۔ ’پنا‘، ’ایکٹریس‘، ’آدھی رات‘، اور ’ناز‘ ایک کے بعد ایک ان کی کہانیوں پر فلمیں بنائی گئیں۔ لیکن جس ڈھنگ سے ان کی کہانیوں کو پیش کیا گیا اس سے خواجہ احمد عباس مطمئن نہیں تھے۔ کہانی کو اس قدر توڑ مروڑ کر پیش کیا جاتا کہ جب فلم سامنے آتی تو لگتا یہ ان کی اپنی کہانی ہی نہیں ہے، جو بات وہ کہنا چاہتے تھے وہ تو رہ گئی۔

جب خواجہ احمد عباس نے فلم سازوں پر اعتراض کیا تو انھوں نے کہا کہ فلم کے لیے اس کے حساب سے کہانی میں تبدیلی ضروری ہوتی ہے۔ عباس صاحب نے اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ تب فلم سازوں نے انھیں چیلنج کیا کہ وہ خود فلم بنا کے دکھائیں۔ خواجہ احمد عباس بہ ذات خود ہدایت کار بننا نہیں چاہتے تھے۔ مجبوراً ان کو اس میدان میں آنا پڑا۔ انھوں نے فلم سازوں کے چیلنج کو قبول کیا اور خود اپنی کہانیوں پر فلمیں بنانے کا ارادہ کیا۔ اس طرح انھوں نے 1951 میں ’نیا سنسار‘ کے نام سے اپنے ذاتی ادارے کی بنیاد رکھی اور اپنی پہلی فلم ’انہونی‘ بنائی۔ لیکن اس سے پہلے انھوں نے ایک کہانی ’آوارہ‘ لکھی تھی۔ اس کہانی میں باپ بیٹے کے درمیان کشمکش کو دکھایا گیا تھا۔ یہ کہانی جرم کے موضوع پر تھی۔ خواجہ احمد عباس نے یہ کہانی ہدایت کار و فلم ساز محبوب کو سنائی کیونکہ فلم ’انداز‘ دیکھنے کے بعد وہ محبوب سے متاثر ہوئے تھے۔ محبوب نے کہانی پسند کی۔ خواجہ احمد عباس چاہتے تھے کہ باپ اور بیٹے کا رول پرتھوی راج اور راج کپور ادا کریں۔ لیکن محبوب دلیپ کمار کو بیٹے کے رول میں لینا چاہتے تھے۔ عباس اس بات پر رضامند نہیں ہوئے۔ جب راج کپور کو معلوم ہوا کہ خواجہ احمد عباس کے پاس ایک اچھی کہانی ہے جس میں وہ باپ بیٹے کے کرداروں کے لیے پرتھوی راج اور ان کو کاسٹ کرنا چاہتے ہیں تو وہ عباس صاحب کے گھر آئے اور کہانی لے لی۔ ’آوارہ‘ 1951 میں بنی۔ سارے ہندوستان میں اس کی دھوم مچ گئی اور بیرون ملک بھی اس کی شہرت ہو گئی۔ خاص طور پر روس میں تو راج کپور اور ’آوارہ‘ کا بڑا چرچا ہوا۔ نرگس اس فلم کی ہیروئن تھی لیکن ان کا رول راج کپور کے مقابلے میں دبا ہوا تھا۔ نرگس نے شکایت کے انداز میں عباس صاحب سے کہا کہ انھوں نے راج کے کردار کو ہی اہمیت دی ہے اور اسے ابھارا ہے۔ نرگس کی اس شکایت کے ازالے کے لیے خواجہ احمد عباس کی ’انہونی‘ میں نرگس کے مقابل راج کپور نے کام کیا تھا۔ یہ دو ہم شکل جڑواں بہنوں کی کہانی تھی جس میں نرگس نے دوہرا کردار ادا کیا تھا۔ اس کا موضوع وہی تھا جو ’آوارہ‘ کا تھا یعنی ماحول کا اثر انسان کی زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے۔

1952 میں خواجہ احمد عباس نے ’راہی‘ بنائی جس میں دیو آنند اور نلنی جیونت نے کام کیا تھا۔ اس فلم کی کہانی ملک راج آنند کے ناول پر بنی تھی۔ یہ آسام میں چائے کے باغات میں کام کرنے والے مزدوروں پر تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ کس طرح ان مزدوروں کا استحصال کیا جاتا ہے۔ 1954 میں ’منا‘ بنی۔ اس کی کہانی ایک ایسے بچے کے گرد گھومتی ہے جو بمبئی جیسے بڑے شہر میں اپنی ماں سے بچھڑ گیا ہے۔ اور اسے مختلف جگہوں پر ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ ہر جگہ اسے مختلف لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اور بعض بڑے دلچسپ کرداروں سے اس بچے کا سامنا ہوتا ہے۔ بالآخر یہ اپنی ماں کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ’منا‘ ہندوستان کی پہلی گانوں کے بغیر فلم تھی۔ اس زمانے میں جب کہ بغیر گانوں کی فلم بنانے کی کوئی بھی جرأت نہیں کر سکتا تھا، عباس صاحب نے اس رواج کو توڑا تھا۔ اس فیسٹیول میں انعام نہیں دیا جاتا، لیکن ’منا‘ کو کافی سراہا گیا۔

’پردیسی‘ وہ پہلی ہندوستانی فلم تھی جو روس کے اشتراک سے بنی تھی۔ اس مشترکہ فلم سازی کی ابتدا عباس صاحب ہی نے کی۔ یہ 1957 میں بنی تھی۔ اس کی کہانی ایک روسی سیاح کے سفرنامے پر بنی تھی جو پندرھویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا۔ اس میں ایک مشہور روسی اداکار نے نرگس کے مقابل کام کیا تھا۔ ان کے علاوہ پرتھوی راج کپور، بلراج ساہنی اور من موہن کرشن وغیرہ نے کام کیا تھا۔ لیکن یہ فلم بری طرح ناکام ہوئی اور کافی مالی نقصان اٹھانا پڑا۔

1963 میں انھوں نے ’شہر اور سپنا‘ بنائی۔ یہ فلم ان کی ایک مختصر کہانی ’پتھر کی سیج پر ایک ہزار راتیں‘ پر بنی تھی۔ اس کہانی کا مسودہ فلم فنانس کارپوریشن کو بھیج دیا۔ اس ادارے کو حکومت نے قائم کیا تھا۔ جس کا مقصد چھوٹی، تجرباتی اور کم سرمایہ کی فلموں کو کم شرح سود پر قرض دینا تھا تاکہ چھوٹے فلم ساز اچھی اور مقصدی فلمیں بنا سکیں۔ خواجہ احمد عباس کی درخواست کارپوریشن والوں نے یہ کہہ کر مسترد کر دی کے اس کہانی میں کوئی جان نہیں ہے۔ بعد میں خواجہ احمد عباس نے اپنے طور پر اس فلم کو شروع کیا۔ فلم کے سارے فنکاروں نے اس فلم میں بغیر معاوضہ لیے کام کیا تھا۔ ’شہر اور سپنا‘ کو اس سال کی بہترین فلم قرار دیا گیا اور اس ملک کا سب سے بڑا اعزاز صدارتی گولڈ مڈل ملا۔ عجیب بات ہے کہ فلم فنانس کارپوریشن والوں نے اس فلم کو قرض دینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس کی کہانی میں کوئی دم نہیں ہے۔ اس فلم کو بین الاقوامی شہرت ملی اور یہ ایک کامیاب فلم ثابت ہوئی۔ ’شہر اور سپنا‘ خواجہ احمد عباس کی بہترین فلم تھی۔ خواجہ احمد عباس نے 1966 میں ’آسمان محل‘ 1968 میں ’بمبئی رات کی بانہوں میں‘ اور 1969 میں ’سات ہندوستانی‘ بنائی۔ اس فلم میں خواجہ احمد عباس نے پہلی بار امیتابھ بچن کو فلمی دنیا میں متعارف کرایا تھا۔ 1971 میں انھوں نے ’دو بوند پانی‘ 1980 میں ’نکسلائٹ‘ بنائی۔ یہ تمام فلمیں گو کہ اچھی فلمیں تھیں لیکن عام فلم بینوں نے پسند نہیں کیا۔ عباس صاحب ایک کے بعد ایک فلم بناتے گئے۔ فلمیں ناکام ہوتی رہیں۔ مسلسل مالی نقصان ہوتا رہا لیکن فلم بنانا انھوں نے نہیں چھوڑا۔ وہ فلم میڈیا کو اپنے خیالات لوگوں تک پہنچانے کا ایک اہم ذریعہ سمجھتے تھے۔ اس فن سے ان کا یہ خلوص تھا، جو بار بار فلم بنانے کے لیے انھیں اکساتا تھا۔ لوگ ان سے کہتے۔ ’’راج کپور کے لیے آپ نے ’آوارہ‘، ’شری چار سو بیس‘، ’میرا نام جوکر‘ اور ’بابی‘ جیسی کہانیاں لکھیں خود اپنے لیے ایسی کہانیاں لکھ کر فلمیں کیوں نہیں بناتے۔‘‘

وہ کہتے ’’وہ کمرشیل فلمیں ہوتی ہیں۔ میں کمرشیل فلمیں نہیں بناتا۔ میرا ایک آئیڈیل ہے۔ ایک مقصد ہے۔ میں روپیہ کمانے کے لیے فلم نہیں بناتا۔ میرے ساتھ جو لوگ بھوکے پیاسے رہ کے کام کرنا چاہتے ہیں وہ کریں، اور جو نہیں کرنا چاہتے وہ جا سکتے ہیں۔‘‘

عباس صاحب کی اس فلمی صنعت نے اتنی قدر نہیں کی جتنا کہ ان کا حق تھا۔ فلمی نقادوں نے بھی ان کے کام کو اتنا نہیں سراہا جس کے وہ مستحق تھے۔ البتہ بیرون ملک عالمی سطح پر ان کے فن کو بہت سراہا گیا۔

■

Nesar Ahmad Siddiqui, C/o.-Janta Medical Store, Karim Gani, Gaya - 823001 (Bihar)

شرجیل احمد خان

اسحاق نیوٹن

حیات اور کارنامے

طبعیات اور ریاضی کا ماہر مفکر و فلسفی اسحاق نیوٹن تاریخ کی ذہین ترین ہستیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس نے طبعیات، ریاضی و فلکیات میں بیش بہا انکشاف کیے۔ ریاضی کی شاخ Calculus اسی کی ایجاد ہے۔ شاید نیوٹن کا سب سے بڑا کارنامہ کشش ثقل کا انکشاف ہے۔ نیوٹن کے قبل یہ خیال عام تھا (خاص کر عیسائیوں میں) کہ زمین مرکز میں ساکت ہے اور دیگر اجرام زمین کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ کشش ثقل کی رو سے ہر مادی شے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کشش کی قوت اجرام کی آپس میں دوری اور حجم پر منحصر ہے۔ اسی قانون کی رو سے نیوٹن نے ثابت کیا کہ سورج، چاند، ستارے اور دیگر اجرام فلکی اپنے اپنے مدار پر قائم ہیں۔ نیوٹن کی طبیعات اور کشش ثقل (Gravitional Force) کے متعلق اہم انکشافات نے سائنس کی ساخت میں بنیادی تبدیلیاں کی۔ ہمارا تصور کائنات یکلخت بدل گیا۔

نیوٹن کرسمس کے دن 1642 میں لنکا شائر Lincolnshire میں پیدا ہوا۔ وہ وقت سے پہلے پیدا ہو گیا تھا۔ رحم مادر میں وہ صرف سات ماہ قیام کیا جس کی وجہ سے اس کی نشو و نما مکمل نہیں ہو سکی۔ کہتے ہیں پیدائش کے وقت وہ حجم میں اتنا مختصر تھا کہ چوتھائی مگ (چائے کا پیالہ) میں پورا سما جاتا تھا۔ اس وقت انگلینڈ نے جارجین کلنڈر نہیں اپنایا تھا۔ جارجین کلینڈر کے مطابق اس کی پیدائش 4 جنوری 1643 میں ہوئی۔

اس کا باپ ایک اَن پڑھ کسان تھا، جو نیوٹن کی پیدائش کے تین ماہ قبل ہی انتقال کر گیا۔ نیوٹن کی ماں نے نیوٹن کو اپنی ماں (نیوٹن کی نانی) کے سپرد کر دیا اور خود برنابس اسمتھ نام کے امیر شخص سے شادی رچالی۔ گھر میں نیوٹن کی پرورش ایک یتیم بچہ کی طرح ہوئی۔ وہ اپنے دادا کا بھی منظور نظر نہیں تھا۔ اس کے دادا جیمس نے اپنی جائداد میں کچھ بھی اس کے نام وصیت نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ اسحاق نیوٹن اپنے سینے میں اپنی ماں اور سوتیلے باپ کے متعلق شدید نفرت کے جذبات پالے ہوئے تھا۔ جب نیوٹن 19 برس کی عمر میں اپنے گناہوں کا احتساب کر رہا تھا، اس نے اپنی ڈائری میں اپنے غم و غصے کا یوں اظہار کیا ''جی چاہتا ہے کہ اپنی ماں اور باپ اسمتھ کو زندہ جلا دوں اور ان کے گھر کو پھونک دوں۔''

اوائل عمر میں اس کی اسکول کی تعلیم اچھی نہیں رہی۔ اسکول کے ریکارڈ میں نیوٹن کو ایک سست اور کاہل طالب علم بتایا گیا ہے۔ شاید اس کی وجہ اس کی ماں کی غیر وابستگی تھی۔ وہ ماں کی شفقت سے محروم رہا۔ یقیناً نیوٹن کا بچپن ناخوشگوار گزرا۔ ساری زندگی وہ ذہنی اذیت میں مبتلا رہا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنا ذہنی توازن کھو دیتا تھا۔ اس پر جنونی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اسی جنوں میں وہ اپنے دوستوں اور دشمنوں دونوں پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔ بات ہاتھا پائی اور گالی گلوچ تک پہنچ جاتی تھی۔

بچپن میں وہ فطرت کا غائر مطالعہ کرتا تھا۔ وہ اشیا کے مضمرات جاننا چاہتا تھا۔ فطرت نے اس کو بھرپور تخلیقی قوت سے نوازا تھا۔ اس کو کتب بینی سے عشق تھا۔ اس نے بچوں کی تفریح کے لیے کئی کارآمد کھلونے بنائے جو بڑی بڑی مشینوں مثلاً پن چکی، موٹر گاڑی وغیرہ کی شکل میں ہوتے تھے۔ اس نے آٹا پیسنے کی ایک چکی بنائی جسے چوہے کھینچتے تھے۔

نیوٹن نے اپنی ابتدائی تعلیم گاؤں کے اسکول میں حاصل کی۔ بعد میں اس نے گرنتھم میں Krnga School میں داخلہ لے لیا، جہاں وہ ہر سال اول آتا تھا۔ اسکول میں اس کی ملاقات این اسٹورر (Anne Storer) نام کی ایک طالبہ سے ہوئی۔ دونوں میں محبت ہو گئی، لیکن معاشقہ دیرپا ثابت نہیں ہوا اچانک نیوٹن کا داخلہ کیمبرج یونیورسٹی میں ہو گیا۔ اس طرح محبت کا یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ اس وقت نیوٹن کی عمر 19 سال تھی۔ زندگی میں پھر کبھی اس کی کسی لڑکی سے آنکھ نہیں لڑی۔ وہ تا زندگی کنوار رہ گیا۔ اس کی ماں اپنے دوسرے شوہر کی موت کے بعد 1653 میں Wool Throp واپس لوٹ آئی۔ وہ اب صاحب جائداد تھی۔ اس نے کافی پیسے جمع کر لیے تھے۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بڑا لڑکا جائداد کی دیکھ بھال کرے۔ اسی غرض سے اس نے نیوٹن کو دیہات بھیج دیا۔ نیوٹن کو اسکول کی پڑھائی ترک کرنی پڑی۔ اب وہ ایک کسان تھا، لیکن دیہات کی زندگی اسے راس نہیں آئی۔ دیہات کا ماحول اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ نیوٹن کے چچا Willianr Ayscough نے حالات کی نزاکت کو سمجھا۔ وہ نیوٹن کی ذہنی صلاحیت سے واقف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیوٹن کی صلاحیت بروئے کار آئے اور وہ پڑھ لکھ کر ایک کامیاب شہری بنے۔ اسی خیال سے اس کے چچا نے نیوٹن کو دوبارہ Krnag School میں داخل کرا دیا۔ ابھی تک نیوٹن اپنی بے پناہ ذہنی صلاحیت کا ثبوت نہیں دے پایا تھا۔ وہ سادہ لوح کسان کی طرح زندگی گزار رہا تھا۔ طبیعت کی انکساری اس کی فطری ذہنی صلاحیت کو لوگوں سے چھپائے رکھتی تھی۔ لیکن خاکستر میں چنگاریاں پنہاں تھیں۔ یہ اس وقت بھڑکیں جب نیوٹن کا داخلہ کیمبرج کی ٹری نیٹی Trinity کالج میں ہو گیا۔ کالج میں اس کا داخلہ ایک غریب اور نادار طالب علم کی حیثیت سے ہوا تھا۔ حالانکہ اس کی ماں صاحب جائداد تھی۔ ماں نے اپنی جائداد چھپائے رکھی۔ المیہ یہ ہے کہ کالج کی طرف سے جو معاوضہ ملتا تھا اس کے عوض نیوٹن کو دوسرے طالب علموں کی خدمت گزاری کرنی پڑتی تھی۔

اس زمانے میں کیمبرج یونیورسٹی میں ارسطو کے نظریات کا غلبہ تھا۔ نیوٹن ارسطو کے نظریات کا پابند نہیں رہا۔ یہ بات باعث تعجب ہے کہ اسحاق نیوٹن سائنس داں تو تھا لیکن اسے فلسفے سے حد درجہ دلچسپی تھی۔ وہ کائنات کے مضمرات جاننا چاہتا تھا۔ یہ کائنات کیا ہے؟ اس کا خالق کون ہے؟ خود ہم کون ہیں، ہم کہاں سے آئے ہیں؟ زندگی کا مقصد کیا ہے؟ شعور ذات کیا ہے؟ خالق اور مخلوق میں کیا رشتہ

ہے؟ ذہن اور جسم میں کیا رشتہ ہے؟ کیا جسم ذہن کے تابع ہے، کیا کائنات کے پس پشت کوئی ذہنی کارفرمائی ہے یا یہ جلوہ گری محض میکانیکل ہے؟ غالب کہہ گئے ہیں ''کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے'' نیوٹن نے اپنی ڈیکارٹ، تھامس ہابس، پری گسنڈی Piers Gassendi باول کے نظریات کا غائر مطالعہ کیا۔ مطالعے کا ماحصل ایک کتاب میں ترتیب دیا جو Philosphical Questions کے نام سے موسوم ہے۔ اس کتاب کے سرورق پر لاطینی زبان میں یہ قول درج ہے۔ ''افلاطون میرا دوست ہے، ارسطو میرا دوست ہے، لیکن میرا سب سے بڑا دوست سچائی ہے۔'' جب کہ کیمبرج ایک قابل قدر تدریسی ادارہ ہے، اس زمانے میں اس کا نصاب فرسودہ اور روایتی تھا۔ نیوٹن نے اس جمود کو توڑا اور سوچ کی نئی راہیں نکالی۔ اس کی کوشش سے کیمبرج علم وفن کا سرچشمہ بن کر ابھرا۔ کیمبرج کے زمانے میں نیوٹن نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔

علم ریاضی سے نیوٹن کی دلچسپی 1663 میں شروع ہوگئی تھی، جب کہ علم نجومی Astrology کی ایک کتاب اس کے ہاتھ آئی۔ یہ کتاب اس نے کتاب میلے میں خریدی تھی۔ دراصل نیوٹن کو کتب بینی کا حد درجہ شوق تھا۔ اس کا مطالعہ صرف اپنی نصاب کی کتابوں تک محدود نہیں تھا بلکہ وہ دنیا بھر کے علوم کو سمیٹ لینا چاہتا تھا، اسی مقصد سے اس نے مختلف موضوعات پر کتابیں پڑھنے کی عادت ڈالی۔ ایک دن Trigonometry کی ایک کتاب پر اس کی نظر پڑی۔ کتاب اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس نے Euclis اقلیدس کی کتاب بار بار پڑھی۔ اس کتاب میں Trigonometry کے مبادی مسائل حل کیے گئے تھے۔ اسی کتاب کی مدد سے اس نے Trigonometry کی کتاب دوبارہ پڑھی۔ آخرکار کتاب اس کی سمجھ میں آگئی۔ اس طرح علم ریاضی میں اس کی معلومات میں اضافہ ہوا۔ بہت جلد وہ علم ریاضی تری گومیتری اور جومیٹری میں ماہر ہوگیا۔ 1665 میں اس نے ریاضی کی ایک شاخ Calculus کی ایجاد کی۔ جومیٹری میں Binomial Theory بھی اس کی دین ہے۔

1665 میں نیوٹن نے کیمبرج یونیورسٹی سے بی اے پاس کیا۔ اسی زمانے میں انگلینڈ میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ لاکھوں جانیں تلف ہوگئیں۔ اس لیے یونیورسٹی بند کردی گئی۔ نیوٹن کو مجبوراً Wools Thope لوٹ آنا پڑا۔ نیوٹن کو اچھا موقعہ ہاتھ لگا۔ اپنے کو Opties دور کشش ثقل کے مطالعے میں غرق کردیا۔ اسی زمانے میں اس نے بہت سے سائنسی انکشاف کیے۔ اس نے اوشی کی رفتار اس میں قوس قزح کے رنگولی کی موجودگی Calculus Fluxion کے طریق کار کے متعلق اہم معلومات بہم پہنچائی۔ ان ہی معلومات کو سمیٹتے ہوئے نیوٹن نے اپنی معرکہ آرا کتاب Principia شائع کرائی جو آج بھی سائنس دانوں اور مفکروں کی بوطیقا تصور کی جاتی ہے۔ 1660 تک نیوٹن Fluxion کا طریق کار دریافت کرچکا تھا۔ لیکن اس کی اشاعت نہیں ہوسکی تھی۔ اس دوران مشہور مفکر لینز Leiniz نے Calculus پر اپنا پہلا مقالہ شائع کرادیا۔ نیوٹن کے حامیوں نے دعویٰ کیا کہ لینز نے نیوٹن کے انکشافات کو اپنے نام سے شائع کرادیا ہے جو کہ سرقہ Ralgarism ہے جب کہ بینزم کے حامیوں کا دعویٰ تھا کہ Calculus کا موجد لینز ہے نہ کہ نیوٹن۔ اس طرح ایک طویل بحث چھڑگئی جو ایک صدی تک جاری رہی۔ لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا۔ آج بھی ہم اس تلخی کو محسوس کرتے ہیں۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ خود نیوٹن نے اس بحث میں خاموشی اختیار کرلی، وہ وقت کا انتظار کررہا تھا۔

Lincolnshire کے فارم میں نیوٹن نے اپنا تجربہ گاہ قائم کیا تھا۔ یہاں وہ ہر طرح کا تجربہ کیا کرتا تھا۔ ایک دن جب وہ اپنے فارم میں چہل قدمی کررہا تھا معاً اسے خیال آیا کہ یہ چاند، تارے کس طرح اپنے مدار پر قائم ہیں اور پھر یہ کہ زمین سورج کے گرد گھوم رہی ہے تو ہم زمین پر کس طرح ... زمین کی دوسری طرف کیوں نہیں گر پڑتے۔ کون سی قوت ہمیں پاؤں پر کھڑی رکھتی ہے۔ یہ سب مشکل سوالات تھے۔ ان سوالات نے نیوٹن کے ذہن میں ہیجان پیدا کردیا۔ حیران پریشان وہ ایک سیب کے درخت کے نیچے بیٹھ کر غور کرنے لگا کہ اچانک ایک سیب درخت سے ٹوٹ کر اس کے سر سے جا ٹکرایا۔ اس کے ذہن میں پھر سوال پیدا ہوا۔ سیب زمین کی طرف کیوں گرا۔ کسی اور طرف کیوں نہ چلا گیا۔ غور وفکر کے بعد یہ حقیقت اس پر منکشف ہوئی کہ نظام قدرت میں کشش ثقل کارفرما ہے۔ جس کے تحت ہر مادی شے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ ثقل کشش Gravitation Force کی ایجاد نیوٹن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ اس نے ثقل کشش کے تحت تین قوانین کی نشان دہی کی:

(1) ہر مادی شے چاہے تو حرکت میں رہے گی یا ساکن جب تک کوئی باہری قوت اس کی حالت کو تبدیل نہ کردے۔

(2) Momention کی تبدیلی کی شرح باہری قوت کی مناسبت سے ہوتی ہے۔

(3) عمل کا مساوی اور مخالف ردعمل ہوتا ہے۔

اپریل 1667 میں نیوٹن کیمبرج لوٹ آیا۔ وہ ٹری نیٹی Trinity میں نائب رکن منتخب ہوا۔ فتوحات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ دوسرے ہی سال ٹری نیٹی کا سینئر رکن منتخب ہوا۔ اسی سال اس نے آرٹ کی ماسٹر ڈگری حاصل کی۔ 1669 میں ابھی اس نے 27ویں سالگرہ منائی بھی نہ تھی کہ وہ ریاضی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ 1670 سے لگاتار 1672 تک وہ Optics پر لکچر دیتا رہا اس نے تجربہ کرکے یہ بتایا کہ کس طرح سورج کی سفید کرن Prism سے انعکاس کرکے قوس قزح کے سات رنگوں میں بکھر جاتی ہے اور پھر اسی کرن کو الٹے رخ اُسی Prism سے گزارا جائے تو سفید کرن واپس لوٹ آتی ہے۔ یہ بہت اہم انکشاف تھا جس کی وجہ سے ہم روشنی کی بناوٹ سے واقف ہوئے۔ اسی اصول کے تحت نیوٹن نے Reflecting دوربین کی ایجاد کی جو Refracting دوربین سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ 1672 میں نیوٹن Royal Society کا رکن منتخب ہوا جو ایک بڑا کارنامہ تھا۔ اسی سال اس نے Royal Society کے جریدے میں روشنی کے متعلق ایک فکرانگیز مقالہ شائع کرایا۔ مضمون پسند کیا گیا، لیکن مشہور سائنس داں ہوک (Hook) نے جو اس وقت Curator کے عہدے پر فائز تھا، مضمون کی سخت تنقید کی، نیوٹن کا مفروضہ کہ روشنی چھوٹے چھوٹے ذروں Particuls سے تشکیل پاتی ہے، ہوک کو منظور نہیں ہوا۔ اس نے اس مفروضے کو سختی سے رد کردیا۔ نیوٹن نے حسب دستور خاموشی اختیار کرلی۔ ایسا ایک واقعہ 1675 میں پیش آیا تھا جب ہوک نے نیوٹن پر الزام لگایا کہ نیوٹن نے روشنی کے متعلق ہوک کے اہم انکشافات کی چوری کرلی ہے۔

1668 میں نیوٹن کیمبرج یونیورسٹی میں لکچرر بحال ہوگیا۔ وہ ساتھی لکچروں میں سب سے چھوٹا تھا۔ طلبا اس سے چڑھتے تھے۔ بہت کم طلبا نیوٹن کے کلاس میں حاضر ہوتے تھے۔ یہ بات نیوٹن کو ناگوار گزرتی تھی۔ اس بیچ انگریز Jesuits سے رنگ کے نظریوں کے ضمن میں اس کا جھگڑا ہوگیا۔ زوردار بحث چھڑگئی۔ بحث سے جب بات نہیں بنی تو لوگ گالی گلوج پر اتر آئے۔ تحقیر آمیز خطوط

لکھے گئے۔ نیوٹن کو سخت صدمہ ہوا۔ وہ بدستور خاموش رہا۔ 1679 میں اس کی ماں کی موت ہوگئی۔ ان صدمات کو وہ برداشت نہیں کر پایا۔ اس کا دماغی توازن بگڑ گیا۔ اس نے دنیا سے کنارہ کشی کر لی۔ کچھ دن کے بعد ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی قوت ارادی کو بیدار رکھا اور تمام تلخیوں کو بھلا کر سائنسی کاموں میں جٹ گیا۔ فطرت کے راز ہائے پنہاں کو وہ آشکار کرنا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں وہ علم کیمیا Alchemists پر بہت کام کیا۔ ادھر Edmund Halley اور Cristopher Wren سیاروں کی گردش کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اگست 1684 میں Halley نے نیوٹن سے کیمبرج یونیورسٹی میں ملاقات کی۔ اس نے نیوٹن سے پوچھا، ایک سیارہ سورج کے گرد چکر کاٹنے کے عمل میں کس شکل کا دائرہ بناتا ہے۔ نیوٹن نے برجستہ جواب دیا بیضوی (Oval) نیوٹن نے اجرام فلکی کا غائر مطالعہ کیا تھا۔ مطالعے کا ماحصل ایک کتاب میں درج کیا جو Principal Mathematical کے نام سے موسوم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ سائنس کی پہلی کتاب تھی جو آئندہ سائنس دانوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوئی۔ Principal کا سائنسی حلقوں میں زوردار استقبال ہوا۔ کچھ لوگ نیوٹن کے نت نئے سائنسی انکشافات سے کڑھنے لگے۔ ان لوگوں نے دعویٰ کیا کہ نیوٹن نے Principal میں جن انکشافات کا ذکر کیا ہے ان میں سے بہتوں کو Hook پہلے ہی منظر عام پر لا چکا تھا۔ نیوٹن بہت ناراض ہوا غصے کے عالم میں اس نے Principal کی تیسری جلد کی اشاعت رکوا دی۔ بعد میں کچھ معتبر لوگوں کے اصرار پر کتاب کی اشاعت پر راضی تو ہو گیا لیکن اس نے اپنی کتاب میں ہوک کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ رائل سوسائٹی میں ہوک کے حامیوں کی اکثریت تھی۔ اسی لیے نیوٹن نے رائل سوسائٹی سے اپنا نام واپس لے لیا۔ نیوٹن 1703 تک رائل سوسائٹی سے کنارہ کش رہا جب تک ہوک کی موت نہیں ہوگئی۔

اس بیچ نیوٹن کی شہرت ایک سائنس داں اور ریاضی داں کی حیثیت سے تمام ممالک میں پھیل گئی۔ لوگ اسے زمانے کا سب سے ذہین اور معتبر سائنس داں اور ریاضی داں تصور کرنے لگے۔ یہاں تک کہ کیمبرج یونیورسٹی نے اس کو پارلیمنٹ کی رکنیت کے لیے نامزد کیا۔ اس نے لندن میں شہریت اختیار کر لی۔ اسی درمیان اس کی ملاقات مشہور مفکر Thon Locke سے ہوئی۔

لیکن نہ جانے کیا ہوا کہ نیوٹن کا ذہنی توازن 1693 میں ایک بار پھر بگڑ گیا۔ اسی ذہنی کیفیت میں اس نے Loake کو اوٹ پٹانگ خطوط لکھ ڈالے۔ یہ خطوط نیوٹن کی بگڑی ہوئی ذہنی کیفیت کے غماز تھے۔ لوگ نیوٹن کی دماغی سالمیت پر شک کرنے لگے۔ ذہنی توازن کیوں بگڑا، اس کی وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ خود نیوٹن کا کہنا تھا کہ نیند کی محرومی کی وجہ سے اس کی ذہنی کیفیت بگڑی، لیکن دراصل نیند سے محرومی، ذہنی عدم توازن کا نتیجہ تھی نہ کہ وجہ۔ زیادہ تر لوگ یہی موقف رکھتے تھے، کچھ لوگ کہتے تھے کہ Folatio سے اس کی اچانک جدائی نے اسے پاگل بنا دیا۔ نیوٹن Folatio کو جنون کی حد تک پیار کرتا تھا۔

1696 میں نیوٹن سکہ گھر (Mint) کا ماسٹر مقرر ہوا۔ یہ ایک بڑا عہدہ تھا جس سے اس کی بڑی عزت اور توقیر ہوئی۔ اس نے اپنا نیا عہدہ تو قبول کر لیا لیکن کیمبرج میں لکچرر کے عہدے سے 1701 تک مستعفی نہیں ہوا۔ سکہ گھر میں اس نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ سکہ گھر کی بگڑی حالت کو سدھارا سکہ گھر میں کثرت سے جعلی سکے ڈھالے جاتے تھے۔ نیوٹن نے اندازہ لگایا کہ تقریباً 20 فیصد سکے جعلی ڈھلتے تھے۔

اس زمانے کے قانون کے مطابق جعلی سکے بنانے کی سزا موت تھی۔ نیوٹن بھیس بدل کر ہوٹلوں اور قحبہ خانوں اور ناچ گھروں میں جاتا تھا تا کہ جعلی سکہ بنانے کے متعلق ضروری معلومات حاصل کرے۔ سرکار نے اسے اختیار دے رکھا تھا کہ جعل سازیوں پر مقدمہ چلائے اور مناسب سزا تجویز کرے۔ اس سلسلے میں اس نے تقریباً 200 گواہوں سے پوچھ گچھ کیا۔ فروری 1699 تک وہ دس ملزوں کو موت کی سزا سنا چکا تھا۔ اس کے کام سے خوش ہو کر اس وقت کے حکمراں نے اسے اپنا Altorny بحال کر لیا۔ اس سلسلے میں اس کا سب سے نمایاں کارنامہ اس وقت کا سب سے بڑا ٹھگ William Chaloner کو سزا دلوانا تھا جو سکہ گھر کے کارکنوں پر جھوٹا الزام لگایا کرتا تھا۔ لندن میں قیام کے دوران نیوٹن نے اچھی خاصی شہرت حاصل کر لی۔ سکہ گھر میں تقرری کے دوران اس نے شہرت بھی کمائی اور دولت بھی وہ اب ایک دولت مند شخص تھا۔ وہ ایک کامیاب Administratier بھی ثابت ہوا۔ 1703 میں ہوک کی موت کے بعد وہ رائل سوسائٹی کا صدر منتخب ہوا۔ بقیہ زندگی تک وہ اس عہدے پر قائم رہا۔ 1704 میں اس نے اپنی معرکہ آرا کتاب Opties شائع کرائی۔ اس کتاب میں روشنی کی ماہیت، اس کی رفتار اور رنگوں پر کیے گئے تجربوں کا ذکر ہے۔ نیوٹن نے پہلی دفعہ ثابت کر دکھایا کہ سورج کی سفید کرن کسی Prism سے (مثلث کانچ کا ٹکڑا) گزرتے ہوئے باہر نکلتی ہے تو سات رنگوں میں بکھر جاتی ہے۔ 1705 میں رانی نے نیوٹن کو Knight کے خطاب سے نوازا۔

نیوٹن پر الزام ہے کہ رائل سوسائٹی کے صدر کی حیثیت سے اپنے کارکنوں کو سختی سے دبائے رکھا۔ اس نے من مانی کی اور اپنے ماتحتوں کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ قائم رکھا۔ یہ بات باعث تعجب ہے کہ اس پیمانے کا سائنس داں جس کا شمار دنیا کی عظیم ہستیوں میں ہوتا ہے اس طرح کا آمرانہ مزاج رکھتا تھا۔

نیوٹن 1672 میں Aria جماعت کا رکن بن گیا۔ Aria عیسائیوں کی منکر جماعت تھی جو چوتھی صدی میں الگزینڈر بریق کی زیر قیادت قائم ہوئی تھی۔ ابرین Trinity سے انکار کرتے تھے۔ وہ عیسیٰ مسیح کو خدا سے کمتر اور انسان سے برتر مانتے تھے۔ عیساؤں کا عقیدہ تھا کہ خدا عیسیٰ اور روح القدوس Ghost ایک ہی حقیقت کے تین نام ہیں۔ نیوٹن کا خیال تھا کہ رومن کیتھولک چرچ نے عیسائی مذہب کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور وہ مورتی پوجا تک اتر آئے ہیں، جو عیسائیت کی روح کے منافی ہے۔

نیوٹن مخالف خیالات کو برداشت نہیں کرتا تھا، ہوک اور دوسرے سائنس دانوں سے اس کا جھگڑا رہا۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے فرائض ایمانداری سے انجام دیتا تھا۔ جب وہ رائل سوسائٹی کی صدارت کی کرسی پر تھا تو اس نے اپنے اختیارات کا غلط استعمال کیا۔ وہ مخالفوں کو سختی سے دبا دیتا تھا۔ لوگ کہتے ہیں کہ جب وہ صدارت کے عہدے پر تھا تو اس نے Hook کی تصویر غائب کرا دی۔

نیوٹن کے آخری ایام

آخری دنوں میں نیوٹن کو پیشاب میں بے قاعدگی کی شکایت ہوگئی تھی۔ پیشاب رک رک کر آتا تھا۔ شاید گردے میں پتھر آ گئی تھی۔ جنوری 1725 میں اس کے پھیپھڑے میں پانی آ گیا جس کی وجہ سے شدید کھانسی کا شکار ہو گیا۔ مجبوراً اس کو Kesungtoa آنا پڑا۔ دوسرے مہینے میں اس کو گٹھیا کا مرض لاحق ہو گیا۔ سکہ گھر (Mint) کے فرائض سے وہ سبکدوش ہو چکا تھا۔ صحت تھوڑی بحال ہوئی تو 28 فروری 1727 میں رائل سوسائٹی کی ایک میٹنگ کی صدارت کے سلسلے میں وہ لندن گیا۔ لیکن خرابی صحت کی وجہ سے اسے Kesungtoa لوٹ آنا پڑا۔ یہاں مرض کی تشخیص ہوگئی۔ گردے میں پتھری آ گئی تھی۔ شدید درد کا دورہ اٹھتا تھا۔ وہ تکلیف برداشت نہیں کر پایا۔ 18 مارچ کو اس پر نیم بیہوشی طاری ہوئی۔ تیسرے دن 20 مارچ کو 2 بجے رات میں اس کی موت ہوگئی۔ اس کی لاش بیت المقدس لے جائی گئی جہاں اس کی تدفین ہوئی۔ بعد ازاں West Minister Abbey میں دفن کر دیا گیا۔

■

Prof. Shargeel Ahmad Khan, 131 'C' Ground Floor, 49 Sector, NOIDA- 201301 (UP)

مصنف: علی مہدی   مترجم: شیبا حسن افتخار

مسلم فلسفہ اور اس کی اہمیت

(نوٹ: زیرِنظر مضمون پروفیسر علی مہدی کی کتاب The Elements of Islamic Philosophy کے پہلے باب پر مبنی ہے۔ یہ کتاب سنہ 1946 میں پہلی بار ملکہ پریس، الہ آباد سے شائع ہوئی تھی اور بعد میں بھی اس کی اشاعت نہ صرف ہندوستان میں بلکہ ہندوستان کے باہر بھی ہوتی رہی کیونکہ اسلامی فلسفے کے طالب علموں کے لیے یہ ایک بنیادی کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کتاب کا اردو میں ترجمہ جاری ہے اور پہلے باب کے ترجمے کا خلاصہ اس مضمون کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے۔)

مسلم مفکرین کے لیے فلسفہ حقیقتِ مطلق (absolute reality) کی ایک غیر جذباتی تلاش ہے اور اس کا مقصد اللہ سے حتی الامکان قربت پیدا کرنا ہے۔ صدرالدین شیرازی نے فلسفے کو ایک ایسی سعی و کاوش کا نام دیا ہے جو اس کائنات کی بحیثیت ایک منظم کُل کے وضاحت کرتی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مسلم مفکرین کے لیے فلسفہ عقائد وخیالات کا ایک نظام بھی ہے جس کی جڑیں انسان کی عملی ضروریات، جو کہ مادی بھی ہیں اور روحانی بھی، میں پنہاں ہیں۔ ان مفکرین کا نقطۂ نظر Dean Inge کے نقطۂ نظر سے مطابقت رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''میں فلسفے اور مذہب کے بیچ فرق کرنے سے قاصر ہوں۔''

ان مسلم مفکرین نے اپنی معقول تفتیش کو کبھی بھی منکشف حقیقتوں کے تابع نہیں کیا بلکہ وہ یہ مانتے رہے کہ فلسفہ اس بات کا حق رکھتا ہے کہ وہ مذہبی حقیقتوں کو جانچے اور پرکھے۔ Fichte کے مطابق انسان اُسی قسم کے فلسفے کا انتخاب کرتا ہے جس قسم کا وہ خود ہوتا ہے۔ Schiller کے مطابق تمام فلسفوں کے پیچھے انسانی فطرت کارفرما ہوتی ہے اور ہر فلسفے میں انسان پوشیدہ ہوتا ہے۔

اب ان مسلم مفکرین کے افکار کو سمجھنے کے لیے ان کی شخصیات اور ان کے ماحول پر غور کرنا بھی لازمی ہوجاتا ہے۔ یہ مفکرین زبردست دانش ور، متقی اور دیندار تھے۔ ان کے اندر حقیقتِ مطلق کو سمجھنے کی ایک ایسی تشنگی موجود تھی جس کا مقصد نہ صرف ان کی عقلی اور دانشورانہ ضروریات کو مطمئن کرنا تھا بلکہ نیکی وخوبی اور اخلاقیات کے اصولوں کے ساتھ مطابقت رکھتے ہوئے اپنے طرزِ عمل کو سنوارنا بھی تھا۔

بانیِ اسلام کی رحلت کے فوراً بعد مسلمان سماجی، سیاسی اور قبائلی اختلافات کی بنا پر بکھر گئے تھے اور درحقیقت وہاں کچھ دنوں کے لیے خانہ جنگی جیسے حالات پیدا ہوگئے تھے۔ اس کا نتیجہ حسبِ دستورِ اخلاقی، سماجی اور مذہبی نصب العین کی برہمی کی شکل میں سامنے آیا اور ایسا لگنے لگا کہ مسلمانوں کی توجہ زندگی کی اعلیٰ قدروں کی طرف بالکل نہیں ہے۔ یہ دور عدم الیقینی اور شک وشبہات کا دور تھا جب اتنے زیادہ لوگ اتنی زیادہ چیزوں کے لیے اتنے زیادہ مشتبہ اور متذبذب تھے۔ اسی عدم الیقینی اور شک وشبہات کے دور میں مسلم فلسفے کی ابتدا ہوئی۔ اِس فلسفے کا ظہور یونانی فلسفے کی طرح استعجاب میں نہیں ہوا۔ مسلم مفکرین نے سچائیوں کو، حقائق کو، مثالی معیاروں کو اور مختلف نقطۂ نظر کو تلاش کرنے کی ایک سعی کی جو انھیں اُن شک وشبہات سے آزاد کردے جن میں وہ گرفتار تھے اور اُن کو ایک ایسی مضبوط اور پائیدار بنیاد پر استادہ کردے جو نہ صرف سائنسی مطالعات پر بلکہ مذہب اور سماجی تعلقات پر بھی مبنی ہوں۔ ان کے فلسفیانہ افکار کا مقصد صرف مابعد الطبیعات کے نظام میں مختلف سائنسوں کی تجمیع و ترکیب کرنا ہی نہیں تھا بلکہ عالمِ فطرت اور عالمِ نہایت کی تجمیع وترکیب بھی تھا۔ اس کے بعد ان دونوں تجمیعات کی ترکیب وہ سماجی مقصد اور سماجی ترقی کے ساتھ کرنا چاہتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنی حکیمانہ تشنگی اور عقلی خواہشات کو بلکہ اخلاقی، مذہبی اور سماجی خواہشات کو بھی مطمئن کرنا چاہتے تھے۔ ان باتوں سے یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ فلسفے کو مسلم مفکرین نے ایک مضبوط اصولی اور نظریاتی بنیاد کے طور پر دیکھا۔ اُن کے نزدیک یہ فلسفہ ایک ایسی معیاری زندگی کے لیے ہونا چاہیے جس میں انسان جو کہ خلیفۃ اللہ ہے، اپنے خالق سے قربت پیدا کرنے کے لیے، جس قدر بھی بحیثیت انسان اس سے ممکن ہوسکے، قدم رکھ سکتا ہے۔

مسلم فلسفے کی فطرت کو سمجھ لینے کے بعد اب یہ بھی جاننا بہت ضروری ہوجاتا ہے کہ مسلم فلسفے کی کیا قدر و قیمت ہے اور یہ کتنی اہمیت کا حامل ہے۔ اس فلسفے کی قدر و قیمت کا احساس Draper کے اس قول سے ہوتا ہے: ''عرب نے یورپ پر اپنی دانشورانہ مہر ثبت کردی ہے اور وہ دن دور نہیں ہے جب مسیحی ممالک اس حقیقت کو تسلیم کرلیں گے۔'' بہت سے حق پسند علمائے کرام نے ڈریپر کے اس نظریے کی توثیق بھی کی ہے لیکن دوسری طرف Uberweg سے اتفاق رکھنے والے یہ مانتے ہیں کہ ''عربوں کا پورا فلسفہ محض Aristotelianism کی ہی ایک شکل ہے جو تھوڑا بہت Neo - Platonic تصورات کے ساتھ خلط ملط ہوگیا ہے۔'' اس سوچ کے پیدا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جدید فلسفے کے طالب علموں نے عربی زبان سیکھنے پر کوئی توجہ نہیں دی اور دوسری طرف جو عربی زبان کے طالب علم ہیں وہ جدید فلسفے سے اچھی واقفیت نہیں رکھتے۔ ان حالات میں مسلم افکار و خیالات میں جو قائم و دائم اقدار موجود ہیں ان کی خصوصیات سے صرف وہی شخص پردہ اٹھا سکتا ہے جو جدید فلسفے کے دائمی مسائل سے بھی بخوبی واقف ہو اور جس نے کلاسیکی ادب کی تنقیدی جانچ پرکھ بھی بہت غور وفکر کے ساتھ کی ہو۔

اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ جدید اور عصری افکار و خیالات کے طالب علم کے لیے مسلم فلسفہ کیا اہمیت رکھتا ہے اور ان کے لیے اس فلسفے کی کیا قدر و منزلت ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مسلم فلسفہ دراصل اُس یوروپی فلسفے کے پسِ منظر اور سیاق وسباق کی تشکیل کرتا ہے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ دنیا کے تمام فلسفوں پر اس کا ہی غلبہ ہے۔ مسلم فلسفہ اسپین، جنوبی اٹلی اور سسلی سے ہوتا ہوا یورپ پہونچا۔ Hitti کے مطابق: ''تیرھویں صدی

کے آخر تک عربوں کی سائنس اور ان کا فلسفہ یورپ منتقل ہو چکا تھا اور بحیثیت ثالث کے اسپین کا کام مکمل ہو گیا تھا۔ جو تحریک Pyrenes کے ذریعے Toledo کے بلند و بالا دروازوں سے آگے بڑھی تھی اُس فکری تحریک کو Provence اور Alpine درّوں کے ذریعے Germany , Lorraine اور مرکزی Europe میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ تحریک English Channel کو عبور کر کے انگلستان میں بھی داخل ہو گئی۔''

تیرھویں صدی کے اول سے آخر تک مسلم فلسفہ پیرس کی یونیورسٹی پر غالب رہا۔ Franciscan Frairs مسلم فلسفے کو انگلستان لائے۔ 1109 عیسوی میں کیمبرج یونیورسٹی کے نصاب میں ابنِ رشد کی ایک کتاب شامل تھی جس کا لاطینی ترجمہ موجود تھا۔ Roger Bacon جو جدید افکار و خیالات کے پیشرو ہیں انھوں نے Toledo میں تعلیم حاصل کی تھی اور عربی زبان پڑھ بھی سکتے تھے اور بول بھی سکتے تھے۔ انھوں نے الکندی کو علمِ بصریات (Optics) پر لکھنے والوں میں اول درجے کا حق دار ٹھہرایا ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق: ''یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ جدید علومِ انسانی کے ثمرات جو سائنس اور فلسفے کی شکل میں رونما ہوئے ہیں وہ کئی اعتبار سے صرف مسلم ثقافت و تہذیب کی ہی مزید توسیع ہے۔'' مسلم فلسفہ ہی یورپ میں نشاۃ ثانیہ کی وجہ بنا۔ متعدد یوروپی کالج اور یونیورسٹیاں جیسے کہ Palermo, Naples, Padua اور Bologna مسلم سائنسوں کی کشت و زراعت کے لیے جانی جاتی تھیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ بہت سے مفکرین جیسے Thomas Acquinas , Dante, Duns Scotus اور Spinoza براہِ راست مسلم فلسفے سے متاثر تھے۔ اب اگر یوروپین فلسفے کی روحِ رواں نشاۃ ثانیہ ہی ہے اور اس نشاۃ ثانیہ کا سبب، جیسا کہ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں، مسلم فلسفے کی توسیع ہے تو جدید یوروپین فلسفے کی صحیح تفہیم کے لیے مسلم فلسفے کا مطالعہ کم از کم اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ یونانی فلسفے کا۔ جو لوگ مسلم فلسفے کو نظر انداز کر دیتے ہیں وہ مغربی افکار و خیالات کی نشو و نما کی ایک بہت ہی اہم کڑی سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ Decarts, Roger Bacon,Francis Bacon, Spinoza اور ان کے ہم عصروں نے جن دانش گاہوں میں تعلیم حاصل کی تھی مسلم فلسفہ وہاں کا روحِ رواں بنا ہوا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ بغیر مسلم فلسفے کا علم حاصل کیے ہم مغربی فلسفے کے عناصر کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی گہرائی میں جانے کے لیے مسلم فلسفے کا مطالعہ لازمی ہو جاتا ہے۔ مسلم فلسفہ انسانی افکار و خیالات کی ترقی و توسیع میں ایک واضح اور یقینی مقام کی نمائندگی کرتا ہے اور اسی لیے اس سے آسانی کے ساتھ لاتعلقی اور بے توجہی نہیں برتی جا سکتی ہے۔

دوسری قابلِ غور بات یہ ہے کہ کبھی کبھی یہ بھی نظر آتا ہے کہ جو مسئلے مسلم فلسفے میں زیرِ بحث ہیں اور جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں وہی عصری و مغربی فلسفے میں بھی پائے جاتے ہیں۔ آپس میں ایسی یکسانیت رکھنے والے نکتے تقابلی فلسفے کے لیے بہت اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ عموماً یہی دکھائی دیتا ہے کہ ان دونوں فلسفوں کے نقطۂ نظر اور ان کی توضیح و دلیل کے انداز ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔

مثلاً الکندی اور Waber دونوں ہی فلسفیوں کو محرک (stimulus) اور احساس (sensation) کے بیچ تعلق کے سوال نے پریشان کیا ہے اور دونوں ہی ایک نتیجے پر پہنچتے ہیں صرف اتنا فرق ہے کہ مسلم فلسفے میں اس فکر کا آغاز طب سے ہوا تھا جب کہ یوروپین فلسفے میں یہ سوال ریاضیات اور علمِ نجوم کی طرف سے اٹھایا گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان فلسفوں کے بیچ مماثلات کے مطالعے سے زیادہ اہمیت اُن اختلافات کے مطالعے کی ہے جو ان کے بیچ موجود ہیں۔

ایک اور مثال بھی پیشِ نظر ہے۔ الغزالی اپنی کتاب 'احیاء العلوم' کی شروعات 'ہمہ گیر شک' سے کرتا ہے۔ اس کا انداز ڈیکارٹس کے Discourse Method سے قابلِ توجہ مماثلت رکھتا ہے۔ لیکن جہاں ڈیکارٹس کا شک اس کو (I think therefore I am) "cogite ergo sum" تک لے جاتا ہے وہیں الغزالی کا شک اس کو (I will therefore I exist) "volo ergo sum" تک پہونچاتا ہے۔ دونوں فلسفیوں کے بیچ موجود اس فرق کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈیکارٹس ایک عقلیت پسند ہو گیا جب کہ الغزالی ایک صوفی عارف۔

مندرجہ بالا سطور میں ملحوظ رکھی جانے والی باتوں سے مسلم فلسفے کی اہمیت کافی حد تک ثابت ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی طالب علم عرب کے فلسفے کو سرسری طور سے بھی پڑھے گا تب بھی وہ اس بات سے ضرور متفق ہوگا کہ مسلم فلسفہ جب تک ایک مضبوط قوت اور تحریک کے طور پر زندہ رہا، بہت ہی جامع اور قابلِ تعریف حد تک خالص اور اصلی فلسفہ تھا۔

مسلم فلسفے کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس کی ترقی و توسیع کے دور میں شروع سے آخر تک فطری سائنس کو فلسفے سے الگ نہیں کیا گیا ہے۔ Windleband کہتا ہے کہ ''عرب کی مابعدالطبیعات میں Dialectics (فنِ مناظرہ و منطق) کو ہمیشہ فطری فلسفے کے ذریعے توازن میں رکھا گیا۔'' جتنے بھی مسلم مفکرین گزرے ہیں وہ سب عظیم سائنس داں بھی تھے۔ ابنِ سینا ایک طبیب تھا، ابن الہیثم ریاضی کا ماہر تھا، الکندی ریاضی اور طبیعات دونوں میں مہارت رکھتا تھا، ابن مسکویہ طبیب بھی تھا اور علمِ حیوانات کا بھی ماہر تھا۔ ابن طفیل کو ریاضی اور علمِ نجوم پر مہارت حاصل تھی۔ ان سبھی مفکرین نے مابعدالطبیعات اور فطری سائنس پر اہم کتابیں لکھی ہیں۔

اس فلسفے کی دوسری خصوصیت اس کی زبردست خود مختاری اور آزادیٔ فکر ہے۔ مسلم مفکرین حقیقت سے ایک جذباتی لگاؤ رکھتے تھے اور مذہب میں موجود فرقہ واریت کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ کئی مسلم مفکرین کو دقیانوسی علمائے دین نے کافر تک قرار دے دیا لیکن انھوں نے ایسی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ایذا رسانیوں کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ اس فلسفے میں کبھی بھی اخلاقی اقدار کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور نہ ہی کبھی یہ فلسفہ محض عقلیت پسندی کو اہمیت دے کر اخلاقی پستی کا حامل ہوا۔ اس فلسفے نے اقدار اور حقائق کا امتزاج پیش کر کے اخلاق کو عقل کا رفیق مانا اور ہمیشہ انسان میں موجود اخلاقی نفس کو اس کے عقلی نفس کا مددگار اور دوست سمجھا۔ اس کے علاوہ مسلم مابعدالطبیعات کبھی بھی سماجی مقصد سے الگ نہیں رہا۔ اس فلسفے میں کائناتی عمل کے مطالعے کا رشتہ ہمیشہ سماجی بہتری کے مطالعے سے برقرار رہا اور ساتھ ہی ساتھ انفرادی اور مجموعی زندگی کے انجام کے مطالعے سے بھی وابستہ رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم فلسفہ عوام الناس کی زندگی میں بحیثیت ایک سرگرم تحریک اور قوت کے ہمیشہ زندہ رہا۔ اس فلسفے نے کبھی بھی اپنے آپ کو ایسے مطالعے کی پستی میں نہیں گرنے دیا جو مطالعہ محض عقلی تعیش حاصل کرنے کے لیے عیش و آرام میں بیٹھ کر کیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد زندگی کا صرف باہر سے مشاہدہ کرنا نہیں تھا بلکہ اصل میں یہ مسلمانوں کے لیے ایک دورِ حیات بن گیا تھا۔ مسلم فلسفے نے اعلیٰ ظرفی سے جینے کے مضبوط اصول فراہم کیے اور انھیں اصول و ضوابط کے ذریعے انسان کے عادات و اطوار اور طرزِ عمل کو ایک مکمل شکل عطا کی۔ یہ ان تمام مفکرین کا واحد مقصد بن گیا تھا جو حقیقتِ مطلق کی جستجو میں اپنے وجدان پر اور اپنے فرض پر آمادہ ہو چکے تھے۔

■

Sheeba Iftekhar, 39, Mashak Ganj, Lucknow

تبصرہ و تعارف

انسانی ارتقا

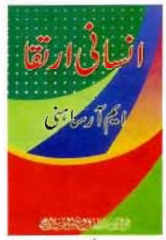

مصنف: ایم آر ساہنی، مترجم: احسان اللہ خاں
صفحات: 730، قیمت: 292
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر مجیب احمد خان، غوری، ای 62، ابوالفضل، انکلیو، نئی دہلی

ایم آر ساہنی سائنسی علوم میں اچھی دسترس رکھتے ہیں۔ انھیں علم ارضیات، علم انسانیات، علم حیوانیات اور علم احفوریات سے دلچسپی ہے۔ اسی سبب انھوں نے 'انسانی ارتقا' کے نام سے ایک دلچسپ اور معلوماتی کتاب لکھی ہے جو پیش لفظ کے علاوہ گیارہ باب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب 'سرسری جائزہ' میں ہمارے اہم مورثان، زندگی کا آغاز، زمین اور دوسرے سیاروں کی ابتدا، عضوی ارتقا میں بعد کے مرحلے اور جاندار گروہوں کی ترتیب کے بارے میں قدیم ہندو خیالات پر بحث کی ہے۔ دوسرا باب 'ارضیاتی ٹائم ٹیبل' میں ارضیاتی اور انسانی تاریخ کا تقابل، وقت کا تخمینہ کرنے کے طریقے اور زمین کی عمر، زمین ایک سرد ہوتا ہوا گولا، ریڈیو کاربن اجزا کے ذریعے عمر کا تعین، فلکیاتی طریقہ، برفانی طریقہ اور سمندر کی عمر کا تعین اس میں پائے جانے والے نمک وغیرہ امور پر مدلل گفتگو کی ہے۔

تیسرا باب 'نئے اور پرانے خیالات' میں عام آدمی کے سوالات: احفور (Fossil) کیا ہوتے ہیں؟ زمین پر زندگی کی شروعات کب ہوئی؟ انسان کی ابتدا کب ہوئی؟ پتھر کے اوزار کیا ہیں؟ کیا انسان غیر دمدار بندر کی نسل سے ہے؟ انسان کے دم کیسے غائب ہوئی؟ وغیرہ۔ کے مفصل جواب دیے ہیں۔

چوتھا باب 'ارتقا کے سنگِ میل' میں انسان کا ارتقا تقریباً کیڑے سے شروع ہوتا ہے، ہمارے امکانی مچھلی نما آبا واجداد، ریڑھ دار جانداروں کی غیر یقین ابتدا، بہتا ہوا پانی ارتقا میں ایک بڑا محرک، فضائی ہوا میں سانس لینے والے جاندار جل تھلی کی مورث ہونے کی دعوے دار مچھلیاں، ابتدائی جل تھلی مچھلی سے شجرہ ملنے کے شواہد وغیرہ بڑے اہم موضوعات پر معروضی دلائل پیش کیے ہیں۔ پانچواں باب 'اسباب ارتقا' میں نامیاتی تبدیلیوں کی بنیاد، ڈارون اور ویلیس نے ماہر اقتصادیات مالتھس سے تحریک حاصل کی، ارتقا میں مضمر تحریک، لیمارک کا نظریہ استعمال وعدم استعمال، انقلاب نوعی کے ذریعے ارتقا وغیرہ پر مدلل بحث کی ہے۔

چھٹا باب 'عظیم برفانی دور' میں یورپ ثبوت کی نوعیت: برفانی، دریائی اور برفانی ملبے وندیوں کے زینے، آلپس کا خطہ، کیا انسان برفانی عصر سے پہلے موجود تھا۔ برفانی ادوار، ہندوستان: برفانی علاقے۔ کشمیر، ہندوستان: برفانی خطوں کے آس پاس کے علاقے۔ وادیِ نربدا، وادیِ سابرمتی: گجرات، مغربی گھاٹ کا خطہ: بمبئی، مشرقی گھاٹ کا خطہ: مدراس، پاکستان: پوٹوار کا خطہ، برما: ایراودی کی وادی اور سری لنکا وغیرہ امور پر جائزہ لیا ہے۔ ساتواں باب 'پتھر کا زمانہ' میں یورپ، ہندوستان، پاکستان اور برما کی تہذیبوں پر مدلل بحث کی ہے۔

آٹھواں باب 'سری لنکا میں پلیسٹوسین اور ماقبل تاریخ:' میں پتھر کے زمانے کی تہذیبوں کا ذکر کیا ہے۔ نواں باب 'حیواناتِ اعلیٰ' میں صفات – درجہ بندی اور ابتدائی تاریخ، آدم نما، حیوان اعلیٰ کے ارتقا کے مقامات، کیا انسان دمدار تھا؟ وغیرہ امور پر روشنی ڈالی ہے۔

دسواں باب 'احفوری انسان کی نسلیں اور اس کے قریبی رشتہ داروں کا تفصیل سے تقابلی جائزہ پیش کیا ہے۔

گیارہواں باب 'حرف آخر' میں مصنف نے بتایا ہے کہ تبدیلی قانونِ فطرت پر مبنی ہے۔ ارتقا نے ہمیں بقا کا جو بنیادی خیال دیا ہے وہ مہارت نہیں بلکہ عمومیت اور مطابقت پذیری ہے۔ آج ہمیں بنیادی طور سے جس چیز کی ضرورت ہے وہ نام نہاد اعلیٰ معیار زندگی نہیں بلکہ ایک آسان تر طریقۂ زندگی ہے۔

موصوف نے اس کتاب میں انسانی ارتقا کی تشریح و تجزیہ اور تقابلی مطالعہ سائنسی حوالوں اور شواہد پر پیش کیا ہے جو معروضیت پر مبنی ہے۔ یہ کتاب سائنسی طلبا کے لیے معلومات کا بیش قیمتی خزانہ ہے۔ اس کتاب میں عمدہ کاغذ استعمال کیا ہے اور سرورق جاذب نظر ہے۔ مترجم نے بھی عمدہ اور سہل زبان استعمال کی ہے۔ امید ہے کہ قارئین پسند فرمائیں گے۔

اردو کے ابتدائی ادبی معرکے

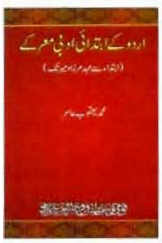

(ابتدا سے عہدِ میر و مرزا تک)
مصنف: محمد یعقوب عامر
صفحات: 249، قیمت: 88 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
تبصرہ نگار: شبانہ خاتون

معرکے ہماری ادبی تاریخ کا ایک اہم حصہ رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب اس قسم کی معرکہ آرائیوں سے ادبی زندگی میں رونق اور چہل پہل رہا کرتی تھی، اور اس کی روشنی میں شاعروں اور ادیبوں کی تخلیقی قوتوں کو پختگی کی میزان میں تولا جاتا تھا۔ اس عمل سے ان کے شعری افکار اور تنقیدی شعور میں توازن کی ایک صورت باقی رہتی تھی، ان کا تخلیقی جوہر بے لگام نہیں ہونے پاتا تھا۔ نئی تنقید کے عہد میں اب ان تخلیقی قوتوں کے سرچشمے خشک ہو گئے ہیں اور بندھے بندھائے مستعار اصول وضوابط اور نظریات کی ٹکسال سے تنقید نگار نکل رہے ہیں، اور ہماری تاریخ کی اس ادبی روایت کی ڈور کہیں پیچھے چھوٹ گئی ہے۔

ادبی معرکوں کی اسی روایت کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو تلاش کرنے، اور انھیں مدون کرنے کی غرض سے محمد یعقوب عامر نے یہ کتاب قلم بند کی ہے۔ اپنی بات کو مختلف مثالوں اور واقعات کی مدد سے ثابت کرنے کی غرض سے انھوں نے تیرہ ابواب قائم کیے ہیں۔ ان ابواب کے تحت ادبی معرکے کی تعریف کرتے ہوئے اس کو مختلف مماثل اصطلاحوں سے ممتاز کیا ہے مثلاً ادبی مباحثہ، ادبی مقابلہ اور ادبی معرکہ جیسی اصطلاحوں پر بحث کرتے ہوئے مختلف اسباب ومحرکات اور عوامل پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ فارسی اور عربی زبانوں میں ادبی معرکہ آرائیوں کی روایت کا بھی سرسری طور سے جائزہ لینے کی کوشش کی ہے۔ میرے خیال میں اس باب کو شامل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ فارسی اور عربی زبانوں میں ان روایتوں کا سراغ لگا سکیں اور اردو زبان میں ادبی معرکہ آرائی کو اُس روایت سے منضبط کر سکیں کہ آخر کار اس زبان کی بیش تر ادبی روایتیں عربی و فارسی ادبی روایتوں کے سایے تلے پروان چڑھی ہیں۔

موصوف نے ہندوستانی شعرا اور ایرانی شعرا کی معرکہ آرائیوں کے لیے بھی ایک باب

مخصوص کیا ہے اور اس میں سراج علی خاں آرزو اور شیخ علی حزیں کی تاریخی معرکہ آرائی کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ محتشم اور والہ داغستانی کی معرکہ آرائی کو بھی اسی باب میں سمیٹا ہے۔

جب شمالی ہند میں ادبی معرکہ آرائیوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس میں تلخی اور کڑواہٹ کے عناصر شامل ہونے لگے۔ قصیدوں، درباردار یوں اور انعام واکرام کی حرص نے اس رنگ کو تیز تر کردیا۔ اور اب علمی صلاحیتوں اور ادبی حیثیتوں سے ہٹ کر ذاتیات پر حملے کیے جانے لگے۔ آبرو، مظہر جان جاناں اور شاکر ناجی وغیرہ کے معرکے اس ضمن میں کافی شہرت حاصل کرچکے ہیں۔ یہی روش آگے چل کر دہلی میں ادبی گروہ بندی کی شکل میں ظاہر ہونے لگی۔ شاگردوں اور دوستوں نے اس رنگ کو ہوا دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ادبی معرکہ آرائی کی وہ صالح روایت جو نئے نئے شعرا کو تخلیقی غذا بہم پہنچاتی تھی، گروہ بندی اور معاندانہ رویوں کا شکار ہوکر اپنی افادیت کھو بیٹھی۔

میر کے معرکوں کو علاحدہ باب میں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ سودا کے معرکوں کو بھی ایک علاحدہ باب میں اکٹھا کیا ہے۔ دراصل سودا بھی اپنے زمانے میں ادبی معرکہ آرائیوں کے لیے کافی مشہور تھے اور ان کے معاصرین سے معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ مرزا فاخر مکیں اور غلام حسین ضاحک (میر حسن مشہور مثنوی گو کے دادا) سے ان کے ادبی تنازعات نے کافی طول پکڑا تھا۔ سودا کے معرکوں کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انھوں نے اس میں ادبی مباحث کو بھی شامل کیا ہے اور ذاتیات پر بھی چوٹیں کی ہیں۔ بعض اشعار میں اس قدر سوقیانہ انداز پیدا ہوگیا ہے کہ ان اشعار کو پڑھ کر عقیدت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔

خلاصۂ بحث کے تحت موصوف نے سارے مباحث کو سمیٹتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ دکنی شعرا کے ہاں معرکوں کا وجود شاعرانہ تعلیوں کی حد تک محدود تھا۔ اسلوب اور انداز بیان کے مباحث ہی موضوع ہوتے تھے۔ عصری چشمکیں دل کی کدورتیں نہیں بنتی تھیں۔ جب دلی میں شاعری کا دور دورہ ہوا تو بھی اس میں نکتہ چینی جیسی کوئی بات نہیں تھی، ہاں زبان و بیان اور اس کی تہذیب کو ذہن میں رکھتے ہوئے بیش تر مباحث کا آغاز ہوتا تھا۔

ڈھائی سو صفحات پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے عربی فارسی کے علاوہ اردو کے بیش تر شاعروں کی معرکہ آرائیوں کو سمیٹنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ مثالوں سے مختلف واقعات کو درست ثابت کیا ہے، جانبین کے اشعار کو پیش کرکے صحیح صورت حال تک رسائی کو ممکن بنایا ہے۔ ہاں! قارئین سے گزارش ہے کہ کتاب کی عبارت کو ذرا سنبھل سنبھل کے پڑھیں کیونکہ ایک تو اس زمانے کی زبان جس میں فارسی آمیز ترکیبیں، عبارتیں اور اشعار؛ دوسرے ٹائپنگ اور پروف وغیرہ کی بے احتیاطی، اس کام کا انجام معلوم: فارسی جملے، فقرے اور اشعار دولخت ہوگئے ہیں جن سے اصل مفہوم تک رسائی مشکل سے ہوسکتی ہے۔ موصوف نے بعض اشعار کو ادھورا قلم بند کیا ہے شاید تہذیب مانع رہی ہو، لیکن اگر وہ مکمل اشعار اپنی صحیح صورت میں اس کتاب میں جگہ پاتے تو مزید بہتر اور درست نتیجے تک رسائی زیادہ آسان ہوجاتی۔ مجموعی طور سے یہ کتاب اس لیے پڑھی جانی چاہیے کہ اس میں ہماری ادبی روایات کے کچھ گم شدہ نقوش تلاش کیے جاسکتے ہیں، بعض روشن اور تابندہ اور بعض تہذیب کے نام پر بدنما داغ۔

مجاز: شخص وشاعر

مصنف: پروفیسر علی احمد فاطمی

صفحات: 160 قیمت: 200 روپے

ملنے کا پتہ: رجحان پبلی کیشنز، سی 82، کریلی کالونی، الٰہ آباد

مبصر: ڈاکٹر ابوظہیر ربانی، R-252/B، گلی نمبر 3/4، جوگا بائی ایکسٹینشن، نئی دہلی

معروف ترقی پسند ناقد پروفیسر علی احمد فاطمی کی زیر تبصرہ کتاب 'مجاز: شخص وشاعر' مجاز صدی (2012) کے قومی اور بین اقوامی سمینار کے لیے لکھے گئے مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل 'فیض ایک نیا مطالعہ' فیض صدی کے موقع پر شائع ہوکر داد وقبولیت حاصل کرچکی ہے۔ دراصل علی احمد فاطمی مخلص اور قدروں کے پاسدار نقاد ہیں۔ وہ عاشق مزاج اور شراب نوش شاعر کی شاعری اور شخصیت کا جائزہ لیتے وقت غیر معیاری روایات اور تعصّبات سے پرے نظر آتے ہیں۔ مضامین میں جہاں خلوص اور تحسین ہے وہاں تنقید بھی ہے۔ فاطمی صاحب کا خیال ہے کہ "شاعر ترقی پسند ہو یا جدید سب ہمارے اردو زبان کے شاعر ہیں۔ انھیں خلوص اور ہمدردی سے پڑھنے، سمجھنے اور نئے تناظر میں پیش کرنے کی ضرورت ہے۔" موصوف اسرار الحق مجاز کا جائزہ لیتے وقت اپنے اصول پر کاربند نظر آتے ہیں۔

9 ابواب پر مشتمل کتاب کا پہلا مضمون 'مجاز کی زندگی کا ایک اہم موڑ' ہے، جس میں مصنف نے آگرہ میں مجاز کا حصول تعلیم کے قیام کے دو سال کی زندگی کو ایک اہم موڑ قرار دیا ہے، جہاں سے مجاز کی بے راہ روی اور شراب نوشی کی ابتدا ہوئی۔ فاطمی صاحب نے اس بے راہ روی کا سبب مجاز کا گھریلو ماحول بتایا ہے، جہاں بے فکری اور بے پایاں لاڈ و پیار ملا نیز مجاز کے چچا رنگین ولا ابالی طبیعت کے مالک تھے۔ ممکن ہے مجاز نے ان کا بھی اثر لیا ہو۔ جب کہ ہم عصر نقاد اس معاملے میں خاموش نظر آتے ہیں۔ مصنف کے مطابق مجاز کی شاعری کا آغاز بھی آگرہ سے ہی ہوتا ہے۔ مجاز کی فانی اور میکش سے ملاقات اور فانی سے اصلاح لینے کا ذکر، مجاز کے بچپن کے حالات، تعلیم، آگرہ کا ادبی ماحول نیز علی گڑھ اور دہلی میں گزارے ادبی لمحات کا تجزیہ بھی لائق توجہ ہے۔ ان لمحات میں زیادہ تر ادب سے جڑی باتیں ہیں۔

'مجاز فہمی کا ایک نیا باب' کے تحت ترقی پسند ناقد پروفیسر شارب ردولوی کی تصنیف 'اسرار الحق مجاز' کا جائزہ لیا گیا ہے۔ کتاب کی دلچسپی کا سبب کتاب کے مقدمے کی متوازن اور مدلل گفتگو ہے۔ فاطمی صاحب نے لکھا ہے کہ شارب ردولوی نے مجاز کی زندگی اور شخصیت کی سچائیوں کو دلیل اور منطق کے ساتھ پیش کرکے ایک لائق مطالعہ کتاب بنا دیا ہے۔ مجاز کی ابتدائی دور کی شاعری کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے فاطمی صاحب نے اس دور کو مجاز کی شاعری کا اہم دور کہا ہے، جس کی انتہا نظم 'آوارہ' پر ہوتی ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ اسی تناظر میں مجاز کی بقیہ شاعری کو بھی پرکھا جاسکتا ہے۔ اس مقالے کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مجاز کی شاعری کا آغاز تو آگرہ میں ہوا لیکن بہترین نظموں کا زمانہ علی گڑھ ہے، جسے علی احمد فاطمی نے ترقی پسند شاعری کی پہلی منزل کہا ہے۔ مجاز کی نظموں کے جائزے سے یہ بات مترشح ہوتی ہے، بقول فاطمی صاحب "مجاز کی انقلابی شاعری اس کی رومانی اور نشاطیہ شاعری کا ایک حصہ ہے" جو صرف اپنی ذات کا نوحہ بیان نہیں کرتی بلکہ آفاقی حقائق سے روشناس بھی کراتی ہے۔ لہٰذا فاطمی صاحب کا مفروضہ ہے کہ "مجاز مکمل ہر دلعزیز اور مقبول شاعر ہیں۔ انھیں لاابالی، شرابی اور غیر دانشور" کہہ کر صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔

'انقلاب کی حقیقت اور مجاز' میں علی احمد فاطمی نے انقلاب کی تاریخ اور تعریف کی روشنی میں مجاز کی انقلابی شاعری کو سمجھنے پر زور دیا ہے۔

پروفیسر فاطمی نے مجاز کی نظم 'آوارہ' کا عالمانہ جائزہ پیش کرتے ہوئے اس نظم کو ترقی پسند نظموں میں ہی نہیں بلکہ اردو کی بہترین نظموں میں شمار کیا ہے۔ مصنف کے مطابق نظم 'آوارہ' دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ محبت میں ناکامی کی کہانی سناتا ہے جب کہ دوسرا حصہ مجاز کی اضطرابی کیفیت کو پیش کرتا ہے۔ جو پہلے تو احتجاج، پھر اشتراکیت میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اس نظم کے تجزیہ سے مجاز کے فکر واحساس کا دریچہ وا ہوتا نظر آتا ہے۔

مجاز کا عہد ملکی اور بین الاقوامی سیاست کے نازک دور سے گزر رہا تھا۔ تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ ایسے ماحول میں دیگر ترقی پسند ادیبوں اور دانشوروں کی طرح مجاز نے جنگ کے خلاف جو بیان دیا، فاطمی صاحب نے اسے اپنے آخری مضمون 'جنگ سے

متعلق مجاز کا بیان' میں من وعن نقل کیا ہے تاکہ قاری انسانیت سے متعلق مجاز کی بلندیِ فکر سے آگاہ ہوسکے اور اسے مجاز کی شاعری کی افہام وتفہیم میں مدد ملے۔ یہ کتاب مجاز فہمی کا ایک نیا جواز فراہم کرتی ہے اور مجاز تنقید میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔

عبدالقوی دسنوی— حیات اور خدمات

مرتبین: محمد نعمان خاں، کوثر صدیقی، آفاق حسین صدیقی
صفحات: 545، قیمت: 211 روپے
ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر دیوان حنان خاں،
ڈیپارٹمنٹ آف ایجوکیشن ان لینگویجز، این سی ای آر ٹی، نئی دہلی

پروفیسر عبدالقوی دسنوی (مرحوم) کی علمی، تعلیمی اور ادبی خدمات ہمہ جہت اور ہمہ گیر ہیں۔ ان کا شمار اردو کے کامیاب معلم، معتبر محقق و نقاد، اشاریہ ساز اور ادیب کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ وہ اردو کے سچے عاشق اور بے لوث خدمت گار تھے۔ شعبۂ اردو سیفیہ کالج میں ایک وقیع تحقیقی کتب خانہ قائم کیا جس میں 20 ہزار سے زیادہ قیمتی ادبی کتب، رسائل، اخبارات اور نایاب مخطوطات محفوظ ہیں۔ اپنے پچاس سالہ علمی، ادبی اور تعلیمی سفر کے دوران انھوں نے مختلف موضوع پر 300 سے زیادہ مضامین و مقالات تحریر کیے اور پچاس سے زیادہ تحقیقی، تنقیدی کتب تصنیف کیں۔ کئی اشاریے اور 'مجلّہ سیفیہ' اور 'نوائے سیفیہ' کے شمارے مرتب کیے۔ غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد اور بھوپال کے شعر و ادب سے متعلق یادگار خصوصی نمبر شائع کیے۔ شعبۂ اردو سفیہ کالج میں 'گوشۂ غالب'، 'گوشۂ اقبال'، 'گوشۂ ابوالکلام آزاد'، 'گوشۂ بھوپال'، 'گوشۂ لغات' اور 'گوشۂ سیفیہ' قائم کرکے تحقیق کرنے والوں کے لیے قیمتی ادبی اثاثہ محفوظ کردیا اور نوجوان نسل کو اردو زبان وادب کی جانب متوجہ کرکے ان کی ذہنی، فکری، علمی اور ادبی تربیت کا فریضہ انجام دیا۔

غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی اور بھوپال ان کے خاص موضوعات تھے۔ 'بھوپال اور غالب'، 'علامہ اقبال بھوپال میں'، 'غالبیات'، 'نسخۂ بھوپال اور نسخۂ بھوپال ثانی'، 'ایک شہر پانچ مشاہیر'، 'حسرت کی سیاسی زندگی'، 'مہدی حسن افادی'، 'اقبال اور دلی'، 'اقبالیات کی تلاش'، 'مطالعہ غبارِ خاطر'، 'تلاشِ آزاد'، 'حیاتِ ابوالکلام آزاد'، 'معاصرین و متعلقات آزاد'، 'یادگارِ سلیمان'، 'اردو شاعری کی گیارہ آوازیں'، 'میں اردو ہوں' اور 'بمبئی سے بھوپال تک' ان کی اہم تصانیف ہیں۔ انھوں نے غالب، اقبال، ابوالکلام آزاد، سید سلیمان ندوی، انیس، دبیر، پریم چند، احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی اور مہدی افادی سے متعلق اشاریے مرتب کیے۔ ان کے تحقیقی و تنقیدی مضامین کے مجموعے 'تلاش وتاثر'، 'سات تحریریں' کے نام سے شائع ہوچکے ہیں۔

پروفیسر دسنوی کا تعلق صوبۂ بہار کے اس مردم خیز قصبے دسنہ سے تھا جس نے مولانا سید سلیمان ندوی، نجیب اشرف ندوی، ابوظفر ندوی، شہاب الدین دسنوی، سید سعید رضا، سید محی رضا، سید بشیر دسنوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن جیسے علما اور ادبا کو جنم دیا تھا۔ پروفیسر دسنوی کی ابتدائی تعلیم دسنہ اور اطراف کے شہروں میں اور اعلیٰ تعلیم سینٹ زیویئرس کالج بمبئی میں ہوئی تھی۔ 21 فروری 1961 سے وہ بحیثیت استاد، شعبۂ اردو، سیفیہ کالج سے منسلک ہوئے اور 31 اکتوبر 1990 کو اس ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ بھوپال ان کا وطن ثانی تھا۔ انھوں نے اسی شہر میں مستقل سکونت اختیار کرکے 7 جولائی 2011 کو انتقال کیا اور وہیں تدفین عمل میں آئی۔

حکومت ہند نے انھیں تحقیقی کام کے لیے سینئر فیلوشپ تفویض کی۔ ان کی مجموعی ادبی خدمات کے جائزے کے بطور ان کی زندگی میں دو کتابیں: 'عبدالقوی دسنوی- ایک مطالعہ' اور 'سرمایۂ ادب' شائع ہوچکی ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد، بھوپال کی معروف تعلیمی، سماجی اور ادبی تنظیم 'علما ایجوکیشن سوسائٹی' نے ان کی شخصیت اور خدمات سے متعلق دو روزہ قومی سمینار، قومی اردو کونسل برائے فروغِ اردو زبان، (نئی دہلی) کے مالی تعاون سے یکم تا دو اپریل 2012 کو بھوپال میں منعقد کیا تھا جس میں ہندوستان کے سربرآوردہ اردو شعرا اور اسکالرس نے شرکت کرکے دسنوی صاحب کی شخصیت و خدمات سے متعلق مقالات و منظومات پیش کیں۔

زیر نظر کتاب میں مذکورہ بالا مقالات و منظومات کے علاوہ 'حیات نامہ' کے عنوان سے پروفیسر دسنوی کا خاندانی شجرہ اور ان کی کتابوں اور مضامین کی فہرست، اکابرین کے تاثرات، تعزیتی قراردادیں، اخبارات و رسائل کے خصوصی اداریے شامل ہیں۔ کتاب کے آخر میں پروفیسر دسنوی سے متعلق اہم تصاویر بھی شائع کی گئی ہیں۔ 545 صفحات اور 9 ابواب پر مشتمل دسنوی صاحب کی شخصیت و خدمات سے متعلق یہ خوبصورت کتاب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (نئی دہلی) کے مالی تعاون سے عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی نے شائع کی ہے۔

امید کہ ادبی حلقوں میں اس کتاب کی خاطر خواہ پذیرائی ہوگی اور پروفیسر دسنوی پر تحقیقی کام کرنے والے ریسرچ اسکالرس کے لیے یہ کتاب مفید و معاون ثابت ہوگی۔

کرامت علی کرامت-ایک مطالعہ

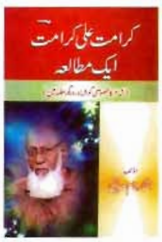

مرتبین: افتخار امام صدیقی، محمد رحمت اللہ صدیقی
صفحات: 288، قیمت: 300 روپے
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی-6
مبصر: حقانی القاسمی، ڈی-64، فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو
جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی-25

پروفیسر کرامت علی کرامت کا بنیادی رشتہ سائنس کے شعبہ ریاضیات سے ہے مگر بشریات کے شعبے میں بھی ان کی شناخت مستحکم ہے۔ خاص طور پر شاعری اور تنقید کے باب میں ان کے امتیازات روشن ہیں۔ انھوں نے جہاں ادب اور ریاضی کے مابین رشتے کی ایک نئی منطق دریافت کی ہے وہیں تنقید کو نئے ابعاد عطا کیے ہیں۔ شاعری میں ان کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے ریاضی اور شاعری کے مابین توازن اور ہم آہنگی کی جستجو کی ہے اور دونوں کے افتراق کو ارتباط میں تبدیل کیا ہے۔

اور تنقید میں ان کا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے تنقیدی اضافیات کے ایک نئے نظریے سے اردو ادب کو روشناس کرایا۔ یہ فڈرک اے پوٹل کے نظریہ Critical Relativism سے ذرا مختلف ہے۔ اس تعلق سے خود کرامت علی کرامت کا کہنا ہے کہ پوٹل کے نظریہ شعری کے برعکس میرا یہ نظریہ محض تھیوری تک محدود نہیں تھا بلکہ معروضی انداز میں عملی طور پر استعمال بھی ہوسکتا تھا۔ میری یہ تنقید نہ صرف قاری اساس تنقید ہے اور نہ صرف شاعر اساس تنقید بلکہ اس میں شاعر کے تخلیقی عوامل سے لے کر 'شاعر بحیثیت نقاد' کے ذہنی ردعمل سے گزرتے ہوئے باشعور قاری تک ترسیل وابلاغ کے تمام مراحل میں جذبات کی اضافی فراوانی (Relative Express) کا تحلیلی تجزیہ کیا جاتا ہے اور موسیقی وآہنگ کے سائنسی اصول سے اخذ شدہ نظریوں کے اطلاق سے فن پارے کی قدر و قیمت معروضی اصول سے متعین کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔''

کرامت علی کرامت نے شاعری اور تنقید دونوں کو ہی نئے ابعاد اور جہات عطا کیے ہیں۔ اس اعتبار سے ان کی تنقیدی اور تخلیقی شخصیت کے انفراد اور اختصاص سے انکار ممکن

نہیں ہے۔ کرامت علی کرامت ملٹی ڈائمنشنل شخصیت ہیں، جن کی اردو میں خدمات کا دائرہ خاصا وسیع ہے۔ ان کا ایک اہم کارنامہ اردو اور اڑیا میں قربت کی تلاش بھی ہے۔ کرامت علی کرامت کی شخصیت اتنی بلند ہے کہ ان کی خدمات کا اعتراف جامعات میں تحقیقی مقالات یا اداروں کی طرف سے ارمغان کی صورت میں بہت پہلے کیا جانا چاہیے تھا۔ پھر بھی شکر ہے کہ مردہ پرستی کے اس دور میں کرامت علی کرامت جیسے زندہ تخلیقی اور تنقیدی ذہن کے اعتراف کی صورت 'شاعر' کے مدیر افتخار امام صدیقی نے نکال ہی لی۔ شاعر میں ان پر ایک خصوصی گوشہ شائع ہوا تھا اور اس کے علاوہ دوسرے مضامین تحریر کیے گئے تھے جسے ایک کتابی صورت دے کر 'کرامت علی کرامت: ایک مطالعہ' کے عنوان سے شائع کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان کی شخصیت اور خدمات کے تعلق سے مشاہیر کی تحریریں شامل ہیں، جن میں مظہر امام، افتخار امام صدیقی، سید شکیل دسنوی، سید اولاد رسول قدسی، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، علیم صبا نویدی، حنیف نجمی، ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، رئیس الدین رئیس، مطیع اللہ نازش، خاور نقیب، عبدالمتین جامی، گیان چند جین، یوسف جمال، ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید، اسلم حنیف، ڈاکٹر مہ جبین اور محمد پٹھان شامل ہیں۔ ان مضامین میں ان کے شعری مجموعے 'شاخ صنوبر' اور ان کی اہم تنقیدی کتابوں 'اضافی تنقید' اور 'نئے تنقیدی مسائل اور امکانات' پر تنقیدی مطالعات شامل کیے گئے ہیں۔ ان تمام مضامین سے کرامت علی کرامت کے تخلیقی وجدان اور تنقیدی بصیرت کا عرفان ہوتا ہے۔ یحییٰ نشیط نے جہاں کرامت علی کرامت کا سائنسی شعور اور خاور نقیب نے کرامت علی کرامت کی شاعری میں صنائع وبدائع کے حوالے سے اچھی گفتگو کی ہے، وہیں اسلم حنیف نے ان کی تنقید کے حوالے سے عمدہ بحث کی ہے اور یہ اعتراف کیا ہے کہ ''کرامت علی کرامت نے نظریۂ انتشار اور فزی منطق کے حوالے سے تفصیلی گفتگو کی ہے جو معاصر مغربی نظریات سے آگہی کے ساتھ ان کے مثبت اندازِ فکر اور مستقل پھیلتے ہوئے علمی افق کو نشان زد کرتی ہے۔ اس بات کی تصدیق کے لیے اس حقیقت کا اظہار ضروری ہو جاتا ہے کہ کرامت علی کرامت نے اگر چہ اپنی تحقیق کی ابتدا نظریۂ امکانات سے کی تھی، مگر فکر و تجسس کا دائرہ وسیع ہوتا رہا اور اب اس کے حدود میں آپریشنز ریسرچ (Operations Research)، ریاضیاتی لسانیات (Mathematical Linguistics) اور فزی منطق (Fuzzy Logic) جیسے تازہ کار موضوعات بھی شامل ہو چکے ہیں۔''

کرامت علی کرامت نے تنقید، ترجمہ اور تخلیق تینوں میدانوں میں امتیازی نقوش قائم کیے ہیں۔ انھوں نے چھتا سینا کانت مہاپاتر کی اڑیا نظموں کا اردو ترجمہ 'لفظوں کا آکاش' کے عنوان سے کیا ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی کے ترجمہ انعام سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ ان کا اہم تحقیقی کام 'آبِ خضر' بھی ہے جو شعرائے اڑیسہ کا پہلا تذکرہ ہے۔ شاخسار، نئی شناخت اور ترویج جیسے ادبی مجلات سے بھی ان کی ادارتی وابستگی رہی ہے۔ اس اعتبار سے کرامت علی کرامت کی شخصیت بڑی متنوع اور ہمہ جہت ہے اور یہ مرتب کردہ کتاب دراصل ان کے ایسے ہی ہنر کا اعتراف نامہ ہے۔ افتخار امام صدیقی اور رحمت اللہ صدیقی نے یہ کتاب مرتب کرکے اردو دنیا کی طرف سے کفارہ تو ادا کر دیا ہے مگر ان کی تنقید اور خاص طور پر اضافی تنقید پر نئے عہد میں مزید ڈسکورس اور مکالمے کی ضرورت ہے۔ کتاب کے آخر میں رحمت اللہ صدیقی نے کرامت علی کرامت کے اہم مضامین کے اقتباسات دیے ہیں جو بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا منتخب کلام اور منتخب اشعار بھی ہیں۔ سب سے اہم کام رحمت اللہ صدیقی نے یہ کیا کہ ان کے تخلیقی اشاریے کو مرتب کرکے ان کی تمام تحریروں سے شناسائی کی ایک اچھی صورت قاری کے لیے پیدا کر دی ہے۔

پاکستان نامہ

مصنف: فیروز اشرف
صفحات: 376، قیمت: 250 روپے
ناشر: کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، ممبئی 8
مبصر: احمد کفیل، CIL/SL&CS جے این یو، نئی دہلی

'پاکستان نامہ' ہندی اور اردو کے مشہور کالم نگار جناب فیروز اشرف کے پچیس برسوں کی کالم نگاری کی دستاویز ہے۔ صحافت اور کالم نگاری ان کا ایسا پیشہ ہے جو شوق کی منزلوں کو عبور کرتا ہے۔ مذکورہ کتاب موصوف کے ان کالمس کے انتخاب پر مشتمل ہے جو ہندی ہفتہ وار 'دھرم یگ' اور روزنامہ 'نو بھارت ٹائمز' میں 1985 سے 2010 تک 'پاک نامہ' اور 'پاکستان نامہ' کے عناوین سے شائع ہوتے رہے۔

کسی ایک خاص پہلو پر مسلسل 25 برسوں تک کالم لکھتے رہنا واقعی اپنے آپ میں ایک غیر معمولی کارنامہ کہا جاسکتا ہے جس میں شوق اور مواد دونوں کا بھرپور دخل ہے۔ موصوف نے ان کالمس میں اسی سانجھی وراثت کے تار کی جھنجھناہٹ کو محسوس کیا ہے جو سیاسی شور شرابے میں دیتی جارہی ہے۔ ہندی، اردو اور ڈوگری کے کہنہ مشق ادیب جناب ویدراہی نے بجا طور پر اس کتاب کو 'پاکستان کا ایک بڑا کولاج' تسلیم کیا ہے۔

موصوف کو پاکستان کے حالات اور معاملات کا ایکسپرٹ مانتے ہوئے ویدراہی صاحب کا کتاب کے متعلق اظہار خیال یہ ہے کہ فیروز اشرف نے تقسیم کی ٹریجڈی کے پیش نظر دونوں ملکوں کے درمیان آپسی بھائی چارے کو فروغ دینے کی کوشش کی ہے۔

پاکستان کے معاملات و مسائل پر جناب فیروز اشرف کو لکھتے رہنے کی یہ تحریک روزنامہ 'نو بھارت ٹائمز' کے ایڈیٹر ڈاکٹر دھرم ویر بھارتی سے ملی۔ یہ تب کی بات ہے جب پاکستان میں جنرل ضیاء الحق کی فوجی حکومت تھی۔ اس وقت سے لے کر پیپلز پارٹی کی جمہوری حکومت تک گاہے گاہے بازخوانی کا یہ سلسلہ چلتا رہا ہے۔ جناب وشوناتھ سچدیو جو روزنامہ 'نو بھارت ٹائمز' اور 'دھرم یگ' کے علاوہ کئی اخبارات کے مدیر رہ چکے ہیں اور جن سے فیروز اشرف کی اس زمانے سے قربت ہے، وہ موصوف کالم نگاری اور حصولِ مواد سے متعلق لکھتے ہیں:

''میری خواہش تھی کہ فیروز اشرف ادب، کلچر اور جدید سماجی رجحانات تک ہی محدود رہیں پر وہ وقت کے ساتھ بھی جڑے رہنا چاہتے تھے۔ پاکستانی سیاست بھی کب اس کالم کی جگہ بنی اس کا پتا نہیں چلا۔''

کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوا ہے کہ یہ 'پاکستان نامہ' پاکستان کے سماجی اور تمدنی زندگی کا ایک آئینہ ہے۔ اس کے کالم جھروکے ہیں جن سے گھر کے کونے کونے اور بکھرے اور سجے سجائے مناظر کا نظارہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب کے مشمولہ کالمس میرے دعوے کی شہادت دیں گے۔ مثلاً پاک میں سات سال سات مہینے بعد آخر کفر ٹوٹا، ادب پر فوج کا دباؤ، ایشور اللہ تیرے نام، پاکستان میں گیتا کانفرنس، راجیو گاندھی کا پاکستان میں استقبال ہے، اب کاروباری رشتے استوار ہونے چاہیے، لاہور میں بسنت پنچمی کی شان، سرحدی گاندھی اور جی ایم سید کا مقدمہ، ویدومہابھارت اور پاکستان، قائد اعظم کا آخری دن، تمس تقسیم کا درد باقی ہے، ہندوستانی کتابوں کی مانگ بہت ہے پر رسائی نہیں، زندہ دلوں کا شہر لاہور، یوم ہندی پاکستان میں کب منایا جائے گا۔ وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں، ثقافتی علاحدگی کا درد، پاکستان میں غیر مسلم ہونا، پاکستانی ڈراموں کے بدلتے چہرے، میر خلیل الرحمٰن اور ان کا اخبار، جنگ پاکستان میں ہندی، ستیہ میو جیتے، مشترکہ تہذیب کی علامت بسنت، خوشبو بکھر گئی، مرار جی دیسائی اور پاکستان، رانجھے کی ہیر کا میلا

لگتا ہے وہاں، کراچی کے بنگالی ابن انشا 1995 کا پاکستانی ادب، تقسیم وطن کے شکار معصوم لوگ، ہند پاک میں ویزا کی مشکلات، کارزار صحافت میں پاکستانی صحافت، پاکستان میں منٹو کی واپسی، پاکستان میں یوم مزدور، اور صوبۂ سرحد میں سچ کیا ہے جیسے عناوین آپ کو اس کتاب کے مطالعے پر ضرور اکسائیں گے۔ میں نے بلا انتخاب آدھے ادھورے عناوین کا ہی یہاں ذکر کیا ہے باقی آپ کے شوق پر منحصر ہے۔

فیروز اشرف ایک آزاد صحافی ہیں جنھوں نے بہار کے ہزاری باغ کے ایک مہذب اور تعلیم یافتہ خاندان میں اپنی آنکھیں کھولی اور اب جوگیشوری ممبئی میں مقیم ہیں۔ ان کی صحافت کا آغاز 1965 میں 'چھوٹا ناگپور ایکسپریس' سے ہوا اور پھر رفتہ رفتہ عالمی سطح پر چھا گئے۔ انھوں نے پہلی بار 1988 میں اور پھر دوسری بار 2006 میں پاکستان کے مختلف خطوں کی سیر کی۔ اس درمیان انھیں پاکستان اور پاکستانیوں کو اور بھی زیادہ نزدیک سے دیکھنے، جاننے اور سننے کا موقع ملا۔ گویا 'پاکستان نامہ' کے وجود میں آنے کے مواد میں اخبارات و رسائل اور لوگوں سے ملاقاتوں کے ساتھ ساتھ ذاتی مشاہدے و تجربے کی کارفرمائی بھی رہی ہے۔ ظاہر ہے کالمس بیشتر ہندی میں لکھے گئے تھے جنھیں اردو میں ترجمہ کرنے کا شرف ان کے ایک طالب علم نادر کو حاصل ہوا اور انھوں نے اپنی ذمے داری بحسن وخوبی نبھائی ہے۔

ابن صفی مشن اور ادبی کارنامہ

مرتب: محمد عارف اقبال

صفحات: 48+1032، قیمت: 595 روپے

ناشر: اردو بک ریویو، دہلی

مبصر: خان احمد فاروق، صدر شعبہ اردو، حلیم مسلم پی جی کالج، کانپور

زیر تبصرہ کتاب مرتبہ و مولفہ محمد عارف اقبال کے دیرینہ خواب کی تکمیل ہے بلکہ لاکھوں شائقین ابن صفی کی دعاؤں کا ثمرہ اور ہندوستان سے ابن صفی پر شائع ہونے والی پہلی اہم کتاب ہے۔ محمد عارف اقبال اردو میں ایک منفرد سوچ کی حامل شخصیت کا نام ہے جو ہمیشہ بنی بنائی ڈگر سے ہٹ کر کچھ کرنے کی عادی ہے۔ اس کی پہلی شکل تو 'اردو بک ریویو' ہے جو اردو میں پہلی اور غالباً آخری مثال ہے۔ بمعہ دوسری مثال ابن صفی کے ناولوں کی اشاعت کے لیے ایک خاصے تجارتی انداز کے اشاعتی ادارہ کو تیار کرنا ہے جس کو ان کی دوراندیشی اور ایک بار پھر ابن صفی کی تحریروں کو اسی کامیابی کی منزل پر پہنچ جانے کا حددرجہ ایقان کے بغیر ممکن نہیں تھا اور تیسرے یہ کتاب جو ابن صفی کو اب تک نظر انداز کیے جانے کا ازالہ کر سکے۔ وہ یہ کتاب آسانی سے مرتب کر سکتے تھے اگر پاکستان کے نوجوان ابن صفی کے پرستار راشد اشرف اور ابن صفی کے شاگرد معنوی مشتاق احمد قریشی کی مرتبہ کتابیں منظر عام پر نہ آ گئی ہوتیں۔

محمد عارف اقبال کی مرتبہ کتاب 'ابن صفی: مشن اور ادبی خدمات' کو دیکھنے سے پہلے میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ پچھلی دونوں کتابوں سے ساٹھ ستر فی صد مواد تو اس میں ہوگا کہ ہند و پاک میں یہ عام چلن ہے۔ ہمارے کچھ ہندوستانی رسالے تو اس بھروسے کامیاب ہیں۔ لیکن مرتب نے ایک الگ راہ نکالی حالانکہ اس میں وہ کچھ بھٹکے بھی لیکن کامیاب و کامران گزر گئے۔ اس کتاب کو مرتب نے دس حصوں یا ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ (1) ابن صفی جہات اور مشن (2) فکر ونظر: اہل علم وادب کے تاثرات وتبصرے (3) ابن صفی: عصری تناظر میں (4) تحقیق وتنقید (5) ابن صفی: کردار نگاری کے آئینے میں (6) تجزیہ و تبصرہ چند ناولوں کے حوالے سے (7) ابن صفی سے مکالمہ (8) ابن صفی کے ناولوں سے فکرانگیز زریں اقتباسات (9) منتخب تخلیقات (ابن صفی کے مضامین اور ناول) (10) شعری تخلیقات۔ اس کے علاوہ تصویریں اور خاصی تعداد میں اشتہارات، جو کسی بھی اردو ناشر کے لیے خوش آئند بات کہی جا سکتی ہے۔

پہلے بھٹکنے کی بات کر لیں پھر کامیابی کی طرف چلتے ہیں۔ جس نے بھی ابن صفی، راشد اشرف کی دونوں کتابوں اور ویب سائٹ۔ خرم علی شفیق کی سائکوپنش اور رانا پیلیس، مشتاق احمد قریشی کی مرتبہ کتاب اور محمد حنیف کی ویب سائٹ کا مطالعہ کیا ہوگا اس کے لیے اس کتاب کے چار سو صفحات کار زیاں ہی ٹھہریں گے۔ اس میں محمد عارف اقبال کی وہ تحریریں بھی شامل ہیں جو انھوں نے ابن صفی کے ناولوں کے ساتھ شائع کی تھیں۔ جس کی یہاں کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ابن صفی کے چھ مضامین جو انھوں نے طغرل فرغان اور عقرب بہارستانی اور سنکی سولجر نام سے لکھے (ان پچاس مضامین کو گوارا کیا جا سکتا ہے) لیکن ابن صفی کے دو مکمل ناول شامل کرنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔

لیکن اس کتاب کے پانچ باب ایسے ہیں جن کی وجہ سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ کتاب کو منظر عام پر آنے میں خاصی تاخیر بھی ہوئی لیکن کتاب کی اہمیت اور وقعت دونوں میں خاصا اضافہ بھی ہوا اور ظاہر ہے یہ کام صرف محنت سے نہیں بلکہ جنون اور شوق بے پناہ کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتا تھا۔

باب دوم یعنی فکر ونظر: اہل علم وادب کے تاثرات وتبصرے والا حصہ یقیناً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ مرتب نے کیسے کیسے جید اور نادر روزگار شخصیات کی تحریریں یہاں جمع کر دیں ہیں اور اس کے لیے انھیں کیا کیا کرنا پڑا ہوگا یہ ان کا دل ہی جانتا ہوگا۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ، شمس الرحمٰن فاروقی، ڈاکٹر شمس بدایونی، عالم نقوی، امجد اسلام امجد، رئیس امروہوی، حسن کمال، ڈاکٹر امتیاز احمد، ڈاکٹر ابرار رحمانی، ڈاکٹر کوثر مظہری، پروفیسر فاروقی بخشی، شمیم طارق، پروفیسر آفاق احمد، ڈاکٹر فیروز دہلوی، شاہد جمیل، ڈاکٹر خالد جاوید، نصرت ظہیر، ڈاکٹر محبوب راہی کو ملا کر 35 لوگوں کے تاثرات موجود ہیں۔ ناموں کی ترتیب ضرور محل نظر ہے لیکن اس باب کے حوالے سے یہ ضرور کیا جا سکتا ہے کہ اب یہ شکایت کم ہو جانی چاہیے کہ ابن صفی کے نام پر ثقہ حضرات ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔

پانچواں باب جس میں ابن صفی کے کرداروں کا جائزہ پیش کیا گیا ہے خاصا دلچسپ ہے۔ یہاں قطب الدین شاہد، محمد مقیم، راشد اشرف، سہیل انجم، ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی، رؤف خوشتر، اقرار سبحان، ڈاکٹر محمد اشرف کمال، لئیق رضوی، خرم علی شفیق، شکیل رشید خاں کے مضامین موجود ہیں۔

باب چھ تجزیہ اور تبصرہ اور باب سات ابن صفی سے مکالمہ کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ غالباً سید ابوالخیر کشفی کے بعد پہلی بار ابن صفی کے ناولوں کے علیحدہ تجزیے ڈاکٹر عبدالحی، ڈاکٹر سید تنویر حسین، ڈاکٹر شاہ رشاد عثمانی، ڈاکٹر شکیل اختر، کوثر جہاں، رویدہ خان، حکیم بی۔ این ڈار، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن، ڈاکٹر منظر اعجاز اور مشتاق احمد قریشی نے پیش کیے ہیں جو ابن صفی کا نئے اور تجزیاتی انداز سے مطالعے کی جانب مہمیز کرتے ہیں۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے ایک بات بار بار ذہن میں آتی ہے کہ محمد عارف اقبال نے اتنے بہت سارے قلم کاروں کو اس میں جمع کر دیا اور خاص طور سے نئی نسل کے لکھنے والوں کو معلوم ہوتا ہے کہ اب ابن صفی کو ان کے نقاد میسر آ گئے۔ جو ابن صفی کو اردو کے معاشرتی سیاق میں اپنے زیادہ قریب محسوس کرتے ہیں جس کو یقیناً ایک دریافت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس شاندار کتاب کی اشاعت پر مرتب اور ادارتی ممبران ڈاکٹر سید تنویر حسین اور ڈاکٹر عبدالحی کی جتنی بھی ستائش کی جائے کم ہے۔

آزادی کے بعد اردو صحافت

مصنف: ڈاکٹر افضل مصباحی
صفحات: 400، قیمت: 183 روپے
ناشر: ماہ نور پبلی کیشنز، 419، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی
مبصر: ڈاکٹر منور حسن کمال،
بیت الراضیہ، G05/A، ابوالفضل انکلیو، نئی دہلی 25

فاضل قلم کار ڈاکٹر افضل مصباحی کی کتاب 'آزادی کے بعد اردو صحافت' جہاں بزرگ صحافیوں کے حالاتِ زندگی اور ان کے کارناموں پر روشنی ڈالتی ہے، وہیں نو واردانِ صحافت کے لیے بھی چندرہ نما اصول پیش کرتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر افضل مصباحی اردو صحافت کی ان پر پیچ راہ داریوں سے گزرتے ہیں، جنھیں عبور کرنا ہر صحافی کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے اپنی صحافت کے دورِ آغاز سے ایک کامیاب صحافی بننے تک اردو صحافت کے ساتھ ساتھ اپنی محنت سے اپنے ذہن و دماغ کو جلا بخشی ہے، بلاشبہ اس کے لیے انھیں مبارکبادیاں پیش کی جانی چاہئیں۔ پروفیسر وہاب اشرفی کے الفاظ میں آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو صحافت کی جو صورت حال رہی ہے انھوں نے اس کا گہرائی سے مطالعہ کرنا چاہا۔ بظاہر یہ کام آسان نہ تھا۔ اس کی کئی شقیں تھیں، جن پر انھیں نظر ڈالنی تھی۔ کہا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر افضل مصباحی نے اپنی سی ممکنہ کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے آزادی کے بعد اردو صحافت کی شکل میں پیش کر دی ہے، اس کو ابتدائی شکل بھی کہا جاسکتا ہے اس لیے کہ کوئی بھی کوشش جلد مکمل کامیاب نہیں ہوتی، اس میں بہتری کے لیے کوششیں کرنا پڑتی ہیں۔ اگر بعض ناقدانِ صحافت اس میں کمیاں پائیں گے تو ان کی رہ نمائی میں ڈاکٹر افضل مصباحی اس کتب کو مزید بہتر بنا کر پیش کریں گے۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب کو چار حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ صحافت کی مختصر تاریخ میں روزِ اول سے پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا تک کی صورتِ حال پر گفتگو کی گئی ہے۔ جس میں روزنامہ، سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ اور ڈائجسٹ کا خصوصیت سے تذکرہ کیا گیا ہے۔ اردو صحافت کی روایت میں 1822 سے 2000 تک کی تاریخ زیر بحث لائی گئی ہے، جس سے یقیناً نو واردانِ صحافت فیضیاب ہوسکتے ہیں۔

دوسرے باب میں 1857 کی جنگ آزادی سے لے کر آزادیٔ ہند 1947 تک کے سفر میں اردو صحافت کے کلیدی کردار کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس باب میں ان ادوار کے مقبول عام اخبارات کی تاریخ اور ان کی آزادیٔ ہند کے لیے خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ تیسرے باب میں جن اردو صحافیوں نے آزادیٔ ہند کے لیے قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں، ان کی خدمات کا مختصر ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں آزادیٔ ہند کے بعد شائع ہونے والے معروف اردو اخبارات کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس سلسلے کو ریاستوں کے اعتبار سے آگے بڑھایا گیا ہے۔ اس باب میں اتر پردیش کے بہت سے اخبارات جن کا تذکرہ دوسرے ابواب میں گرچہ ضمناً آگیا ہے، لیکن اس مقام پر صرف قومی آواز اور عزائم کے نام نظر آتے ہیں۔ راشٹریہ سہارا کے اجرا کی تاریخ میں بھی مصنف کو تسامح ہوا ہے۔ لکھنؤ سے 5 فروری 1999 اور دہلی/نوئیڈا سے 2 جون 1999 کو راشٹریہ سہارا منظر عام پر آیا ہے۔ اس کتاب کے صفحات پر اردو کی ادبی صحافت کی کمی نظر آتی ہے، جب کہ ادبی صحافت ایک الگ باب کی متقاضی تھی۔ البتہ خال خال اس کا تذکرہ موجود ہے۔

بہرحال ڈاکٹر افضل مصباحی نے اس کتاب کی تیاری میں جو محنت کی ہے، وہ اس کے صفحات پر عیاں ہے، کوئی بھی کام تکمیل کے مراحل تک آتے آتے بہت سے نشیب و فراز سے گزرتا ہے، ان نشیب و فراز سے کامیابی کے ساتھ گزرنا ہی مصنف کی محنت شاقہ کی عکاس ہوتا ہے۔ کتاب کی ترتیب سے یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ ڈاکٹر افضل مصباحی نے محض اپنی محنت، لگن اور جانفشانی سے ایک ایسی کتاب پیش کردی ہے، جو نو واردانِ صحافت کی بہت سی ضرورتوں کو پورا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ یوں تو کوئی بھی کام آخری نہیں ہوتا، لیکن جو لوگ نشانِ منزل بنائے جاتے ہیں وہ اس کام کے جاری رہنے تک لائق مبارک باد ہوتے ہیں۔ اردو صحافت کی تاریخ کی گزشتہ برسوں میں کئی کتابیں منظر عام پر آئیں، لیکن یا تو ان لوگوں کے صحافت سے وابستہ نہ ہونے کے باعث یا وسائل کی کمی کے باعث اپنے نقوش چھوڑنے میں ناکام رہیں۔ البتہ ڈاکٹر افضل مصباحی چوں کہ اپنی ملازمت کے آغاز سے ہی صحافت سے وابستہ رہے اور اللہ کے فضل سے انھیں وسائل بھی فراہم تھے، اس لیے آزادی کے بعد اردو صحافت، کے نقوش تادیر قائم رہیں گے اور اس سلسلے کو آگے بڑھانے والوں کے لیے یہ کتاب یقیناً مشعلِ راہ ثابت ہوگی۔

آگ اور پانی

مرتب و ناشر: ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی
صفحات: 336، قیمت :300 روپے
ناشر: مصنف
مبصر: ڈاکٹر وسیم اقبال، مکان نمبر 1210 گلی محل سرائے
پنجابی پھاٹک، بلی ماران، دہلی 6

کتاب کے ابتدائی صفحات میں مرتب نے بتایا ہے کہ وہ علم کیمیا میں ایم ایس سی، پی ایچ ڈی ہیں اور مرکزی حکومت کے تحت قائم ایک تحقیقاتی ادارے میں پچیس (25) سال تک ریسرچ سائنسداں کی ذمے داریاں نبھانے کے بعد ملازمت سے سبکدوش ہوکر اردو زبان و ادب کی خدمت میں منہمک ہیں۔ تبصرہ نگار گزشتہ چند برسوں میں صحت اور سائنس کے علاوہ مختلف موضوعات پر 'اردو دنیا' اور دیگر اردو جرائد میں ان کے پر مغز مضامین پڑھتا رہا ہے۔ نئی نسل میں اردو زبان کے فروغ کے لیے گزشتہ سال انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے مالی تعاون سے ایک منفرد انداز کی کتاب 'ادبی معلوماتی پہیلیاں' شائع کی تھی۔ زیر تبصرہ کتاب بھی ان کے تحقیقاتی ذہن کی اپج ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے کئی سو قدیم و جدید غزل گو شعرا کے کلام سے ان اشعار کو منتخب کرکے پیش کیا ہے جن میں متضاد الفاظ ساتھ ساتھ استعمال کیے گئے ہیں۔ مثلاً آبادی اور ویرانہ، آگ اور پانی، اجالا اور اندھیرا، دوست اور دشمن، سچ اور جھوٹ وغیرہ۔ کتاب کی ایک ایک بات مرتب کے تحقیقی ذہن اور سلیقہ شعاری کی گواہی دیتی ہے۔ سہ رنگی خوشنما سرورق پر آگ کے شعلوں کے اوپر ایک جھرنے کی موٹی دھار گرتی ہوئی دکھائی گئی ہے۔ جس مقام پر پانی گر رہا ہے وہاں شعلوں کی اونچائی بقیہ حصّوں کی نسبت کم دکھائی گئی ہے۔ کتاب کے ہر شعر کے ساتھ تخلیق کار شاعر کا تخلص، نام و مقام درج کیا گیا ہے۔ تمام اشعار کو حروفِ تہجی کے اعتبار سے رکھا گیا ہے۔ اس مجموعے کا انتساب بھی اپنے اندر ایک ندرت اور جاذبیت لیے ہوئے ہے۔

کتاب میں متضاد الفاظ کے چھیانوے جوڑوں (عنوانات) کے تحت کُل دو ہزار چھ سو بتیس (2632) اشعار درج کیے گئے ہیں۔ ہر عنوان میں کم از کم سولہ اشعار شامل ہیں اور زائد سے زائد بہتر (72) اشعار ہیں۔ تمام اشعار معیاری بھی ہیں اور دلنشیں بھی۔ اشعار کا انتخاب مرتب کی ادب فہمی اور اعلیٰ ذوق کو ظاہر کرتا ہے۔ بطور نمونہ خاموشی: کلام اور روٹھنا: منانا عنوانات کے تحت درج تین تین اشعار یہاں نقل کیے جارہے ہیں۔

خاموشی: کلام

بولوں تو زباں کٹنے کے اسباب مہیا   اور ظلم پہ خاموش رہا بھی نہیں جاتا
(انجم عرفانی)

خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو   سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
(اقبال)

کوئی آہٹ، کوئی آواز، کوئی چاپ نہیں   دل کی گلیاں بڑی سُنسان ہیں، آئے کوئی
(پروین شاکر)

روٹھنا: منانا

اگر روٹھ جاؤں تو مشکل ہے یہ   نہیں چین دیتے، مناتے ہیں آپ
(الٰہی بخش معروف)

چھیڑ کیسی، بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض   اک حسیں ہر وقت ہو، ان کو منانے کے لیے
(ریاض)

وسیم روٹھ گئے ہیں وہ تو روٹھ جانے دو   ذرا سی بات ہے بڑھ جائیگی منانے سے
(وسیم بریلوی)

الغرض 'آگ اور پانی' کو مرتب کر کے ڈاکٹر شمیم احمد نے ایک طرف تو اردو ادب کے تئیں قابلِ قدر کارنامہ انجام دیا ہے اور دوسری طرف یہ بھی تاثر دیا ہے کہ فروغِ اردو کا کوئی کام کرنے میں سائنسداں بھی ادبا اور شعرا سے پیچھے نہیں۔ امید ہے کہ اہلِ ذوق اس کاوش کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

پیروڈی کا فن

مصنف: امتیاز وحید

صفحات: 380، قیمت: 380

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی 95

مبصر: فیروز عالم، شعبۂ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

پیروڈی کا شمار اردو کی جدید اصناف میں ہوتا ہے۔ اسے بیسویں صدی میں خاطرخواہ فروغ حاصل ہوا۔ اردو میں شعری اور نثری دونوں قسم کی پیروڈیوں کا ذخیرہ موجود ہے۔ رضا نقوی واہی، شہباز امروہوی، جمیل مظہری، دلاور فگار، راجا مہدی علی خاں، فرقت کاکوروی، اسرار جامعی، صادق مولیٰ، مخمور جالندھری وغیرہ نے منظوم اور پطرس بخاری، کنھیا لال کپور، ملا رموزی، احمد جمال پاشا، شفیق الرحمٰن، ابن انشا، انور سدید، شفیع شیخ وغیرہ نے نثری پیروڈی کے فن میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

پیروڈی کے فن اور روایت پر مختلف کتابوں اور رسائل میں مضامین تو مل جاتے ہیں لیکن ایک ایسی کتاب کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی جس میں اس کا بھرپور جائزہ لیا جاسکے۔ ڈاکٹر امتیاز وحید قابلِ مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے لیے اس موضوع کا انتخاب کیا اور ریسرچ اسکالروں کی عام روش (جس میں زیادہ تر اسکالر دستیاب کتابوں، مضامین یا تحقیقی مقالوں کا چربہ اتارنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ تحقیق وجستجو سے ان کو دور کا بھی واسطہ نہیں) کے برخلاف تحقیق کا حق ادا کیا ہے۔ انھوں نے نہایت محنت اور ایمانداری سے مواد جمع کیا ہے، ان کا مطالعہ کیا اور پھر اپنی رائے قائم کی ہے۔ یہ تحقیقی مقالہ اب کتابی صورت میں شائع ہوا ہے۔ پوری کتاب چار مستقل ابواب اور ایک ضمیمہ پر مشتمل ہے۔

پہلے باب میں مصنف نے پیروڈی کی مختلف تعریفوں اور اس کے فنی لوازمات سے بحث کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے بتایا ہے کہ پیروڈی یونانی لفظ پیروڈیا سے مشتق ہے جس کا مطلب ہے جوابی نغمہ۔ یعنی وہ نظم جو کسی نغمے کے جواب میں مخالف جماعت کی طرف سے گایا جاتا ہے۔ اس میں اس نغمے کے اسلوب اور آہنگ کی نقالی ہوتی ہے۔ اردو میں پیروڈی کے لیے تحریف نگاری، تقلید معکوس، مضحک، نقالی، ہجو یہ تقلید اور تضحیک وغیرہ الفاظ کا استعمال ہوا ہے۔ ان تمام الفاظ پر فرداً فرداً گفتگو کرنے کے بعد مصنف نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ پیروڈی کا مکمل مفہوم ان میں سے کسی لفظ سے ادا نہیں ہوتا اس لیے لفظ پیروڈی کا ہی استعمال موزوں ہے جو رائج بھی ہے۔

امتیاز وحید نے پیروڈی کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول لفظی پیروڈی، دوم معنوی پیروڈی۔ لفظی پیروڈی میں لفظوں کے الٹ پھیر کے ذریعے فن پارے کو مزاحیہ بنا دیا جاتا ہے۔ ایسی پیروڈی کا مقصد عام طور سے تفریح ہوتا ہے۔ معنوی پیروڈی میں الفاظ کے پھیر بدل کے ساتھ ساتھ اصل تخلیق کی معنویت پر بھی توجہ دی جاتی ہے۔

مصنف کے لفظوں میں:

باب 'پیروڈی کی روایت' میں امتیاز وحید نے تحقیق کے ذریعے جعفر زٹلی کو اردو کا پہلا پیروڈی نگار قرار دیا ہے۔ اگر چہ اس کے سامنے اس فن کا نہ کوئی تصور تھا اور نہ نمونہ۔ فرخ سیر جب بادشاہ بنا اور اس کے نام کا سکہ ڈھالا گیا تو اس پر یہ شعر لکھا گیا:

سکہ زد از فضلِ حق بر سیم و زر   بادشاہ بحر و برفرخ سیر

جعفر زٹلی جو اس عہد کے حالات پر گہری نظر رکھتا تھا اور بادشاہ کی حقیقت سے واقف تھا کہ وہ کتنا کمزور ہے۔ اس نے اس پر یہ شعر کہا:

سکہ زد بر گندم و موٹھ و مٹر   بادشاہ تسمہ کُش فرخ سیر

طویل عرصے بعد لکھنؤ میں جب انشا اور مصحفی کا معرکہ شروع ہوا تو ایک دوسرے کی زمینوں میں ان کے کلام کی خامیاں اور کمیاں نکالی جانے لگیں۔ اس قبیل کے اشعار میں بھی پیروڈی کے نقوش نمایاں ہیں۔ اودھ پنچ نے بھی پیروڈی کو رواج دینے میں کچھ حد تک معاونت کی لیکن اسے اعتبار عطا کرنے میں اکبر الہ آبادی، تربھون ناتھ ہجر اور رتن ناتھ سرشار نے اہم کردار ادا کیا۔ آزادی کے بعد اس صنف کو مقبولیت اور استحکام حاصل ہوا۔

باب سوم میں نمائندہ پیروڈی نگاروں کا مختصر تعارف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے فن کا تفصیلی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے اصل تخلیق اور اس کی پیروڈی کے موازنے کے ذریعے اس کی قدر و قیمت کا تعین کیا ہے۔

چوتھے باب میں اردو کی اہم شعری اور نثری پیروڈیوں کا تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان میں فیض کی نظم 'چند روز مری جان' پر جوش کی پیروڈی حالی کی مناجات بیوہ پہ جمیل مظہری کی پیروڈی 'شہر آشوب صحافت'؛ اقبال کی نظم 'مومن' کی اسی عنوان سے شوکت تھانوی کی پیروڈی اقبال کی نظم لا الہ الا اللہ پر سید محمد جعفری کی پیروڈی، فیض کی نظم 'تنہائی' کی پیروڈی بعنوان 'لگائی' از کنھیا لال کپور، اقبال کی نظم 'شکوہ' کی پیروڈی بعنوان 'ٹیچرس کا شکوہ' از دلاور نگار اور 'جواب شکوہ' کی پیروڈی بعنوان جواب شکوہ تنخواہ از شہباز امروہوی کے علاوہ سات دیگر پیروڈیوں کا فنی تجزیہ کیا گیا ہے۔ نثری پیروڈیوں میں ملا رموزی کی گلابی اردو، کنھیا لال کپور کی گبار کھاتر، فرقت کاکوروی کی 'غالب کے خطوط' احمد جمال پاشا کی 'تبصرہ نگاری' انور سدید کی 'غالب کے نئے خطوط' ابن انشا کی 'اردو کی آخری کتاب' شفیع شیخ کی 'غالب تحقیق جدید کے آئینے میں' اور ظفر کمالی کی 'فلیپ نگاری' وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

ضمیمہ کے تحت چوتھے باب میں زیر بحث تمام شعری پیروڈیوں کا متن دے دیا گیا ہے۔ اچھا ہوتا اگر نثری پیروڈیاں بھی اس میں شامل کر لی جاتیں۔

ڈاکٹر امتیاز وحید نے اس مطالعے میں غیر جانب داری، معروضیت اور حق گوئی سے کام لیا ہے اور خوبیوں کے ساتھ خامیوں کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ان کا اسلوب تنقید کے عین مناسب ہے اور دوٹوک انداز میں اپنی بات وضاحت اور قطعیت سے کہنا انھیں خوب آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پوری کتاب میں کہیں الجھاؤ یا پیچیدگی نہیں ہے۔ مواد کی پیش کش میں تو مصنف نے موضوع پہ اپنی گرفت اور سلیقہ مندی کا ثبوت دیا ہی ہے، پروف خوانی بھی توجہ

سے کی ہے۔ پوری کتاب میں شاید ہی کہیں پروف کی کوئی غلطی ملے۔ امید ہے کہ پیروڈی سے شغف رکھنے والوں کے ساتھ ساتھ ادب کے دیگر قارئین کو بھی یہ کتاب پسند آئے گی۔

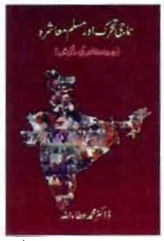

سماجی تحرک اور مسلم معاشرہ

(جدید اردو ناولوں کی روشنی میں)

مصنف و ناشر: ڈاکٹر محمد عطاء اللہ

صفحات: 254، قیمت: 250 روپے

مبصر: محمد مقیم، ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ڈاکٹر محمد عطاء اللہ کی زیر تبصرہ کتاب غالباً ان کی پہلی تصنیف ہے۔ یہ کتاب دہلی اردو اکادمی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔ ظاہر ہے موضوع سنجیدہ اور تبحر علمی کا تقاضا کرتا ہے۔ ڈاکٹر محمد عطاء اللہ نے اس موضوع کو نبھانے کی کوشش کی ہے جو کہ بڑی ہمت کا کام ہے۔ 'تحرک' کے معنی حرکت پذیری اور مراد تبدیلی سے ہے۔ یہ لفظ دراصل Mobility کا ترجمہ ہے۔ ہر قسم کی تبدیلی کا تعلق تحرک سے نہیں ہوتا یعنی تحرک وہ تبدیلی ہے جس کے ساتھ حرکت پذیری مشروط ہے۔ 'سماجی تحرک' سے مصنف کی کیا مراد ہے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس سے مراد کسی شخص یا گروہ کا ایک سماجی حیثیت سے دوسری سماجی حیثیت میں منتقل ہونا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سماجی تحرک کسی شخص یا گروہ کی سماجی حیثیت میں تبدیلی کو ظاہر کرتی ہے۔'' (ص 7)

ڈاکٹر محمد عطاء اللہ نے مسلم معاشرے میں ہونے والے سماجی تحرک کو اردو ناولوں میں نشان زد کیا ہے۔ موضوع کو برتنے کے لیے پانچ ابواب قائم کیے گئے ہیں جن کی خانہ بندی حسب ذیل ہے:

(1) سماجی تحرک (2) مسلم معاشرے کی ساخت اور نوعیت (3) اردو ناولوں میں سماجی تحرک اور جدید تصورات (4) مسلم معاشرہ میں منفی تحرک (نمائندہ اردو ناولوں کے حوالے سے (5) مسلم معاشرے میں مثبت تحرک (نمائندہ اردو ناولوں ...)۔ دوسرا باب تین ذیلی عناوین میں منقسم ہے۔ اس کے علاوہ ہر باب میں دو ذیلی عنوانات شامل ہیں۔ کتاب میں سماجی تحرک کے معنی و مفہوم اور اس کے تصوراتی نظام سے بھی بحث کی گئی ہے۔ موضوع کی پیچیدگی نے بہت سی باتوں کو تشنہ رہنے دیا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاکٹر عطاء اللہ لکھتے ہیں ''ذات پات پر مبنی سماجوں کی بہ نسبت نسل پر مبنی سماج میں سماجی تحرک کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔'' (ص: 23) نسل پر مبنی سماج میں سماجی تحرک کے امکانات کیوں اور کس طرح زیادہ ہوتے ہیں اس پر گفتگو ضروری تھی جو کہ مفقود ہے۔ ذات پات پر مبنی سماج چوں کہ سکہ بند ہوتے ہیں اور ہر ذات کی اپنی حدود ہوتی ہیں جن سے باہر نکلنا مشکل ہوتا ہے۔ اس قسم کی معاشرتی درجہ بندی کے لیے ہمارا قدیم برہمنی نظام جس کو 'ورن نظام' کہا جاتا ہے بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ نسل پر مبنی سماج کے بجائے قومیت یا ملت پر مبنی سماج کا لفظ زیادہ موزوں رہے گا کہ پیشوں پر مبنی 'ورن نظام' سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ یہ تقسیم اس وقت بڑی حد تک بے معنی ہو جاتی ہے جب ہم یہ کہتے ہیں کہ ''سماجی تحرک جدید صنعتی اور شہری معاشرے کی خاصیت ہے۔'' (ص: 24) کیوں کہ جدید صنعتی معاشرے نے قدیم روایتی ڈھانچوں میں جو توڑ پھوڑ کی ہے اسی سے اس سماجی تحرک نے جنم لیا ہے جو مقصود ہے۔ یہ بات کتاب کے اندراجات سے بھی ظاہر ہوتی ہے مثلاً: ''ایک شخص انتخاب جیت کر وزیر کا عہدہ حاصل کر لیتا ہے، ایک طالب علم اپنی تعلیم مکمل کر کے افسر بن جاتا ہے، ایک مزدور مالدار بن جاتا ہے۔ یہ تمام صورت حال سماجی تحرک کو ظاہر کرتی ہیں۔'' (ص: 23)

ظاہر ہے سنجیدہ اور پیچیدہ موضوعات میں اس قسم کی الجھنوں کا در آنا فطری امر ہے۔ مثلاً ایک جگہ کانگریس کے بارے میں لکھا ہے:

''شروع میں تو یہ ایک اصلاحی تنظیم تھی مگر بعد میں ...'' (ص: 156) بات بالکل صحیح ہے لیکن کس قسم کی اصلاحی تنظیم تھی اس کی وضاحت ضروری تھی۔ کیوں کہ اصلاحی تنظیم سے عموماً سماجی اور مذہبی اصلاحی تحریکیں سمجھی جاتی ہیں۔ ایک جگہ تقسیم ہند پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''جو لوگ یہ سوچتے تھے کہ تقسیم کے بعد مسلمانوں کا مسئلہ حل ہو جائے گا ایسا نہیں ہوا اور مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی ہندوستان میں ہی رہی۔'' (ص: 158) ظاہر ہے تقسیم کے حامیوں کا یہ منشا ہرگز نہیں تھا کہ ہندوستان کے سارے مسلمان ہجرت کر جائیں اور نہ ہی مسلمانوں کی بقیہ بڑی آبادی کے ہجرت کر جانے سے مسئلہ حل ہو جاتا۔ اس قسم کے جملے انتہائی عمومی بلکہ اتنے پامال ہیں کہ ان پر سنی سنائی باتوں کا گمان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

''جاگیرداری نظام کا یوں تو قریب قریب خاتمہ کر دیا گیا تھا لیکن اسی کو دوسری شکل یعنی زمینداری نظام کی صورت میں قائم رکھا گیا۔'' (ص: 159) یہاں احتیاط اور تحقیق کی ضرورت تھی۔ جملے سے ظاہر ہوتا ہے کہ جاگیرداری نظام ہمارے معاشرے میں پہلے سے قائم تھا اور انگریزوں نے اس کی جگہ زمینداری نظام کو رائج کیا۔ حالاں کہ سلطنت عہد میں لفظ اقطاع داری اور مغلیہ عہد میں منصب داری کا رواج تھا۔ اقطاع داری، منصب داری اور زمینداری نظام کسی نہ کسی طور ایک دوسرے سے مختلف تھے نہ کہ ہم معنی۔ اس کے باوجود قابل ستائش بات یہ ہے کہ مصنف سماجی تحرک اور اس کے تصوراتی نظام کی تفہیم و ترسیل میں کامیاب ہیں۔

علاوہ ازیں پوری کتاب میں دو باتیں ایسی ہیں جن سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ یعنی گنجلک اور غلط جملوں کے ساتھ ساتھ پروف کی غلطیوں کی کثرت بیزار کن ہے۔ کتاب میں مختلف مقامات پر مبہم جملوں کے استعمال سے موضوع کو گنجلک بنا دیا گیا ہے۔ چند غلطیوں سے پر جملوں کو دیکھیں:

''بہتوں کو اپنے تنخواہ کے علاوہ اپنے حصے کی دیہی املاک سے بھی ضمنی آمدنی ہوتی تھی اس لیے زمینداری کی خاتمے کی زد لاکھوں مسلمانوں پر پڑتی تھی ... اس میں خاتمائے زمینداری ...'' (ص: 164)

''... ان کی زمینیں سرکار کی ہاتھوں میں آگئی تھیں۔'' (ص 165)

''ایسی ہی حالات کے شکار ناول 'ذبح' کا چودھری خاندان ہے۔'' (ص 169)

''زندگی گزارنے کے لیے گھر کا اشیا بیچتے رہے۔'' (ص 170)

''مہدی گھر کی جھاڑی سے نکلے گی۔'' (ص 171)

''ناولوں میں بہت سی ایسی مثالیں دیکھنے کو ملتا ہے ... زمینداری شان ان کے اندر برقرار تھا ... اگر کوئی مالی مدد کرنا چاہتا تھا تو والدہ اس کو ناگوار مانتی تھیں۔ لیکن گاؤں والوں کو ان کا فاقہ دیکھا بھی نہیں جاتا تھا۔ ... انھوں نے مجھے اور میرے بڑے بھائی کو اردو پڑھنے کے لیے ان کے پاس بھیجنے لگے ... ہم لوگوں کو تعلیم بھی مل جاتا تھا۔'' (ص 172)

''... احساس عدم اور تحفظ نے ... ان کی سماجی و معاشی مسائل پر کسی نے توجہ نہیں دی۔'' (ص 173)

میں اس فہرست کو اور زیادہ طول نہیں دینا چاہتا۔ آئندہ طباعت میں اس قسم کی متواتر غلطیوں کو درست کر لیا جائے تو یہ کتاب علم و ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہوگی۔ ◘

مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن

(وزارت برائے اقلیتی امور، حکومت ہند)

Chelmsford Road, New Delhi - 110 055

Phone : 23583788, 23583789, Fax : 011-23561945, Website : www.maef.nic.in, e-mail : webmaster.maef@nic.in

نوٹس (برائے گرانٹ-ان-ایڈ 2013-14)

۱. مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن غیر سرکاری تنظیموں (NGO) کو ایسے اسکول/ ہاسٹل/ آئی ٹی آئی/ وی ٹی سی کی عمارتوں کی تعمیر کے لئے گرانٹ (مالی امداد) فراہم کرتا ہے جہاں اقلیتوں سے تعلق رکھنے والے طلبہ/طالبات کی تعداد 50 فیصد سے زائد ہو۔

۲. نیا درخواست فارم، ریاست کا مخصوص کوٹہ اور تفصیلی شرائط فاؤنڈیشن کی ویب سائٹ www.maef.nic.in سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ درخواست فارم ویب سائٹ سے مفت حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ درخواست فارم فاؤنڈیشن یا صوبائی سرکار کے آفس سے بھی مفت حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ درخواست فارم کی فوٹو کاپی بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔

۳. مکمل درخواست فارم مطلوبہ کاغذات کے ساتھ بذریعہ پوسٹ/ کوریئر/ بدست خود سکریٹری، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن، چیمسفورڈ روڈ، نئی دہلی-110055 کے دفتر میں جمع کیا جاسکتا ہے۔ یہ درخواست **30 ستمبر 2013** تک دفتر میں وصول ہونا ضروری ہے۔ تاخیر سے وصول ہونے والے فارم آئندہ سال (یعنی اپریل 2014-15) میں وصول مانے جائیں گے۔

۴. NGO کا رجسٹریشن کم از کم تین سال پرانا ہونا چاہئے۔ اسکول/ ادارہ متعلقہ صوبائی/ مرکزی سرکاری یا بورڈ/ محکمہ سے منظور شدہ ہونا چاہئے اور تعمیرات کے لئے استعمال ہونے والی زمین سوسائٹی/ اسکول کے نام رجسٹرڈ ہونی چاہئے یا لیز ڈیڈ کم از کم تیس (30) سال کی مدت کے لئے ہونی چاہئے۔

۵. درخواست فارم کے ساتھ صوبائی حکومت یا کسی محکمہ کی سفارش کی ضرورت نہیں ہے۔

۶. درخواست فارم یا کسی اور سروس کی کوئی فیس نہیں ہے اور نہ ہی کسی کو کوئی فیس دینے کی ضرورت ہے۔

۷. مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن کی پورے ہندوستان میں کوئی برانچ/ ایجنسی یا علاقائی آفس نہیں ہے۔

۸. NGOs کو مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن سے آن لائن/ آف لائن رجسٹرڈ ہونا لازمی ہے۔ رجسٹریشن کے لئے فارم 'مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن' کے ویب سائٹ پر بھی دستیاب ہے۔

سکریٹری، مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن

نوٹ: مالی امداد کی خواہشمند سوسائٹی/ ٹرسٹ کا سوسائٹی رجسٹریشن ایکٹ یا انڈین ٹرسٹ ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہونا لازمی ہے۔ تین سال سے کم مدت کے رجسٹریشن یا کسی دوسرے ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ سوسائٹی/ ٹرسٹ 'گرانٹ اِن ایڈ' کے لیے اہل نہیں ہوں گے۔ سوسائٹی/ ٹرسٹ کم از کم تین سال پرانی ہو۔ ● این جی او/ ادارہ کو ریاستی حکومت کے متعلقہ اتھارٹی یا NCME (قومی کمیشن برائے اقلیتی ادارہ) سے اقلیتی کردار کا سرٹیفکیٹ حاصل ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ ادارہ میں تعلیمی طور پر پسماندہ اقلیتوں کے طلبہ/ طالبات کی تعداد 50 فیصد سے زائد ہونا چاہئے۔ ● 'مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن' سے مالی امداد کے خواہشمند این جی اوز کو فاؤنڈیشن سے رجسٹریشن نمبر حاصل کرنا ضروری ہے۔ رجسٹریشن فارم فاؤنڈیشن کے ویب سائٹ www.maef.nic.in پر دستیاب ہے۔ این جی اوز مقررہ فارم بھر کر فاؤنڈیشن کے دفتر میں جمع کر سکتے ہیں یا آن لائن رجسٹریشن کی صورت میں دستاویزات کی ہارڈ کاپی جمع کرنی ہوگی۔ ● اگر کوئی دستاویز مقامی زبان میں ہو تو اس کا نوٹرائزڈ انگریزی/ ہندی ترجمے کی کاپی جمع کرنی ہوگی۔ اس کے علاوہ پروجیکٹ کے ساتھ منسلک سبھی دستاویزات این جی او کے مستحق ذمہ دار کے ذریعہ تصدیق شدہ ہونا چاہئے۔ ● مولانا آزاد ایجوکیشن فاؤنڈیشن اپنے مقررہ امدادی حدود کے تحت ہی گرانٹ اِن ایڈ فراہم کرتا ہے اور بہ یک وقت امداد کی حد 30 لاکھ روپے مقرر ہے۔ ● این جی اوز کی کارگزاریوں کا ذکر آڈٹ رپورٹ میں واضح طور پر ہونا چاہئیں۔ بیلنس شیٹ میں این جی اوز کے ماتحت اثاثوں (اراضی/عمارت) کی جانکاری دینا بھی لازمی ہے۔ ● این جی اوز کی مینجنگ کمیٹی میں ایک ہی خاندان سے تعلق رکھنے والے افراد کی تعداد 25 تا 30 فیصد سے زیادہ نہیں ہونی چاہئے۔ ● ادارہ (اسکول، کالج یا ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹس) کو، جس کی تعمیر/ توسیع کے لئے امداد مطلوب ہے، متعلقہ ریاست/ مرکزی بورڈ/ کونسل/ یونیورسٹی سے تسلیم شدہ/ ملحق ہونا چاہئے۔ این آئی او ایس، اوپن یونیورسٹی، این سی پی یو ایل کے ذریعہ چلائے جارہے تعلیمی مراکز فاؤنڈیشن سے مالی امداد حاصل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ اسی طرح مدرسہ بورڈ سے تسلیم شدہ ادارے بھی فاؤنڈیشن کی اسکیم سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ ● اگر پروجیکٹ دیہی علاقے سے متعلق ہے تو این جی اوز کو کم از کم نصف ایکڑ اراضی یا شہری/ نیم شہری علاقوں سے تعلق رکھنے والے پروجیکٹ کے لئے این جی اوز کو کم از کم 500 اسکوائر یارڈ اراضی سے متعلق رجسٹرڈ سیل ڈیڈ/ گفٹ ڈیڈ/ ایکسچینج ڈیڈ یا الاٹمنٹ آرڈر پیش کرنا ہوگا۔ اگر زمین لیز پر ہے تو لیز ڈیڈ 30 سال سے کم نہیں ہونی چاہئے اور لیز ڈیڈ رجسٹرڈ ہونا لازمی ہے۔ زمین کا ادارے/ این جی او کے نام ہونا ضروری ہے۔ اگر اراضی صدر، سکریٹری، منیجر یا کسی دیگر آفس ممبر کے نام پر ہو یا اراضی این جی او/ ادارہ کے نام منتقل نہ ہو تو پروجیکٹ منظور نہیں کیا جائے گا۔ دستیاب/ مجوزہ اراضی کی پیمائش ایکڑ یا اسکوائر یارڈ میں پیش کرنی ہوگی۔ ● مجوزہ عمارت کا سائٹ پلان باضابطہ منظور شدہ ہونا چاہئے۔ شہری/ نیم شہری علاقوں کے پروجیکٹ کے لئے سائٹ پلان کی منظوری سے متعلق Work Commencement Order/Letter کی تصدیق شدہ کاپی منسلک کرنا لازمی ہے۔

یونیورسٹیوں کی اردو سرگرمیاں

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں لینگویج لیب کا افتتاح

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے ایڈوانس اسٹڈی سینٹر کے زیر اہتمام لنگویج لیب کا افتتاح کرتے ہوئے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ نے کہا کہ ہم سب کی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ کسی طرح اردو کو بھی روٹی اور روزی سے جوڑا جائے۔ انھوں نے کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر کا عہدہ قبول کرنے کے بعد سے انھوں نے اردو اخبارات پڑھنے شروع کیے جب کہ ان کے دل میں ہمیشہ سے اردو زبان سے خاص لگاؤ رہا ہے۔ انھوں نے طالب علموں سے اپیل کی کہ وہ اردو زبان کی ترویج وترقی کے لیے اردو اخبار پڑھیں اور خط و کتابت بھی اردو میں کریں۔ پروفیسر محمد زاہد نے کہا کہ دورِ حاضر میں ترسیل وابلاغ نے بہت ترقی کی ہے اور پوری دنیا ایک عالمی گاؤں میں تبدیل ہوگئی ہے۔ لینگویج لیب طلبا کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ افتتاحیہ جلسہ کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے آرٹس فیکلٹی کے سابق ڈین پروفیسر قاضی افضال حسین نے کہا کہ لینگویج لیب کا افتتاح ایک اہم واقعہ ہے اور جن کی مادری زبان اردو ہے ان کو بھی اس لیب سے بہت فائدہ ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ روس کے ایک شاعر کو جب نوبل انعام ملا تو اس نے کہا تھا کہ اچھا ایڈمنسٹریٹر وہی ہے جو ادب میں دلچسپی رکھتا ہو۔ انھوں نے کہا کہ ادب کو پڑھنے والا تہذیب اور انسانیت کے معنی سمجھتا ہے۔ آرٹس فیکلٹی کے ڈین پروفیسر سہیل احسن نے کہا کہ موجودہ وائس چانسلر نے اردو کی بقا کے لیے جو فیصلہ کیا ہے اس کے لیے ہم لوگ ذاتی طور پر ان کے ممنون ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر طارق چھتاری اور ڈاکٹر اقبال صدیقی کی کوششوں سے یہ لیب وجود میں آئی ہے تاکہ اردو کے طالب علموں کو روزگار کے بہتر مواقع فراہم ہوسکیں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 31 اگست 2013

اے ایم یو میں مسلم تہذیب پر نمائش

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ویمنس کالج کے زیر اہتمام بین الاقوامی سائنسی اور ثقافتی وراثت سے عبارت ممتاز اور انعام یافتہ تخلیق '1001 ایجادات' سے مستعار سائنس کے سنہری زمانے اور مسلم تہذیب کی نمایاں کامیابیوں پر مشتمل نمائش کا انعقاد کیا گیا جس کا افتتاح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) ضمیرالدین شاہ نے کیا۔ اپنے افتتاحی خطبے میں وائس چانسلر جنرل شاہ نے نمائش کو سراہتے ہوئے کہا کہ مسلم سائنسدانوں کا جدید سائنس میں اہم تعاون رہا ہے اور جدید دنیا کی تعمیر میں ان کی اہم ترین خدمات قابلِ تعریف ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اس ادارہ کے بانی سر سید احمد خاں نے شروع سے ہی تعلیمِ نسواں پر خصوصی توجہ مرکوز کی اور یہی ان کی بھی ترجیحات میں شامل ہے۔ کیوں کہ طالبات اس ادارہ کا سرمایۂ افتخار ہیں۔ ویمنس کالج کی پرنسپل پروفیسر بلقیس نسیم وارث نے مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اس نمائش کا مقصد ساتویں صدی کے بعد تقریباً ہزار سالہ عہد پر مبنی سائنسی وثقافتی

اردو تہذیب پر فخر کا اظہار

علی گڑھ: اکیڈمک اسٹاف کالج کے زیر اہتمام اردو اکادمی مسلم یونیورسٹی میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر اور مہمانِ خصوصی خواجہ اکرام الدین نے کہا کہ اردو زبان جو ایک زمانہ میں صرف شاعری سے عبارت تھی آج ہمارے مسائل کی ترجمانی کر رہی ہے، اردو پوری دنیا میں چوتھے نمبر کی زبان تسلیم کی جاچکی ہے، جو متعدد سروے رپورٹ کا

ثمرہ ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کے زندہ رہنے کی یا اس کی ترقی اس سے ظاہر ہوتی ہے وہ کتنی بولی اور سمجھی جارہی ہے آج سیاست سے لے کر سماج کے عام طبقہ تک اردو کا چلن عام ہوتا جارہا ہے اس لیے اردو والوں کو مایوس ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہم نے ابھی حال ہی میں 'اردو وپیڈیا' کی شروعات کی ہے جس میں اردو نصاب اور دیگر ضروریات کا مواد شامل کیا گیا ہے اور ہم جلد ہی ایک سافٹ ویئر لانچ کرنے جارہے ہیں جس سے لوگوں کو مزید سہولیات پیدا ہوں گی اب کمپیوٹر سے لے کر موبائل تک لوگ اردو کا استعمال بہ آسانی کرسکیں گے، انھوں نے زور دیتے ہوئے کہا کہ ہمیں سائبر میڈیا میں اردو کا چلن عام کرنے کے لیے ذاتی طور پر کوششیں کرنی ہوں گی۔ ''نواب سلطان جہاں بیگم: حیات وخدمات' کے مصنف پروفیسر اطہر صدیقی نے کہا کہ انھوں نے ایک صدی قبل تعلیم نسواں کے لیے کوششیں کی انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکے گا۔ 'پانی کے نشان' (افسانوی مجموعہ) کے مصنف وکرم سنگھ نے کہا کہ اردو ایک زبان نہیں بلکہ تہذیب ہے۔ جلسہ کو اکیڈمک اسٹاف کالج کے ڈائرکٹر پروفیسر اے آر قدوائی اور فی میل ایجوکیشنل سوسائٹی کی سکریٹری ذکیہ اطہر صدیقی نے بھی خطاب کیا۔ صدر جلسہ سید محمد اشرف نے کہا کہ اردو زبان کی سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ نہ تو وہ روزگار سے وابستہ ہے اور نہ ہی اسکول کی تعلیم میں اس کی شمولیت ہے۔ اسکولوں میں اردو کی شمولیت کے علاوہ اردو کی ترقی کے تمام کام قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کر رہی ہے جو لائق تحسین ہے۔ اس موقعے پر جن کتابوں کا رسم اجرا عمل میں آیا ان میں پروفیسر اطہر صدیقی کی کتاب 'نواب سلطان جہاں بیگم: حیات وخدمات' پروفیسر صغیر افراہیم کی کتاب 'اردو شاعری: تنقید و تجزیہ' وکرم سنگھ کی کتاب 'پانی کے نشان' عارف حسن خاں کی کتاب 'معراج العروض' شامل ہیں۔ پروگرام کے کوآرڈینیٹر پروفیسر صغیر افراہیم نے نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے علی گڑھ میں اردو ادب کے لیے کی جارہی کوششوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور سبھی کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 30 اگست 2013

میدان میں مسلمانوں کی کامیابیوں سے عوام کو متعارف کرانا ہے۔ مسلم تہذیب اسپین سے چین تک پھیلی ہوئی ہے اور دنیا کے مختلف علاقوں، تہذیبوں اور ثقافتوں پر اپنے نمایاں نقوش مرتب کیے ہیں اور جدید عہد کی تہذیب وثقافت کی شیرازہ بندی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ جدید عہد کے بے شمار سائنسی وحرفتی مظاہر مسلمانوں کی تخلیقات اور ایجادات کی ہی ترقی یافتہ شکلیں ہیں جن کی بدولت قدیم رومن تہذیب سے عبارت یوروپ کے سیاہ عہد سے آگے بڑھ کر انسانیت نے روشنی کا سفر طے کیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، یکم ستمبر 2013

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ٹیگور ورکشاپ

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ میں شعبہ اردو کے ٹیگور پروجیکٹ کے تحت 5 روزہ ورکشاپ 25 اگست کو اختتام پذیر ہوگئی۔ جلسے کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کی۔ اس موقعے پر اردو کے ممتاز شاعر اور بنگلہ زبان کے ماہر قیصر شمیم نے کہا کہ ٹیگور کی بازیافت کا عمل جاری ہے۔ ٹیگور سے کما حقہ واقفیت سے یہ عظیم تاریخی کارنامہ بے حد سلیقے سے جامعہ کے شعبۂ اردو میں انجام دیا جارہا ہے۔ اس موقعے پر پروفیسر وہاج الدین علوی نے کہا کہ ترجمہ وہ عمل ہے جس نے قوموں اور مذاہب کو ایک دوسرے سے آشنا کیا۔ شعبۂ اردو کے استاد اور اس پروجیکٹ کے کو آرڈی نیٹر پروفیسر شہزاد انجم کی کوشش رنگ لارہی ہے۔ اس موقعے پر بنگلہ زبان کے دیگر ماہرین فہیم انور، سعید اعظمی، نصرت جہاں، ایم علی اور مشتاق انجم نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نصرت جہاں نے کہا کہ اس کام کے لیے جامعہ اور جامعہ کے اساتذہ لائق تحسین ہیں۔ فہیم انور نے کہا کہ یہ ورکشاپ تاریخی اور یادگاری حیثیت کی حامل ہے۔ سعید اعظمی نے کہا کہ جامعہ نے یہ کام بے حد خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے۔ ایم علی نے امید کا اظہار کیا کہ یہ پروجیکٹ یقیناً کامیاب ہوگا اور ٹیگور کے حوالے سے جامعہ کا نام یقیناً مزید روشن ہوگا۔ شعبہ اردو کے استاد پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ ٹیگور کی تخلیقات کے ترجمے کام بنگلہ زبان کے ماہرین کے بغیر ممکن نہیں تھا۔ پروفیسر شہزاد انجم نے ورکشاپ کی رپورٹ پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس ورکشاپ میں ٹیگور کے ڈرامے، بچوں کا ادب، انٹرویوز، خطوط اور ٹیگور کا ناول 'گورا' کا مطالعہ کیا گیا اور اسے پڑھ کر سنایا گیا۔ جلسے کی نظامت ڈاکٹر سہیل احمد فاروقی نے کی اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 26 اگست 2013

جے این یو میں طرز بیدل پر تقی عابدی کا لیکچر

نئی دہلی: مہمان اسکالر ڈاکٹر سید تقی عابدی نے جے این یو کے ہندوستانی زبانوں کے مرکز میں 'طرز بیدل میں ریختہ گوئی' پر خصوصی لیکچر دیا۔ سب سے پہلے پروگرام کے کنوینر پروفیسر محمد شاہد حسین کے اعلان پر حاضرین جلسہ نے 2 منٹ کی خاموشی اختیار کر کے پروفیسر لطف الرحمٰن اور پروفیسر عبدالباری شبنم سبحانی کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اس کے بعد 'ہندوستانی زبانوں کے مرکز' کے چیئر پرسن پروفیسر رام بخش جاٹ نے مہمان خصوصی، صدر اور حاضرین کا استقبال کیا۔ پروفیسر محمد شاہد حسین نے ڈاکٹر سید تقی عابدی کا مختصر تعارف پیش کرتے ہوئے انھیں خصوصی لیکچر دینے کی دعوت دی۔

معروف اسکالر سید تقی عابدی جے این یو میں 'طرزِ بیدل میں ریختہ گوئی' کے موضوع پر خصوصی لیکچر دیتے ہوئے

ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اپنے ایک گھنٹے کی تقریر میں ہندوستان کے اردو شعرا پر بیدل کے اثرات کی نشاندہی کی۔ انھوں نے کہا کہ بیدل عظیم آباد، پٹنہ میں پیدا ہوئے اور دہلی میں دفن ہیں۔ بیدل کے مزار پر برسوں میلے لگتے رہے جن میں سودا جیسے بزرگ شاعر بھی شامل ہوتے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ علامہ اقبال نے کہا تھا کہ بیدل اپنی طرز کا موجد بھی ہے اور خاتم بھی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کے عظیم شاعروں نے بیدل سے استفادہ کیا ہے۔ غالب، انیس اور اقبال نے بیدل سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور اعتراف بھی کیا ہے۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے اپنی مختصر صدارتی تقریر میں اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ اردو والوں نے ڈاکٹر تقی عابدی جیسے دانشور کو بہت دیر سے دریافت کیا۔ پروفیسر انور پاشا نے اظہارِ تشکر کرتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی کو یاد دلایا کہ ان کے محبوب شاعر فیض احمد فیض جب بھی ہندوستان آئے تو جواہر لعل نہرو یونیورسٹی ضرور آتے تھے۔ لہٰذا اس روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ڈاکٹر تقی عابدی جب بھی ہندوستان آئیں تو جے این یو میں ایک لکچر ضرور ہونا چاہیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 4 ستمبر 2013

غالب کی فارسی شاعری پر توسیعی خطبہ

نئی دہلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ فارسی کی جانب سے ٹیگور ہال، دیار میر تقی میر میں ایک توسیعی خطبہ بعنوان: 'غالب کی فارسی شاعری میں طلسماتی کیفیت' کا انعقاد کیا گیا۔ نظامت شعبۂ فارسی میں اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر سید کلیم اصغر نے کی۔ اس خطبے کے مقرر ممتاز ادیب و محقق ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) تھے۔ آپ نے غالب کی نثر و نظم دونوں سے متعلق سیر حاصل گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ جس طرح غالب کی نظم اپنا جواب آپ ہے اسی طرح غالب کی نثر بھی لاجواب ہے۔ ڈاکٹر عابدی نے کہا کہ غالب کے فارسی اشعار پر تو کام ہوا ہے اور اردو خطوط پر بھی کام ہوا لیکن غالب کے فارسی خطوط پر

جامعہ ملیہ اسلامیہ میں منعقدہ توسیعی خطبہ بعنوان 'غالب کی فارسی شاعری میں طلسماتی کیفیت' کے موقعے پر موجود مہمان کرام

ابھی تک کام نہیں ہوسکا۔ انگریز حکمراں کو لکھا تھا اس کے بعد 1849 میں اردو میں خطوط نگاری کی۔ اخیر میں صدر شعبہ پروفیسر عراق رضا زیدی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم توسیعی خطبات کے لیے عام طور سے ان موضوعات کا انتخاب کرتے ہیں جو ہمارے درس کا حصہ ہوتے ہیں تاکہ اس طرح کے خطبات سے ہمارے عزیز طلبا استفادہ کریں کیونکہ غالب ہمارے کورس کا حصہ ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2013

جدہ میں ہندوستان کے قونصل خانے کا شاندار مشاعرہ

یہاں مشاعرہ نہیں ہوا بلکہ ادب سکھایا گیا ہے: وسیم بریلوی

ہندوستان کی مختلف ریاستوں سے بلائے گئے اردو کے شعرائے کرام نے انڈین قونصلیٹ کے سالانہ مشاعرے میں اپنے مسحور کن کلام سے پرستاران اردو ادب وغزل کو نئے لب و لہجے سے روشناس کراتے ہوئے حالات حاضرہ اور اصلاح معاشرہ جیسے اہم عنوانات پر اپنا کلام پیش کر کے یہ ثابت کر دیا کہ اردو شاعری صرف گل و بلبل یا عاشق و معشوق کی شاعری نہیں۔ ہندوستانیوں میں مقبول قونصل جنرل عزت مآب فیض احمد قدوائی اور قونصل پریس وانفارمیشن ڈاکٹر ارشاد احمد کی جانب سے انتہائی مہارت اور بہترین انتظامات کے ساتھ منعقد کیے گئے اس مشاعرے میں تقریباً ہر شاعر نے اپنی حاضری کا اپنے خوبصورت کلام سے سامعین کو احساس دلایا۔ ہندوستانی سفیر برائے سعودی عرب عزت مآب حامد علی راو نے بحیثیت مہمان خصوصی اپنی اہلیہ کے ساتھ شرکت فرمائی اور قونصل جنرل ہند کے ہمراہ مشاعرے کی شمع روشن کی۔ سفیر ہند نے اپنی مختصر مگر جامع تقریر میں بچپن کی یاد تازہ کرتے ہوئے فرمایا کہ میں میرٹھ میں اپنے والد کی انگلی پکڑ کر مشاعروں میں شرکت کے لیے جایا کرتا تھا۔ انھوں نے قونصل جنرل ہند فیض احمد قدوائی کی کاوشوں کو سراہا اور کہا کہ اردو زبان آج بھی اپنی مٹھاس اور چاشنی کی وجہ سے مقبول عام ہے۔ قونصل جنرل ہند جناب فیض احمد قدوائی نے مشاعرہ کمیٹی کے ذمے داران کے علاوہ اسپانسرز اور سامعین کو اس مشاعرے کو کامیاب بنانے کے لیے خراج تحسین پیش کیا۔ انھوں نے بطور خاص ان تمام ہندستانیوں کا شکریہ ادا کیا جنھوں نے اہل وطن قیدیوں کی رہائی کے لیے اعانت کی جس کے باعث تقریباً چھ لاکھ ریال کی خطیر رقم جمع ہوئی اور جس کی بدولت بے شمار ہندوستانی قیدیوں کو رہا کروالیا گیا۔ انھوں نے بطور خاص آندھرا پردیش کے دو قیدیوں کا ذکر

کیا جو تیرہ سال سے مقید تھے اور جو رہائی ملنے کے بعد اس سال اپنے وطن میں والدین کے ساتھ عید کی خوشیوں میں شریک ہو سکے۔ قونصل جنرل ہند نے وضاحت کی کہ ہر سال کی طرح اس سال کے مشاعرے کی ساری آمدنی انڈین پلگرمس ویلفیر فورم کے فنڈ میں جمع کی جائے گی تاکہ حج کی ادائیگی کے دوران پریشان ہو جانے والے حاجیوں کی خدمات انجام دی جائیں۔

قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین اور معروف شاعر پروفیسر وسیم بریلوی کی صدارت میں منعقدہ اس سال کے مشاعرے میں ادب و تہذیب اور اصلاح معاشرہ پر ایسی ایسی غزلیں اور نظمیں پیش کی گئیں کہ خود صدر مشاعرہ نے اپنے صدارتی خطاب میں اس حقیقت کا اعتراف کیا اور کہا کہ یہاں مشاعرہ نہیں ہوا بلکہ ادب سکھایا گیا۔ اس مرتبہ کے سامعین بھی غیر معمولی ادب نواز تھے جن کی کیفیتوں کا ناظم مشاعرہ ندیم فرخ کو بھی بخوبی احساس تھا لہٰذا انھوں نے سامعین کی ہر فرمائش کی تکمیل کرتے ہوئے شعرا کو دو یا تین مرتبہ سے زیادہ دعوت سخن دی۔ مشاعرے میں جان ڈالنے میں جہاں حیدرآباد کے آغا سروش کے مقبول کلام نے اہم رول ادا کیا وہیں ناظم مشاعرہ کے فی البدیہہ اشعار، حاضر جوابی اور خوبصورت نظامت کا بڑا دخل رہا۔ جن شعرا و شاعرات نے مشاعرے میں حصہ لیا ان میں تابش مہدی، رخسار بلرام پوری، سکندر حیات گڑبڑ، آغا سروش، وسیم ملک، اقبال اشہر، محسن جلگانوی، نکہت امروہی، نعیم قاری برہان پوری، جلیس شیروانی شامل ہیں۔

رپورٹ: جمال قادری، صدر اردو اکادمی جدہ، 9 ستمبر 2013

خبرنامہ

اقلیتوں کی تعلیمی صورتحال سے متعلق قومی اقلیتی تعلیمی نگراں کمیٹی کی سفارشات کو حکومت جلد از جلد نافذ کرے

کمیٹی کے اراکین کا مرکزی حکومت سے مطالبہ

نئی دھلی: 26 اگست، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اردو کے زیر اہتمام 'فروغ اردو بھون' میں قومی اقلیتی تعلیمی نگراں نفاذ کمیٹی کی میٹنگ منعقد ہوئی۔ اس میٹنگ میں مرکزی حکومت کو اقلیتوں کی تعلیمی صورتحال اور نفاذ کے تعلق سے پیش کی گئی حالیہ رپورٹ اور اس کی سفارشات پر غور وخوض کیا گیا۔ اس موقع پر کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر ظہیر آئی قاضی نے کہا کہ اقلیتوں کی تعلیمی صورتحال کو بہتر بنانے کے مقصد سے نفاذ کمیٹی نے اقلیتی آبادی والے علاقوں کا دورہ کر کے تعلیمی اسکیموں کے نفاذ کی متعدد سفارشات مرکزی حکومت کو پیش کی تھی، لیکن اب تک ان پر عمل آوری نہیں ہوسکی ہے، جس سے اقلیتی حلقوں میں خاصی تشویش ہے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتی آبادی والے علاقوں میں گرلس ہاسٹل، ماڈل اسکول، کالج کے قیام اور تربیت یافتہ اساتذہ کی تقرری نیز تعلیمی شرائط میں اقلیتوں کے لیے خصوصی مراعات دینے جیسی متعدد سفارشات پیش کی گئی ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ میٹنگ میں متفقہ طور پر یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جلد ہی کمیٹی کا ایک وفد مرکزی وزیر برائے فروغ انسانی وسائل جناب ایم پلم راجو سے ملاقات کرے گا تاکہ کمیٹی کی سفارشات کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ کمیٹی کے رکن اور معروف عالم دین مولانا ولی رحمانی نے کہا کہ نفاذ کے لیے مرکزی حکومت، فاسٹ ٹریک نظام کے تحت جلد از جلد قدم اٹھائے۔ انھوں نے کہا کہ اقلیتی علاقوں میں 5 لاکھ اساتذہ کی ضرورت ہے۔ مولانا موصوف نے کہا کہ مرکزی حکومت قومی اقلیتی نگراں کمیٹی کی سفارشات کو روایتی انداز میں نہیں بلکہ ترجیحی بنیاد پر نفاذ کرے۔ انھوں نے مزید کہا کہ مرکزی حکومت اقلیتوں کی تعلیمی فلاح کے تئیں سنجیدہ ہے لیکن عملی اقدام کے بغیر اقلیتیں تعلیمی اسکیموں سے مستفید نہیں ہوسکتیں۔

اقلیتوں کی تعلیمی صورتحال سے متعلق قومی اقلیتی تعلیمی نگراں کمیٹی کی میٹنگ کا منظر

قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کمیٹی کے تمام اراکین کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اقلیتی اداروں کے قیام کے تعلق سے بیشتر ریاستی حکومتیں تساہلی سے کام لیتی ہیں، جس کے نتیجے میں اقلیتوں کو اپنی ادارہ سازی کی راہ میں رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور انھیں این او سی (NOC) فراہم کرنے میں بھی دشواری ہوتی ہے۔ کمیٹی نے اس بڑے مسئلے کو بھی حل کرنے کی جامع سفارش مرکزی حکومت کو پیش کی ہے تاکہ اقلیتیں اپنے ادارے با آسانی قائم کرسکیں۔ میٹنگ میں کمیٹی کے رکن پروفیسر محمد حلیم خان اور این سی ٹی ای کے نمائندہ ڈاکٹر انل شکلا نے بھی شرکت کی۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 اگست 2013

اقلیتی اداروں میں اردو کی صورت حال پر 'اردو دنیا' کا خصوصی شمارہ

قومی اردو کونسل نے اپنے مقبول اور کثیر الاشاعت ماہانہ رسالے 'اردو دنیا' میں کور اسٹوریز اور خصوصی شماروں کے ذریعے قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں اردو زبان و ادب کے مکمل منظرنامے کی تصویر کشی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے اس کے تحت کونسل نے اس مرتبہ ملک کے اقلیتی تعلیمی اداروں میں اردو زبان و ادب کی تعلیم و تدریس اور اس کے فروغ کے سلسلے میں ہونے والی سرگرمیوں اور اس سلسلے میں درپیش مسائل کا جائزہ لینے اور اس سلسلے میں مختلف شعبہ ہائے زندگی اردو دانش وروں کی آرا اور تاثرات پیش کرنے کے لیے 'اردو دنیا' کے ایک خصوصی شمارے کی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے۔ ملک کے اطراف و جوانب میں سرگرم سبھی اقلیتی ادروں کے سربراہان و منتظمین سے درخواست ہے کہ وہ اپنے ادارے کی تاریخ، سرگرمیوں اور ادارے کی اردو خدمات کا مختصر احوال، تصاویر کے ساتھ 'اردو دنیا' کے ای میل آئی ڈی urduduniyancpul@yahoo.co.in یا editor@ncpul.in پر زیادہ سے زیادہ 31 اکتوبر 2013 تک ارسال فرمادیں۔ مضمون اور تصاویر قومی اردو کونسل کے پتے پر بھی ارسال کرسکتے ہیں۔

پتہ ہے: شعبۂ ادارت، قومی اردو کونسل، فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9 انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025 (منجانب: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام، ڈائریکٹر قومی اردو کونسل و ایڈیٹر، ماہنامہ 'اردو دنیا' نئی دہلی)

پندرھویں کل ہند اردو کتاب میلے کا افتتاح

اردو تہذیب کے لیے اردو کتابوں کا فروغ ضروری: قمرالاسلام

کرناٹک اردو کا اہم اور تاریخی مرکز ہے: ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین

بنگلور: ''اگر تہذیب کو زندہ رکھنا ہے تو اردو زبان کی کتابوں کو فروغ دینا چاہیے اردو دانشوران اور اردو کے قلم کاروں اور ان تمام ادبی شخصیات جو اردو ادب کی مختلف اصناف کی خدمت کررہے ہیں، اگر ان کی کتابوں کو پذیرائی حاصل ہوتی ہے تو اردو کو فروغ حاصل ہوتا ہے''، ان خیالات کا اظہار جناب قمرالاسلام وزیر برائے وقف، حج و اقلیتی امور ریاست کرناٹک نے یہاں قومی اردو کونسل کے زیراہتمام منعقدہ کل ہند اردو کتاب میلے کے افتتاح کے بعد جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انھوں نے اس موقع پر مزید کہا کی عمر میں بھی آپ نے اردو کے فروغ کے لیے خطاطی کے فن کو اختیار کیا ہے یہ یقیناً نوجوانوں کے لیے ایک مثال ہے۔ مفتی اشرف علی نے محبان اردو سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کونسل کی جانب سے اردو سے محبت رکھنے والوں کے لیے ایک اچھا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ اس موقعے پر عبیداللہ شریف، ممبر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان و ایڈیٹر روزنامہ پاسبان نے اپنے خطاب میں کہا کہ اس کتب میلے کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ یہاں اردو زبان میں نہ صرف مذہبی کتابیں ہیں بلکہ عصری، علمی، اور

کل ہند اردو کتاب میلے کے افتتاح کا منظر

کہ جب تک ہندوستان کے دستور میں سیکولرزم، جمہوریت اور زبانوں کے حقوق باقی رہیں گے اردو کو کوئی بھی مٹا نہیں سکے گا۔ اس موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر جناب خواجہ محمد اکرام الدین نے کہا کہ دکن جس میں ریاست کرناٹک بھی شامل ہے اس کا فروغ اردو میں بہت اہم رول رہا ہے۔ اردو کلاسیکی زبان میں دکنی اردو ایک اہم باب ہے۔ اردو کے ابتدائی شعرا اور ادیب حضرات کا یہ مسکن رہا ہے اسی اہمیت کے پیش نظر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اپنا پندرھواں کل ہند اردو کتاب میلہ یہاں منعقد کیا ہے۔ بنگلور والوں سے کونسل کو بہت ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ بنگلور علم و ادب کا گہوارہ ہے یہاں اردو کی کتب کا فروغ یقیناً مشترکہ تہذیب کے فروغ کا باعث ہوگا۔ انھوں نے اس افتتاحی جلسے میں شریک تمام حاضرین کا استقبال کیا اور خصوصاً نعیم الخطاط جو حیدرآباد سے آئے ہیں ان کے حوصلے کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ 85 سال

سائنس و ٹکنالوجی کے علاوہ دیگر موضوعات پر کثیر تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ اس سے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اردو زوال پذیر نہیں بلکہ ترقی پذیر زبان ہے۔ ہمیں نئی نسل کو اردو زبان اور اس کی تہذیب و ثقافت سے واقف کرانا چاہیے اور انھیں اردو کتابیں پڑھنے کی جانب راغب کرنا چاہیے۔

افتتاحی جلسے میں اردو داں طبقے کے ساتھ ساتھ لیفٹیننٹ اینڈ کرنل شیو نارائن منکڈ اور انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس کے۔ سی۔ گوند سوامی بھی شریک تھے۔ انھوں نے کہا کہ اردو ایک قومی زبان ہے، اسے مسلمانوں کے ساتھ جوڑنا غلط ہے یہ لشکری زبان ہے اس زبان کے فروغ میں ہندو مسلم اور سکھوں کا اہم کردار رہا ہے۔ اجلاس کے آخیر میں جناب عظمت اللہ شریف، رجسٹرار کرناٹک اردو اکادمی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا جبکہ اعظم شاہد صاحب نے جلسے کی نظامت کے فرائض انجام دیے۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 ستمبر 2013

اساتذہ ہمہ تن مشغول رہیں طلبہ کی ذہن سازی کے لیے اُردو کتب میلہ میں محمد محسن کمشنر آف پبلک انسٹرکشن کا خطاب

بنگلور: کل یہاں اُردو کتب میلہ کے تیسرے دن طلبہ اور اساتذہ سے خطاب کرتے ہوئے جناب محمد محسن کمشنر آف پبلک انسٹرکشن نے کہا کہ موجودہ دور میں اساتذہ کی ذمے داری اور فرائض پچھلے دور سے بھی زیادہ ہیں۔ مسابقتی دوڑ کے اِس دور میں اساتذہ کو بہت زیادہ چاق و چوبند رہنا ہے۔ اپنی معلومات کو ہر دِن بڑھانا ہے۔ اس موقع پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر جناب ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اپنے استقبالیہ کلمات میں کہا کہ اِس ملک گیر کتب میلے میں ملک کے مختلف شہروں سے کتب فروش اور علم و دانش سے متعلق ادارے حصہ لے رہے ہیں۔ NCPUL کے مختلف پروگراموں میں اردو کتب میلہ ایک اہم پروگرام ہے۔ اس کے ذریعے فروغ اُردو و اردو لٹریچر کی ترویج میں بڑی مدد ملتی ہے۔ جن مقامات پر بھی اس سے قبل نمائش (میلے) منعقد ہوئے ہیں ہر شہر میں محبانِ اردو، اردو طلبہ اور اساتذہ نے اپنی زبردست دلچسپی کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے ایسی ہی توقع اس میلے سے کی ہے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ زبان و ادب کی ترویج میں اشاعتی ادارے اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ہمیں اشاعتی اداروں اور کتب فروشوں کی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔ اگر ان کی ہمت افزائی ہوتی ہے تو بلاواسطہ یا بالواسطہ مصنّفین کی بھی ہمت افزائی ہوتی ہے۔

اس جلسے میں جناب عظیم الدین سابق ایم ایل سی نے بحیثیت مہمانِ خصوصی خطاب فرماتے ہوئے کہا کہ کتب میلہ محبان اردو کیلئے ایک نعمت ہے۔ اردو داں طبقے نمائش میدان میں جوق در جوق حاضر ہوں اور اردو سے اپنے لگاؤ کا ثبوت پیش کریں۔ اس جلسے کی نظامت اردو لکچرر جناب منظور نعمانی نے فرمائی جبکہ اردو ٹیچر جناب حافظ کفایت نے انتظامی امور انجام دیے۔ میلے کے دوسرے دِن حاضر ہونے والی اہم ادبی شخصیات نے حاضری دی اُن کے تاثرات مندرجہ ذیل رہے۔

اس موقعے پر ملنسار اطہر احمد، آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن بنگلور نے کہا کہ ''کتب میلہ بڑے سلیقے سے منعقد کیا گیا ہے۔ کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔'' شفیق عابدی نے اسے قومی کونسل کا مبارک قدم بتاتے ہوئے کہا کہ ''دکن میں اس میلے کو مزید کامیاب ہونا چاہیے کیونکہ دکن اردو کا اہم مرکز رہا ہے۔''

ضیا کرناٹکی، سید حامد محسن اور ظفر محی الدین نے بھی کتب میلے کی ستائش کی اور مختلف بک اسٹال کا دورہ کیا۔

پریس نوٹ، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2013

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

الہ آباد یونیورسٹی میں محمد رفیق میموریل لیکچر

الہ آباد: شعبۂ عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی کی جانب سے محمد رفیق میموریل لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ یہ لیکچر قومی کونسل برائے فروغ اردو کے مالی تعاون سے منعقد کیا جاتا ہے۔علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے سابق صدر ونامور مورخ، پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے عربی کے قدیم علمی شاہکاروں کے فارسی تراجم کے عنوان پر خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر صدیقی نے اپنے خطبہ میں فرمایا کہ ہندوستان کو یہ فخر حاصل ہے کہ عربی سے فارسی میں تراجم کی ابتدا ایران و توران سے پہلے ہندوستان ہی میں ہوئی۔ تراجم کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر صدیقی نے فرمایا کہ یہ تراجم اس دور کی تاریخ وثقافت کے مطالعہ کے لیے بڑی اہمیت کے حامل ہیں مزید یہ کہ یہ تراجم تخلیقی نوعیت کے ہیں جن سے فارسی زبان ادب کو بڑی وسعت ملی۔ ڈاکٹر حسنین اختر نے معزز مہمان کا تعارف پیش کیا اور صدر یہ شعبہ پروفیسر عبدالقادر جعفری نے مہمانوں کا استقبال کیا۔

پروگرام کی صدارت پروفیسر نعیم الرحمٰن فاروقی نے جب کہ ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر سردار تر پاٹھی اور پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ نظامت ڈاکٹر حسنین اختر اور شکریہ کے فرائض ڈاکٹر صالح رشید نے انجام دیے۔

پروگرام میں شعبہ کے طلبہ و طالبات کے علاوہ پروفیسر علی احمد فاطمی، جناب ایم اے قدیر، ڈاکٹر فخر الکریم، ڈاکٹر محمود مرزا، جناب حسیب احمد، پروفیسر نوشابہ سردار، پروفیسر عبدالحامد، ڈاکٹر ابوللیث ڈاکٹر سعید عثمانی، جناب نیلوفر حفیظ اور جناب احسان علی صاحب وغیرہ کے اسما گرامی قابل ذکر ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اگست 2013

آسی غازی پوری کی شاعری پر سیمینار

آسی غازی پوری کی شاعری توحید ومعرفت کی شاعری ہے، ان کے بعض اشعار سے لوگوں میں غلط فہمی پیدا ہوگئی حالانکہ ان کے یہاں توحید و رسالت کا عقیدہ بہت ہی واضح اور صاف وشفاف ہے ان کی شاعری وحدۃ الوجود کے فلسفہ میں رنگی ہوئی ہے۔ان خیالات کا اظہار پروفیسر اختر الواسع وائس چیئرمین اردو اکادمی، دہلی اور سابق صدر شعبہ اسلامیات جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی نے خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد میں منعقد سیمینار بعنوان آسی غازی پوری کی روحانی و اخلاقی شاعری میں کیا۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی کے تعاون سے شاہ صفی میموریل ٹرسٹ، خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد نے یہ سیمینار حضرت آسی غازی پوری کے جشن صد سالہ کی مناسبت سے کیا تھا۔ افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے مولانا ذیشان احمد مصباحی، استاذ جامعہ عارفیہ، سید سراواں نے سیمینار کے پس منظر اور حضرت آسی غازی پوری کی شخصیت کے بارے میں تفصیل سے بتایا اور مندوبین و شرکا کا استقبال کیا۔ مولانا ابرار رضا رشیدی مصباحی نے خانقاہ رشیدیہ جون پور کی نمائندگی کرتے ہوئے حضرت آسی غازی پوری کی شعری خصوصیات کے ساتھ سلسلہ رشیدیہ کے امتیازات اور اس کی تاریخ کے حوالے سے اپنا مقالہ پیش کیا۔ ڈاکٹر ظفر انصاری ظفر اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو الہ آباد یونیورسٹی نے آسی غازی پوری کی صوفیانہ شاعری کی ادبی خوبیوں پر روشنی ڈالی۔

واضح رہے کہ اس سیمینار میں بطور مہمان خصوصی عزت مآب جناب راشد مینائی، درگاہ شاہ مینا، لکھنؤ نے شرکت کی۔ دیگر کئی خانقاہوں، مدرسوں اور دانش گاہوں کے وابستگان بھی موجود تھے۔ جامعہ عارفیہ کے اساتذہ اور طلبہ بھی تھے۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام الدین ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی بھی بطور مہمان خصوصی مدعو تھے جو کسی وجہ سے نہیں آسکے۔ سیمینار کی نظامت مولانا مجیب الرحمٰن علیمی ریسرچ اسکالر الہ آباد یونیورسٹی نے کی جب کہ فیضان ناروی اور ساجد سعیدی نے بارگاہ رسالت مآب میں حضرت آسی کا منظوم کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 ستمبر 2013

مرادآباد میں قومی یکجہتی اور اردو پر سیمینار

مراد آباد: اردو کسی خاص فرقے، کسی خاص مذہب کسی خاص طبقے کی زبان نہیں۔ یہ سارے عالم کے لوگوں کی زبان ہے۔ دنیا میں بولی جانے والی 127 زبانوں میں اردو چوتھے نمبر پر ہے۔ یہ قومی یکجہتی کے فروغ میں سب سے زیادہ معاون ہے۔ ان خیالات کا اظہار مقامی پریس کلب میں کونسل برائے فروغ اردو دہلی کے مالی تعاون سے انجم ویلفیئر سوسائٹی کے زیراہتمام منعقد ایک روزہ قومی سیمینار 'قومی یکجہتی کے فروغ میں اردو زبان کا کردار' میں مہمان خصوصی شکیل الرحمٰن بجنوری نے کیا۔ مقالہ نگاروں میں سید محمد ہاشم، ڈاکٹر ضیاء الحق فہیم، ترنم پروین، نشا جمال، شمیم فاطمہ، عقیل ملک، شیخ نگینوی، اکرم فاروقی، فرقان سنبھلی وغیرہ نے موثر انداز میں اردو اور قومی یکجہتی پر مقالہ پیش کیے چندر شیکھر بھاردواج نے اردو کی اہمیت، مقبولیت، افادیت پر بڑی خوبصورتی سے روشنی ڈالی۔

پروگرام کی صدارت ہاپوڑ سے تشریف لائے فضل الرحمان نے کی۔ پروگرام کو سراہتے ہوئے اس کے مزید پروگراموں کی ضرورت پر زور دیا۔ نظامت ناصر منصوری نے کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 ستمبر 2013

گزارش

مضمون نگاروں سے گزارش ھے کہ اپنی نگارشات کے ساتھ ایک عدد پاسپورٹ سائز کی تصویر ضرور ارسال کریں۔ مضمون کے ساتھ تحریری طور پر یہ تصدیق کرنا بھی ضروری ھے کہ یہ مضمون غیرمطبوعہ ھے اور کسی بھی رسالے اخبار یا کتاب میں شایع نہیں ہوا ھے۔ مضمون تحریر کرتے ہوئے یہ ذہن میں رکھا جائے کہ نئے موضوعات اور جدید تقاضوں پر لکھے گئے مضامین کو اشاعت میں ترجیح دی جائے گی۔ (ادارہ)

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

لسانی کمیشن کی سفارشات پر عمل کے لیے قانون بننا چاہیے: کے رحمٰن خان

نئی دھلی: مرکزی وزیر اقلیتی امور کے رحمٰن خان نے مختلف ریاستوں میں اردو کو نظرانداز کیے جانے پر تشویش کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ لسانی اقلیتی کمیشن کی سفارشات کو لازمی طور پر نافذ کرنے کے لیے قانون بنایا جانا چاہیے۔ لسانی اقلیتی کمیشن نے اردو جیسی زبانوں کو فروغ دینے کی سفارش کی تھی۔ یہ سفارشات تمام ریاستوں کو روانہ کردی گئی تھیں۔ کے رحمٰن خان نے کہا کہ دستور کے معماروں کو اس بات کا خدشہ لاحق ہوگیا تھا کہ لسانی اقلیتوں کی زبانوں کو نظرانداز کیا جائے گا۔ اس خدشے کو محسوس کرتے ہوئے انھوں نے لسانی اقلیتی کمیشن تشکیل دیا تھا۔ مرکزی وزیر نے کہا کہ دستور میں آپ جو چاہیں ترمیم کریں، لیکن جب تک قانون نہیں بنایا جاتا اس وقت تک اس مسئلہ پر کوئی بھی سنجیدگی سے غور نہیں کرتا۔ قومی کمشنر برائے لسانی اقلیت کا دفتر الٰہ آباد میں واقع ہے۔ دستور کی دفعہ 350 بی میں اس بات کی گنجائش فراہم کی گئی ہے کہ لسانی اقلیتوں کے لیے ایک خصوصی افسر کا تقرر کیا جائے۔ لسانی اقلیتوں سے متعلق تمام مسائل کی یکسوئی کرنا اور اس سلسلے میں رپورٹ صدر جمہوریہ کو ارسال کرنا کمشنر کے فرائض منصبی میں شامل ہے۔ کے رحمٰن خان نے اردو داں طبقہ پر بھی زور دیا کہ وہ اپنی زبان کو فروغ دینے کے لیے حکومت پر دباؤ ڈالیں۔

روزنامہ 'منصف' حیدرآباد، 13 اگست 2013

اردو کو مٹایا نہیں جا سکتا: گلزار

ممبئی: ہندوستان کے عالمی شہرت یافتہ شاعر، ادیب اور فلم ساز گلزار کا کہنا ہے کہ اردو دنیا کی حسین ترین زبان ہے جس نے انتہائی تیزی کے ساتھ لوگوں کے دلوں میں گھر کرلیا ہے اور روح میں رچ بس گئی ہے۔ حقیقت میں یہ زبان ہندوستان میں ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے والی زبان ہے جسے لوگ کوئی بھی نام دیں مگر وہ دراصل اردو ہی ہے۔ انھوں نے ایک انٹرویو میں واضح طور پر کہا کہ اردو خوبصورت ترین ذریعہ ابلاغ ہے جو انتہائی مشکل حالات میں خودرو پودے کی طرح اپنی جگہ بنا لینے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ عظیم شاکر نے اردو میں لکھی اپنی کتاب 'دھن' میں کہا ہے کہ ہندوستان میں اردو کو مٹانے کی کوششیں ہورہی ہیں اور اسے پیچھے دھکیلا جارہا ہے لیکن ان ساری کوششوں کے باوجود یہ زبان رابطے کا ذریعہ اور اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 23 اگست 2013

اردو ریسرچ اسکالر اساتذہ کی غفلت کے شکار

نئی دھلی: ریسرچ اسکالرس کے تعلق سے اساتذہ کو اپنی ذمہ داری سمجھنی چاہیے اور انھیں اپنے مطالعہ و معلومات کو وسیع کرنا چاہیے۔ آج ریسرچ کا معیار دن بہ دن گرتا جارہا ہے اور 90 فیصد تھیسس بنا دیکھے ہی کلیئر کردی جاتی ہیں۔ ریسرچ اسکالرس اپنے اساتذہ کی عدم توجہی و غفلت کا شکار ہیں۔ ان خیالات کا اظہار معروف نقاد، ادیب و دانشور پروفیسر علی احمد فاطمی (الٰہ آباد) نے غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام منعقد کیے گئے سالانہ کل ہند ریسرچ اسکالرس غالب سیمینار میں بطور مہمان خصوصی خطاب کرتے ہوئے کیا۔ ایوانِ غالب میں منعقد اس قومی سیمینار کا افتتاح این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے کیا۔ افتتاحی اجلاس کی صدارت کناڈا کے معروف ادیب، نقاد اور دانشور سید تقی عابدی نے کی، جب کہ نظامت کے فرائض ڈاکٹر رضا حیدر نے انجام دیے۔ پروگرام کے آغاز میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے وائس چیئرمین پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تمام مہمانان کا خیرمقدم کرتے ہوئے ان کا مختصر تعارف پیش کیا۔ آخر میں انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر شاہد ماہلی نے اظہار تشکر کیا۔ اس موقعے پر اپنی افتتاحی تقریر میں این سی پی یو ایل کے ڈائرکٹر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے اعلان کیا کہ بہت جلد این سی پی یو ایل ریسرچ اسکالرس کے لیے اپنی نئی اسکیم کا اعلان کرے گی۔ پاکستان کے نامور ادیب و دانشور عطاء الحق قاسمی نے تحقیق کے موضوعات پر دھیان دینے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے والدین و اساتذہ کو صلاح دی کہ زبردستی کسی طالب علم سے ریسرچ نہیں کرائی جانی چاہیے۔ اس موقعے پر پاکستان کے نامور ادیب و شاعر پروفیسر تحسین فراقی نے بھی اظہار خیال کیا۔ بعد ازاں سیمینار کے دوسرے اجلاس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو کے صدر پروفیسر وہاج الدین علوی، انجمن ترقی اردو ہند کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر اطہر فاروقی، ڈاکٹر عطاء الحق و پروفیسر تحسین فراقی نے اور نظامت ڈاکٹر شعیب رضا خاں نے کی جب کہ بنارس ہندو یونیورسٹی کی طالبہ تمنا شاہین، الٰہ آباد یونیورسٹی کے غضنفر سعید، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خورشید احمد اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے محضر رضا نے مقالے پیش کی۔ اسی طرح قومی سیمینار کے اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر ابن کنول و پروفیسر مظہر مہدی نے کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض سفینہ بیگم نے انجام دیے۔ اس

نئی دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ اسکالرس کے سیمینار کے دوران اظہار خیال کرتے ہوئے صدیق الرحمٰن قدوائی، دیگر شرکا میں پروفیسر علی احمد فاطمی، سید تقی عابدی، خواجہ محمد اکرام الدین و دیگر

شہریار کی حیات وخدمات پر سمپوزیم

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر نے اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت پر خاصہ زور دیا ہے۔اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میری کوشش ہے کہ یہ زبان پوری دنیا میں مقبول ہو۔ وائس چانسلر ضمیرالدین شاہ نے ساہتیہ اکادمی کی جانب سے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے آرٹس فیکلٹی لاؤنج میں 'شہریار- حیات وخدمات' پر منعقدہ سمپوزیم کا افتتاح کرتے ہوئے یہ بات کہی۔ انھوں نے کہا کہ شہریار کی نظموں اور غزلوں کی وجہ سے اردو زبان وادب میں ان کا مقام بہت بلند

علی گڑھ: خطاب کرتے ہوئے وائس چانسلر ضمیرالدین شاہ جب کہ اسٹیج پر دیگر مہمان کو دیکھا جاسکتا ہے

ہے۔ انھیں ساہتیہ اکادمی اور گیان پیٹھ جیسے 2 اعلیٰ ادبی اعزازات سے بھی نوازا گیا تھا۔ ساہتیہ اکادمی کے اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر چندر بھان خیال نے تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا کہ شہریار نے لسانی تاریخ میں ایک اہم مقام حاصل کیا ہے جو صدیوں تک قائم رہے گا۔ اردو کے ممتاز ناقد پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا کہ موجودہ وائس چانسلر لیفٹیننٹ جنرل ضمیرالدین شاہ نے اردو کے تعلق سے اس مٹی کے زرخیز ہونے کے امکانات پیدا کردیے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شہریار کی شخصیت اس پھول کی طرح ہے جو ایک دوسرے کو باندھتی ہے، انھوں نے اردو کے دو پھول پروفیسر گوپی چند نارنگ اور جناب شمس الرحمٰن فاروقی کو ایک ساتھ رکھا ہے۔ پروفیسر خورشید احمد نے پروفیسر شہریار کی نظموں کے حوالے سے عالمانہ گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اخترالایمان اور شہریار نے نظم کو نیا انداز دیا۔ مشتاق صدف نے جلسے کی نظامت کی جب کہ جلسے کی صدارت کرتے ہوئے شعبہ ماس کمیونیکیشن کے سربراہ پروفیسر شافع قدوائی نے کہا کہ شہریار کم سے کم الفاظ میں اپنی بات کہنے کا فن جانتے تھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 27 اگست 2013

موقعے پر جے این یو کی طالبہ شمائلہ شمس وسید ضیغم عباس اور موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی اودے پور کی شہناز و دہلی یونیورسٹی کے کمیل ترابی نے بھی مقالے پڑھے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 ستمبر 2013

مولانا آزاد کی خدمات ناقابل فراموش: سبل

نئی دہلی: قانون و آئی ٹی کمیونی کیشن کے مرکزی وزیر کپل سبل نے کہا کہ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی ملکی خدمات فراموش نہیں کی جاسکتیں۔ انھوں نے کہا کہ ملک کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے مولانا نے تعلیمی ترقی کے لیے جو راہ متعین کی تھی اس نے بھارت کا مستقل روشن

کیا ہے۔ ہم انہی کی رہنمائی میں اوج ثریا پر آج کمندیں ڈال رہے ہیں۔ مسٹر سبل نے مذکورہ باتیں مولانا آزاد کو نئی نسل تک پہنچانے کے ضمن میں کہیں جب ایک مسلم وفد نے سال رواں کے 11 نومبر کو مولانا آزاد کے 125 ویں سالگرہ کے تناظر میں سمپوزیم اور سیمیناروں کے ذریعے انھیں یاد کرنے کی سمت میں توجہ دلائی۔ حالیہ دنوں اردو کی پیڈیا لانچ کرنے پر مسٹر سبل کو مشاورت کی طرف سے مبارکباد بھی پیش کی گئی۔ اقلیتوں میں تعلیم کو عام اور 'ایچ ون ٹیچ ون' کا نعرہ بلند کرنے والی آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت کے ایک وفد نے مسٹر کپل سبل سے مسلم ایشوز پر ملاقات کی تھی۔ مشاورت نے کئی اہم ملی وملکی مسائل کے ساتھ مسٹر سبل کی توجہ اس جانب خاص طور پر مبذول کرائی کہ کہ مولانا آزاد کی ملکی خدمات دانستہ یا نادانستہ ہماری نئی نسل بھول رہی ہے۔ وفد میں شامل ڈاکٹر وسیم احمد خان نے وزیر موصوف کے سامنے یہ تجویز بھی رکھی کہ مولانا آزاد کی 125 ویں سالگرہ پر 11 نومبر کو اقلیتوں کی تعلیمی ترقی کے لیے یوپی اے سرکار کسی اہم اسکیم کا اعلان کرے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنی ممکنہ کوشش کریں گے۔ علاوہ ازیں وفد نے کئی دیگر اقلیتی ومسلم مسائل کے حل پر گفتگو کی جن پر مسٹر سبل نے انتہائی سنجیدگی کا مظاہرہ کیا۔

روزنامہ 'ہماراسماج' دہلی، 4 ستمبر 2013

علی برادران کا ذکر نصابی کتابوں میں ہونا چاہیے

نئی دہلی: آزاد رکن پارلیمنٹ راجیہ سبھا چودھری منور سلیم نے اپنے خصوصی مینشن میں ایوان سے مطالبہ کیا کہ جنگ آزادی میں اہم کردار ادا کرنے والے علی برادران اور مسلم کرداروں کو نصابی کتابوں میں شامل کیا جائے۔ انھوں نے اپنے خصوصی مینشن میں کہا کہ ہندوستان کی جنگ آزادی میں اپنی جان نچھاور کرنے والے وہ مولانا محمد علی جوہر جن کا اعلان تھا کہ گول میز کانفرنس سے یا تو ملک آزاد کرا کر لوٹوں گا یا پھر وہیں اپنی جان دے دوں گا اور آخر میں وہی ہوا کہ انھوں نے گول میز پر ہی اپنی جان دے دی، ان کے بھائی محمد شوکت علی جوہر نے سخت جیل کاٹی اور ان کی ماں بی اماں کے ہاتھ کی سلی ہوئی ٹوپی مہاتما گاندھی نے اپنے سر پر لگائی اور آج تک وہ گاندھی کیپ کہلاتی ہے۔ اسی طرح وہ برکت اللہ بھوپالی جنھوں نے عبوری حکومت کے وزیر اعظم کے طور پر برطانوی حکومت کو ماننے سے انکار کرتے ہوئے ہندوستانیوں کو فرنگیوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا تھا، اسی طرح وہ پہلا ہندوستانی جس نے فرنگیوں کے سینے پر پیر رکھ کر لال قلعے کی دیوار پر ترنگا لہرایا۔ وہ کون تھا جس پر انگریز حکومت میں ملک سے غداری کرنے کا مقدمہ چلا اور اس کا مقدمہ پنڈت جواہر لعل نہرو اور ان کے ساتھی وکیلوں نے لڑا تھا نیز اسے بری بھی کرایا تھا۔ اس آزادی کے متوالے کا نام جنرل شاہنواز خان تھا جو سبھاش چندر بوس کے خاص ساتھیوں میں سے تھے۔ ایوان کی جانب سے حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہوں کہ مرکزی وزارت برائے فروغ انسانی وسائل حکومت ہند کم ازکم ان کرداروں کو نصابی کتابوں میں ضرور شامل کرے۔ انھوں نے کہا کہ ماضی میں مذکورہ بالا کرداروں پر مبنی ایک باب نصاب میں شامل کیا گیا تھا لیکن نہیں معلوم کیوں اسے نکال دیا گیا۔ انھوں نے کہا کہ میں دوبارہ مطالبہ کرتا ہوں کہ ان مسلم کرداروں کو نصاب میں شامل کیا جائے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 اگست 2013

ساہتیہ اکادمی لائبریری کی زیادہ تر فہرست آن لائن

نئی دہلی: ہندوستان میں 24 مقامی زبانوں میں کتابوں کی نشر واشاعت کے لیے مشہور ساہتیہ اکادمی کی لائبریری میں 16 زبانوں کی کتابوں کی فہرست اب آن لائن ہوچکی ہے۔ آن لائن فہرست میں ارو، ہندی، انگلش، بوڈو، ڈوگری، کشمیری، کوکنی، میتھلی، منی پوری،

نیپالی، اڑیہ، پنجابی، راجستھانی، سنتھالی، تمل اور تیلگو زبانیں شامل ہیں۔ بقیہ سنسکرت، بنگلہ، سندھی، مراٹھی اور آسامی زبانوں کی کتابوں کی آن لائن فہرست سازی کا کام زیرعمل ہے جب کہ گجراتی، کنڑ اور ملیالی زبانوں کی کتابوں کی فہرست سازی ہنوز باقی ہے۔ ساہتیہ اکادمی کے لائبریرین سفیان احمد نے بتایا کہ فہرست سازی کا عمل پچھلے تین برسوں سے جاری ہے اور اب تک ہم نے 16 زبانوں کی فہرست سازی مکمل کرنے کے بعد مزید 5 زبانوں کی فہرست سازی کا کام شروع کردیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری لائبریری کی شاخیں کولکاتا، ممبئی اور بنگلور میں ہیں وہاں اگرچہ کتابیں کچھ کم ہیں مگر وہاں کی کتابوں کی فہرست سازی بھی عمل میں آئے گی۔ اردو زبان کی کتاب تلاش کرنے کا طریقہ بتاتے ہوئے مسٹر سفیان نے بتایا کہ ویب سائٹ پر لائبریری کی لنک میں جائیں، لائبریری کھل جانے کے بعد فہرست سرچ کے آپشن میں جاکر جس مصنف یا کتاب کا نام تلاش کرنا ہو، لکھ کر سرچ کریں۔ اردو میں کی بورڈ ڈاؤن لوڈ لنک دیا گیا ہے جس کو ڈاؤن لوڈ کرکے اردو میں بھی سرچ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ لائبریری میں اردو کا نایاب نمونہ موجود ہے۔ معروف ادیب گوپی چند نارنگ نے لائبریری کو ادب کے نادر ذخیرے پر مشتمل تقریباً 5 ہزار کتابیں دی ہیں جس میں نایاب قدیم کتابوں کے علاوہ پاکستانی کتابوں کا ذخیرہ بھی شامل ہے جو عام طور سے بہت کم لوگوں کے پاس دستیاب ہے۔ واضح رہے کہ اکادمی کے تحت ہندوستان میں رائج 24 زبانوں کی کتابیں شائع ہوتی ہیں اور یہاں کی لائبریری میں بھی 24 زبانوں کی کتابیں موجود ہیں۔ لائبریری سے وہی لوگ استفادہ کرسکتے ہیں جو یہاں کے مستقل ممبر ہیں۔ عام لوگوں کے لیے ممبری فیس ایک ہزار روپے سیکورٹی کے علاوہ 100 روپیہ سالانہ ہے جب کہ طالب علم کے لیے اسکول، کالج یا یونیورسٹی کے تصدیق نامہ کے ساتھ 50 فیصد رعایت دی جاتی ہے۔ مسٹر سفیان نے مزید بتایا کہ چونکہ یہاں مخصوص زبان کی بڑی تعداد میں کتابیں موجود ہیں اس لیے دہلی میں مختلف زبانوں کے طالب علم بطور خاص یہاں استفادہ کے لیے آتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اگست 2013

اردو وراثت کارواں کا اردو والوں کو استقبالیہ

نئی دہلی: اردو وراثت کارواں کامیابی کی ڈگر پر چل نکلا ہے۔ کارواں کی جانب سے دیش، دنیا کے اردو قلمکاروں کو دیا گیا استقبالیہ خوش آئند ہے اور میری نیک خواہشات اردو والوں کے ساتھ ہیں۔ ان خیالات کا اظہار کانگریس پارٹی کے جنرل سکریٹری دگ وجے سنگھ نے آئیڈیا کمیونی کیشنز کی جانب سے اردو وراثت کارواں کے بینر تلے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر میں ایک استقبالیہ تقریب سے کیا۔ اس موقعے پر کارواں کے قومی کنوینر اور ڈی ڈی اردو کے مشیر آصف اعظمی نے تعارفی کلمات میں کہا کہ قومی اردو کونسل کی عالمی کانفرنس کی سائڈ لائن پر دیا گیا یہ استقبالیہ دراصل ان تمام اردو قلمکاروں و شاعروں کو اعزاز دینا ہے، جو کانفرنس میں شرکت کرنے کے لیے دنیا بھر سے آئے ہیں۔ کارواں کے سینئر رکن اور پرنسپل انکم ٹیکس کمشنر سید محمد اشرف نے استقبالیہ کلمات پیش کیے، جب کہ تقریب کی صدارت جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے کی۔ اس موقعے پر خواجہ معین الدین چشتی یونیورسٹی کے وائس چانسلر انیس انصاری، ممبر کیٹ کیشو چندرا، اردو کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر وسیم بریلوی، ڈائرکٹر خواجہ اکرام الدین، انجمن اسلام ممبئی کے صدر ظہیر قاضی، مجید میمن ایڈوکیٹ، کانگریس پارٹی کے ترجمان م افضل، پروفیسر فاروق، حسیب احمد، ڈی ایم سی کے چیئرمین صفدر ایچ خان، سابق وزیر یوپی ڈاکٹر معراج الدین، ایچ آر خان سہیل ایڈوکیٹ، عزیز نبیل، جے شنکر گپتا، انور جمال، احسن مستقیمی، اطہر فاروقی، مظفر ابدالی، رما پانڈے، گوہر رضا، اخبار مشرق کے مدیراعلی وسیم الحق، روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' کے ایڈیٹر سید فیصل علی، روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر شکیل شمسی، روزنامہ 'صحافت' کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر حسن شجاع روزنامہ جدید خبر کے ایڈیٹر معصوم مرادآبادی، روزنامہ 'اعتماد' کے نسیم عارفی، سینئر صحافی ظفر آغا، ایم اے عالمگیر، سید خرم رضا، حبیب اختر، انجم عثمانی، رئیس صدیقی، مرزا جاوید علی، طارق صدیقی، شیخ علیم الدین اسعدی، شکیل انصاری، راشد حامدی، رئیس ادریسی، طارق فیضی وغیرہ کے علاوہ کثیر تعداد میں محبان اردو موجود تھے۔

جسٹس کاٹجو کو شال پیش کرکے استقبال کرتے ہوئے دگ وجے سنگھ، ساتھ میں صفدر ایچ خان اور آصف اعظمی

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 ستمبر 2013

گوالیار میں ندا فاضلی کے ساتھ ایک ملاقات

گوالیار/نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے زیراہتمام 'ادیب سے ملاقات' پروگرام کا انعقاد آئی ٹی ایم یونیورسٹی، گوالیار کے رام منوہر لوہیا آڈیٹوریم میں کیا گیا جس میں اردو کے ممتاز شاعر پدم شری ندا فاضلی نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں اکادمی کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے گلدستہ پیش کیا اور تعارف پیش کرتے ہوئے کہا کہ ندا فاضلی فصل آگیں لفظوں کے شاعر ہیں اور ہر لفظ سے وہ انسانیت کی فصل اگاتے ہیں۔ ندا فاضلی نے اس موقعے پر اپنی زندگی اور اپنے شعری سفر کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ میری زندگی شاعری ہے اور شاعری ہی میری زندگی ہے۔ انھوں نے گوالیار جہاں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی اور جہاں زندگی کے قیمتی لمحے گزارے، کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ گوالیار کا ایک نام محبت بھی ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ایک دور تھا جب الفاظ کو بہت اہمیت حاصل تھی لیکن آج کے معاشرے میں الفاظ کو آخری قطار میں لاکھڑا کردیا گیا۔ لفظوں سے ان کے معنی ومفہوم سلب کرلیے گئے ہیں۔ آخر میں ندا فاضلی نے اپنی کئی غزلوں، نظموں، گیت اور دوہے سے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس موقعے پر گوالیار شہر اور قرب وجوار کے ادیب و شاعر، دانشور اور آئی ٹی ایم یونیورسٹی کے پروفیسرس اور طلبا وطالبات موجود تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 5 ستمبر 2013

دہلی:

اردو کا استعمال بڑھائیے: شیلا دیکشت

نئی دہلی: وزیراعلیٰ شیلا دیکشت نے اردو اکادمی کے ذریعے منعقد اردو تعلیمی مراکز کی سالانہ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس زبان کو پڑھانے والوں کا اعزازیہ 1500 روپے سے بڑھا کر 2000 روپے کیا جائے گا اور اول آنے والے بچوں کو بھی انعام کی رقم 500 روپے سے بڑھا کر 1000 روپے کی جائے گی۔ اس موقعے پر لسانی امور کی وزیر کرن والیہ، محکمہ کے سکریٹری

سجن سنگھ یادو، اردو اکادمی کے وائس چیئرمین اختر الواسع، اکادمی کے سکریٹری انیس اعظمی اور تعلیمی مراکز کے کنوینر معصوم مرادآبادی بھی موجود تھے۔ وزیر اعلیٰ نے نمایاں کارکردگی کے لیے 46 اردو ٹیچروں کو1500-1500 روپے کے انعامات اور 90 اول آنے والے بچوں کو 500-500 روپے کے انعامات دیے۔ انھوں نے کہا کہ ریاستی حکومت نے اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ دیا ہے۔ وزیر اعلیٰ نے کہا کہ اردو اکادمی کے ذریعہ تعینات کیے گئے ٹیچروں کی تنخواہ گیارہ ہزار روپے سے بڑھا کر 24000 روپے ماہانہ کردی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی زمانے میں اردو دہلی میں عام لوگوں کی زبان تھی۔ اردو کو کسی مذہب کے ساتھ نہیں جوڑا جاسکتا ہے۔ یہ ہماری مشترکہ تہذیب کی شناخت ہے اور اس میں ہندستان کی مہک محسوس کی جاسکتی ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ دہلی حکومت اردو کو فروغ دینے کے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑے گی۔

روزنامہ 'جدید میل' دہلی، 22 اگست 2013

اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے 'سی ٹیٹ' کی لازمیت ختم

نئی دهلی: دہلی کی وزیر برائے فن، ثقافت والسنہ پروفیسر کرن والیہ نے انتہائی اہم اعلان کرتے ہوئے کہا کہ دہلی سرکار نے اردو اساتذہ کی تقرری کے لیے 'سی ٹیٹ' امتحان کی شرط کو ختم کردیا ہے تاکہ اردو اساتذہ کی تقرریوں میں پیدا رکاوٹ کو دور کیا جاسکے۔ انھوں نے یہ بات اردو اکادمی دہلی کی جانب سے ایوان غالب میں مشاعرہ جشن آزادی کا افتتاح کرتے ہوئے کہی۔ پروفیسر کرن والیہ نے مزید کہا کہ دہلی سرکار اس تعلق سے جلد ہی ایک اشتہار شائع کرا کے اطلاع دے گی۔ انھوں نے کہا کہ وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت کی قیادت میں دہلی سرکار اردو کے فروغ کے لیے ہر ممکن کوشش کررہی ہے اور اکادمی کے بجٹ کو بڑھا کر پونے 11 کروڑ روپے کردیا گیا ہے۔ دہلی کے وزیر توانائی ہارون یوسف نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمارے شعرا ملک کے سیکولر کردار اور اقدار کے تحفظ کے لیے کمربستہ ہوجائیں اور اپنی شاعری سے عوام کو مذہبی رواداری، اتحاد، قومی یکجہتی اور بھائی چارہ کا پیغام دیں۔ اردو اکادمی کے وائس چیئرمین پروفیسر اختر الواسع نے خیر مقدمی کلمات ادا کرتے ہوئے کہا کہ ہم مقدار سے زیادہ معیار کے حامی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس مشاعرے کو شہید صحافی مولوی محمد باقر کے نام سے منسوب کرنا چاہیں گے کیونکہ وہ اردو کے پہلے صحافی اور ادیب تھے جنھوں نے ملک کی آزادی کے لیے سب سے پہلے جام شہادت نوش کیا۔ انھوں نے وزیر اعلیٰ شیلا دیکشت اور وزیر ہارون یوسف کے اردو اکادمی کے ساتھ تعاون کا شکریہ ادا کیا جن کی وجہ سے اکادمی اپنا ایک معیار اور وقار قائم کرسکی۔ سکریٹری انیس اعظمی نے اکادمی کی کارکردگی پر روشنی ڈالی اور اظہار تشکر کیا۔ بعد ازاں مشاعرہ کا آغاز ہوا جس کی نظامت کے فرائض نوجوان شاعر شکیل جمال نے انجام دیے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 18 اگست 2013

آندھرا پردیش :

انٹرنیٹ فروغ تعلیم و روزگار کے مواقع

نظام آباد: موجود دور انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور ہے۔ اور کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے غلبے والے اس دور میں عصر حاضر کے نوجوان انٹرنیٹ کے مناسب استعمال سے تعلیم، روزگار اور صحافت کسی بھی شعبے میں موجود دستیاب مواقع سے بھرپور استفادہ کرسکتے ہیں۔ انٹرنیٹ معلومات کا ایک وسیع جال ہے۔ جو دنیا بھر کے کمپیوٹروں سے باہم مربوط نظام کے تحت کام کرتا ہے۔ آج اردو زبان بھی انٹرنیٹ کے عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہورہی ہے۔ ان خیالات کا اظہار ریاض سعودی عرب سے آئے ماہر کمپیوٹر، انجینئر، ایڈیٹر تعمیر ای پیپر اور اردو کامک کے بانی مکرم نیاز نے اردو ہال مرکز اردو اکیڈیمی نظام آباد میں اردو اسکالرس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام منعقدہ خصوصی لیکچر سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ 'انٹرنیٹ فروغ تعلیم و روزگار کے مواقع کا ذریعہ اور انٹرنیٹ سے اردو صحافت کے فروغ' موضوع پر خطاب کرتے ہوئے مکرم نیاز نے کہا کہ ساری دنیا میں انٹرنیٹ کا نظام یونی کوڈ کے تحت کام کررہا ہے۔ جس کے لیے ہر لفظ یا تصویر کو ایک مخصوص کوڈ دیا جاتا ہے۔ جسے سرچ انجن میں تلاش کرنے سے اس مواد تک باآسانی رسائی ممکن ہے۔ آج ان پیج کے ذریعے جو کام ہورہا ہے وہ تصویری کام ہے جو سرچ انجن میں تلاش کرنے سے نہیں ملتا۔ انھوں نے مثال دے کر کہا کہ سچر کمیٹی سفارشات کی رپورٹ اردو میں گوگل میں دستیاب نہیں ہے۔ جب کہ انگریزی میں سرچ کرنے پر انگریزی میں ملتی ہے۔ اسی طرح دنیا بھر میں جو اخبارات امیج فائل میں کام کررہے ہیں اور نیٹ پر ہیں ان کے ماضی کے دو تین مہینے کے اخبار ہی نیٹ پر دستیاب ہیں۔ اس کے بعد کوئی اہم خبر یا اطلاع سرچ کرنے پر نہیں ملتی۔ جب کہ یونی کوڈ میں کیا ہوا کام سرچ کی مدد سے کبھی بھی دنیا کے کسی حصے میں مل جاتا ہے۔ اس کے لیے اردو اخبارات اور اردو میں کام کرنے والوں کو یونی کوڈ میں کام کرنا چاہیے تاکہ ان کا کام انٹرنیٹ میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہوجائے اور تلاش کرنے پر مل سکے۔ آج اردو کے قدیم سرمائے کو یونی کوڈ کے ذریعے بدلنے کا کام ساری دنیا میں ہورہا ہے۔ انھوں نے اردو صحافیوں کو مشورہ دیا کہ وہ انٹرنیٹ کے عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں اور اپنے بلاگ بنا کر اپنی معلومات کمپیوٹر پر محفوظ کریں اور آن لائن خدمات پیش کرتے ہوئے روزگار بھی حاصل کرسکتا ہے۔

مکرم نیاز نے بعد میں اجلاس میں موجود اردو صحافیوں سید اسد ایڈیٹر آج کا تلنگانہ، سید یٰسین علی ایڈیٹر انوار دکن، امیر علی، خالد خان، شفیع سلمان، عامر جابری، مجید عارف نظام آبادی، اردو اسکالرس اور حاضرین سے ملاقات کرتے ہوئے انھیں مفید مشورے دیے۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی سرپرست بزم نے اردو اسکالرس اسوسی ایشن کی اب تک ہوئی کارگذاری بیان کی اور تمام اسکالرس اور گریجویٹ طلبا سے خواہش کی کہ وہ اعلیٰ تعلیم کے فروغ کے لیے شروع کردہ کتب خانے سے TET,NET,APPSCE کی کتابوں سے استفادہ کریں۔ سرپرست بزم ڈاکٹر محمد ناظم علی نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ کمپیوٹر کا اشارہ ماضی میں جمشید بادشاہ کے جام جمشید سے ملتا ہے۔ آج کے دور میں وہی انسان ترقی کرسکتا ہے جو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔ اجلاس میں شرکت کے لیے آئے صحافی سید اسد ایڈیٹر آج کا تلنگانہ نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ شہر نظام آباد سے وہ اردو کا پہلا ضلعی سطح کا ای پیپر آج کا تلنگانہ کے نام سے دو سال سے نکال رہے ہیں اس کے لیے مالیہ کی فراہمی اور اشتہارات کا حصول اور انٹرنیٹ کے اخراجات کی پابجائی اہم مسائل ہیں انھوں نے مکرم نیاز سے کہا کہ وہ آج کا تلنگانہ کو ای پیپر میں تبدیل کرنے کے لیے آگے آئیں تاکہ ان کے اخبارات کی خبریں گوگل سرچ کا حصہ بن جائیں۔ جناب جمیل نظام آبادی نے صدارتی خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج دنیا بھر سے تقاضے ہورہے ہیں کہ ان کی ادارت میں نکلنے والے رسالہ گونج کو انٹرنیٹ پر پیش کیا جائے۔ جس کی وہ کوشش کریں گے۔ انھوں نے اردو اسکالرس ایسوسی ایشن کے تحت ہورہے فروغ تعلیم کی ستائش کی۔ اجلاس میں جناب مکرم نیاز اور سید اسد کی شال پوشی کی گئی۔ اجلاس کی کاروائی محمد عبدالبصیر لیکچررا پی آر جے سی ناگارام نے چلائی۔ ایم اے عزیز سہیل نے انتظامات کی نگرانی کی۔ ڈاکٹر محمد اسلم فاروقی کے شکریہ پر اجلاس ختم ہوا۔

پریس ریلیز، ڈاکٹر اسلم فاروقی، نظام آباد، 25 اگست 2013

اتر پردیش:

انٹرنیشنل اردو کانفرنس کی کامیابی پرحسن آرٹ ٹرسٹ کا اظہارِ مسرت

امروہہ: ہندوستانی دارالحکومت دہلی میں منعقدہ سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس سے بین الاقوامی سطح پر اردو زبان کے فروغ کو وسعت حاصل ہوگی، اس کانفرنس سے جہاں ہندوستانی مشترکہ تہذیب کی علامت اردو زبان کو

عالمی پیانے پر فروغ حاصل ہوگا وہی اس کانفرنس کے بعد ہندوستانی تہذیب کو بھی تقویت ملے گی۔ ان خیالات کا اظہار قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے دہلی میں منعقدہ سہ روزہ عالمی اردو کانفرنس کے کامیاب انعقاد پر پدم شری ڈاکٹر محسن ولی نے گل مہر ہال لودھی روڈ میں کیا، جہاں حسن آرٹ ٹرسٹ کی جانب سے این سی پی یو ایل کے منتظمین بالخصوص پروفیسر خواجہ اکرام الدین ڈائرکٹر (قومی اردو کونسل)، پروفیسر وسیم بریلوی وائس چیئرمین قومی اردو کونسل، وایچ آرڈی کے وزیر جتن پرساد کو اس کامیابی کے لیے مبارکباد پیش کی گئی۔ اس سلسلہ میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے ٹرسٹ کے چیف پیٹرن ڈاکٹر محسن ولی نے کہا کہ اردو زبان دنیا بھر میں بولی جانے والی تمام زبانوں میں اپنی ممتاز شناخت رکھتی ہے، ہر مکتب فکر و ہر ملک کے عظیم دانشور نے اردو زبان کا علم حاصل کیا ہے ور آج بھی کئی انگریز دانشور اردو زبان بول رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں لکھ رہے ہیں۔ ایسے میں ضرورت اس بات کی تھی کہ عالمی پیانے پر ایسی کانفرنس کا انعقاد ہو جہاں دنیا بھر کے ممتاز ادیب، محقق دانشور، فنکار جمع ہو سکیں اور اردو زبان کی فلاح وترقی کی بات کر سکیں، اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے وزیر مملکت جتن پرساد، پروفیسر خواجہ اکرام، ممتاز شاعر وسیم بریلوی نے اردو زبان کی ایسی کانفرنس کا انعقاد کیا جس کی شہرت نہ صرف برصغیر بلکہ پوری عالمی اردو برادری میں ہورہی ہے۔ عالمی مرثیہ سینٹر کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم امروہوی نے کہا کہ کونسل اردو زبان کے لیے جو خدمات انجام دے رہی ہے وہ قابل قدر ہے۔ ٹرسٹ کے صدر ظہیر زیدی، آل انڈیا مومن کانفرنس کے ریاستی صدر حسن عارف انصاری، جنرل سکریٹری حیدر کمال، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر محمد علی، معروف کارڈیولوجسٹ ڈاکٹر ایس ایم کاظم، شاعر سلیم امروہی، ڈاکٹر نسیم الحق، بیگم نکہت اقبال، ڈاکٹر نجمہ کوثر، پروفیسر معراج السلام الہ آباد وغیرہ نے بھی اس سلسلے میں خیالات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 8 ستمبر 2013

تحریک آزادی اور اردو

اعظم گڑھ: اردو پریس کلب پہاڑ پور میں ہوئی نشست میں اردو کی خدمات اور قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے پریس کلب کے صدر قاضی محمد ارشاد نے کہا کہ تاریخ شاہد ہے کہ اس تحریک میں اردو صحافیوں، اردو اخبارات، شعرا اور دانشوروں نے ملک کو بیدار کیا اور تحریک میں شامل ہوکر آزادی کے خواب کو حقیقت میں تبدیل کر دیا تھا، اردو کے معروف صحافی مولوی محمد باقر کو انگریزوں نے شہید کر دیا، الہلال، البلاغ اور کئی اردو اخبارات انگریزوں کے عتاب کا نشانہ بنے۔ پریس کلب کے نائب صدر خواجہ شعیب (شبو) نے اردو کی قومی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اردو زبان نے وطن عزیز کو غلامی سے نجات دلانے کے لیے کس قدر قربانیاں دیں، اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 اگست 2013

اردو کا فروغ اپنے گھروں سے شروع کریں

شاملی: انجمن فروغ اردو ادب کے صدر شاہ رضا نے کہا ہے کہ مرکزی اور ریاستی سرکار اردو کو روزی روٹی سے جوڑنے کے لیے کیا اقدامات کرتی ہیں، اس سے پہلے یہ دیکھیے کہ ہم خود اس زبان کی آبیاری اور نشاۃ ثانیہ کے لیے کیا کر رہے ہیں۔ کیا ہم نے اردو کو اپنے گھروں میں زندہ رکھا اور کیا ہم اپنی نجی زندگی میں اردو کا استعمال کر رہے ہیں، شاہ رضا نے پریس کو جاری بیان میں کہا کہ ابھی ربع صدی پہلے کی بات ہے جب یہاں بڑی تعداد میں اردو کے اہل علم تھے، قصائد، غزل گوئی اور شعر گوئی کا فن عروج پر تھا، مشیر جھنجھانوی اور مظفر رزمی کیرانوی جیسے بلند پایہ اور ممتاز شعرا اسی دیار میں ہوئے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ پہلے تعلیم بالغان کا نظم تھا مگر اب وہ بھی نہیں رہ گیا ہے، نسل نو اردو سے نابلد ہوتی جارہی ہے اور ہم محو خواب ہیں، شاید اس انتظار میں ہیں کہ حکومت ہی ہمیں آکر اردو سکھائے گی۔ ہمیں خود اردو کے فروغ واشاعت کی کوشش کرنی چاہیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اگست 2013

بزرگوں کا احترام کرنا ہماری تہذیب کی شناخت: پروفیسر وسیم بریلوی

بریلی: مقامی ادبی تنظیم بزم میر و غالب کی جانب سے عید ملن، یوم آزادی اور بزرگ شاعر شاد بریلوی کے

جشن میں ایک مشاعرہ کا انعقاد کیا گیا۔ روٹری بھون میں عالمی شہرت یافتہ پروفیسر وسیم بریلوی کی سرپرستی میں منعقد کیے گئے اس پروگرام کا آغاز عقیل نعمانی نے شمع روشن کرکے کیا۔ اس موقعے پر اظہار خیال کرتے ہوئے وسیم بریلوی نے کہا کہ بزرگوں کا احترام کرنا اور ان کی عظمتوں کا اعتراف کرنا ہماری تہذیب کی شناخت رہی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اہل بریلی نے شاد بریلوی کے جشن کا انعقاد کرکے نہ صرف اپنے ادبی ذوق کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ ہم نے اپنی ادبی خدمات کو مزید بہتر کیا ہے۔ اس موقعے پر عقیل نعمانی، ڈاکٹر تابش سنبھلی، نکہت امروہوی، عادل رام پوری، خوشبو رامپوری، چمن ہیروی، شکیل تاہری، شگفتہ، تصور بدایونی، صدف مرادآبادی، خالد ندیم بدایونی، حلیم سیتھلی، وقار حیدر زیدی، ثروت پرویز، انور وارثی، شباب کاس گنجوی، سعید بریلوی، تحفہ بریلوی، مہرالنساء پیلی بھیتی، حنا زیدی بدایونی نے اپنے کلام پیش کیے۔ مشاعرہ کی صدارت فرید اختر شمسی اور نظامت اسرار نسیمی نے کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اگست 2013

مولوی عبدالحق کی خدمات پر سیمینار

فیروزآباد: انجمن ترقی اردو ہند شاخ فیروزآباد کے زیراہتمام ایک سیمینار بابائے اردو مولوی عبدالحق کے

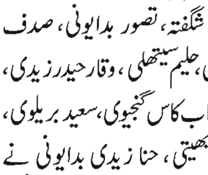

یوم وفات کے موقعے پر الہدیٰ ماڈل اسکول میں منعقد کیا گیا، جس میں مولوی عبدالحق کی اردو کے لیے کی گئی خدمات کا ذکر کیا گیا، سیمینار کی صدارت اسلامیہ انٹر کالج کے سابق صدر مدرس اور انجمن ترقی اردو ہند شاخ فیروزآباد کے صدر سید مطلوب حسین

نے کی۔ سید مطلوب حسین نے کہا کہ کسی بھی زبان کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس کے الفاظ کی حفاظت کی جائے، اردو زبان میں سیکڑوں الفاظ دیگر زبانوں سے شامل کیے گئے، کچھ الفاظ کے لغوی معنی جو بھی رہے، لیکن بعد میں ان کا استعمال دیگر معنی میں کیا جانے لگا، ایسے الفاظ کی اگر حفاظت نہ کی جائے تو زبان کی تنزلی یقینی ہے، بابائے اردو نے اردو زبان کی بقا کے لیے ایسے الفاظ کی حفاظت کرتے ہوئے اردو لغت مرتب کی اور تاعمر اردو کی خدمت کرتے رہے۔ کامنی اردو مرکز کے صدر میاں بصارالدین نے اس موقعے پر بابائے اردو کے حالات زندگی پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی سے 1984 میں بی اے کیا تھا، اس وقت ان کے ہم عصروں میں علامہ شبلی نعمانی، سر سید احمد خاں، راس مسعود، جسٹس محمود، محسن الملک وغیرہ ہوا کرتے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اگست 2013

حسرت موہانی مکمل آزادی کے پہلے علم بردار

سہارنپور: 9 اگست 1942 کو انگریزو بھارت چھوڑو کی یاد میں بیوپار پرتی ندھی منڈل کی طرف سے اتم ہیریٹیج ہوٹل میں ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا جس میں تمام مذاہب کے سرکردہ حضرات نے شرکت کی۔

اس موقعے پر جمعیۃ علما کے شہر صدر مولانا فرید مظاہری نے کہا کہ مولانا حسرت موہانی ایسے پہلے مجاہد آزادی تھے جنھوں نے ہندوستان کی مکمل آزادی کا اعلان کیا تھا اور انگریزوں کو ملک چھوڑنے کا انتباہ دیا تھا۔ پدم شری بھارت بھوشن نے شہید بھگت سنگھ کے ساتھ اشفاق اللہ شہید اور بسمل شاہجہاں پوری شہید کی بے مثال دوستی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ تمام ہندو اور مسلمانوں کو آپس میں اسی طرح دوست بن کر رہنا چاہیے اور ملک کو مضبوط بنانا چاہیے۔ بیوپار منڈل کے شیتل ٹنڈن نے کہا کہ آپسی بھائی چارہ اور مذہبی رواداری ہماری مشترکہ وراثت اور ہماری قدیم روایت ہے۔ قادر دانیال، ہیڈ گرنتھی سردار ویر سنگھ نے کہا کہ جس طرح ہم نے مل کر آزادی کی جنگ لڑی ہے اسی طرح ہمیں ملک کی ترقی میں بھی مل کر حصہ لینا چاہیے۔ بیوپار منڈل کے مہیش نارنگ نے اشعار کے ذریعے اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اگست 2013

اتراکھنڈ:

عبدالحمید پر فلم بنانے کی تیاری

ہردوئی: ضلع کے پہانی قصبہ میں بنیادی تعلیم حاصل کرنے والے فلم ہدایت کار شجاع علی نے روزنامہ انقلاب کے لیے خصوصی معلومات فراہم کرتے ہوئے بتایا کہ وہ شہید ویر عبدالحمید کی زندگی پر فلم بنانے کی تیاری میں ہیں۔ عنقریب ہی فلم فلور پر جائے گی۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہندی سنیما کے سو برس مکمل ہونے کے بعد آج بھی فلم انڈسٹری میں اتنے عظیم ہیرو کو نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس لیے ویر عبدالحمید کی بیوہ رسولن بیوی نے انھیں اس کی تحریری اجازت دیتے ہوئے ویر عبدالحمید پر فلم بنانے کی تیاری کرنے کو کہا ہے۔ شجاع کے مطابق، رسولن بیوی کی خواہش ہے کہ ویر عبدالحمید پر فلم شجاع علی ہی بنائیں۔ انھوں نے بتایا کہ ویر عبدالحمید سے ان کے رشتے اس لیے بھی مزید جذباتی ہیں کہ ان کا اور عبدالحمید کا آبائی وطن غازی آباد ہی ہے۔ آج انھیں موقع ملا ہے کہ جنگ آزادی کے اس عظیم ہیرو کی داستان کو پردۂ سیمیں پر اتاریں۔ انھوں نے ایک سوال کے جواب میں کہا کہ اردو کے بغیر ہندی سنیما کا تصور بھی ناممکن ہے۔ جتنے بھی ہٹ گیت ہیں، بیشتر اردو زبان کے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہندی سنیما اردو سے نزدیک اور ہندی سے دور ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اگست 2013

بنگلور:

محفل نساء کی پہلی سالگرہ تقریب

بنگلور: ریاست کرناٹک کی انجمن محفل نساء کی پہلی سالگرہ تقریب نیناہال کنڑا بھون میں منعقد ہوئی۔ اس موقعے پر محفل نساء کی جانب سے شائع کردہ مجلّہ 'میراث' کی رسم رونمائی کرناٹک اردو اکادمی و شعبہ اردو بنگلور یونیورسٹی کے سابق چیئرمین پروفیسر م ن سعید کے ہاتھوں عمل میں آئی۔ سالگرہ و تقریب کی مہمان خصوصی ڈاکٹر امینہ تحسین نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج بھی ہمارے ملک کی خواتین کو کئی طرح کے مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور ان مسائل کے حل کے لیے سب سے پہلے ہمیں ملک کی خواتین کو اور خصوصاً مسلم خواتین کو باشعور بنانا ہوگا۔ اُس سلسلے میں محفل نساء جیسی تنظیمیں جو ایک ٹھوس مقصد اور عزم کے ساتھ کام کر رہی ہیں۔ انھیں اس سلسلے میں اپنی جدوجہد جاری رکھنی ہوگی۔ پروفیسر م ن سعید نے مجلّہ 'میراث' کے اجرا کے بعد اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے اس انجمن کی ستائش کی اور کہا کہ یہ اپنی نوعیت کی ایک انوکھی انجمن ہے جس میں ملت کی دانشور خواتین سرگرم عمل ہیں اور ادارہ کے اغراض و مقاصد بھی قابل تعریف و قابل تقلید ہیں۔'' اردو سیکھیں اور سکھائیں پروگرام کے ذریعے گھریلو خواتین کو اردو سکھانا اور ان تربیت یافتہ خواتین کے کندھوں پر کم از کم 5 دیگر خواتین کو اردو سکھانے کی ذمے داری عائد کرنا واقعی ایک بڑا پروگرام ہے۔ محفل نسائی کی صدر محترمہ شائستہ یوسف نے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سماج کسی پہاڑ پر پنجرے میں بند چڑیا کا نام نہیں جو ہوا میں کہیں معلق ہے۔ بلکہ سماج جیتے جاگتے باشعور انسانوں کی تشکیل ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو سیکھیں اور سکھائیں کی جو تحریک ان کی انجمن نے شروع کی ہے وہ صرف محفل نسا کی نہیں بلکہ پوری قوم کی ضرورت ہے اور وقت کی اہم آواز ہے۔ محترمہ حلیمہ فردوس نے مہمانوں کا تعارف کروایا۔ ڈاکٹر ماہ نور زمانی نے محفل نسا کی ایک سالہ کارگزاریوں کی رپورٹ پیش کی۔ محترمہ فریدہ رحمت اللہ نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔

روزنامہ 'سالار'، بنگلور، 25 اگست 2013

جھارکھنڈ:

انجمن ترقی اردو گریڈیہہ شاخ کی ایک نشست

گریڈیہہ: انجمن ترقی اردو گریڈیہہ شاخ کی ایک اہم نشست مورخہ یکم ستمبر 2013 کو حاجی ممتاز علی کی صدارت میں ہوئی۔ کئی اہم ایجنڈے اس نشست کے لیے سید علی عباس، سکریٹری انجمن نے تیار کر رکھے تھے جس میں گزشتہ نشست میں کی گئی کارروائی اور کیے گئے فیصلوں کی تصدیق و توثیق، سابق صدر انجمن نہال آتش مرحوم کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لیے دو منٹ کی خاموشی اختیار کی گئی۔ سکریٹری کے ذریعے اس بات پر زور دیا گیا کہ بلاک سطح پر اردو کی بیداری کے لیے ٹھوس قدم اٹھانا بہت ضروری ہے۔ سکریٹری کے ذریعہ ایک اہم ایجنڈا یہ رکھا گیا کہ ایسے علاقے جہاں اردو داں طبقہ اور مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں آنگن باڑی مراکز میں اردو کی پڑھائی جلد از جلد شروع کی جائے۔ جناب عباس نے یہ بھی کہا کہ اگر حکومت کی جانب سے اس پر جلد ہی کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا تو ہمیں اس سلسلے میں خود ہی کوئی قدم اٹھانا ہوگا تا کہ حکومت کا دھیان اس جانب مبذول ہو سکے۔

پریس ریلیز: سید علی عباس، سکریٹری انجمن ترقی اردو، گریڈیہہ، 5 ستمبر 2013

اعزاز و اکرام:

پروفیسر ذکرالرحمٰن اور پروفیسر قمر غفار

نئی دہلی: عربی زبان وادب اور تہذیب وثقافت کو بین الاقوامی سطح پر فروغ دینے اور ہندوستان میں عربی ثقافت کی پائیدار خدمات کے لیے ہندوعرب ثقافتی مرکز جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈائرکٹر پروفیسر ذکرالرحمٰن کو عربی

زبان وادب کی خدمات کے اعتراف میں سابق شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ اور بیدل انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کے فاؤنڈر جنرل سکریٹری پروفیسر قمر غفار کو یوم آزادی کی تقریب میں صدر جمہوریہ ہند نے صدارتی ایوارڈ کے لیے ان کے ناموں کا اعلان کیا۔ پروفیسر ذکرالرحمٰن نے ہندوعرب ثقافت پر ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ وہ فلسطین میں سابق سفارت کار ہونے کے ساتھ عرب دنیا میں ہندوستان کے اہم ترین عربی عالم مانے جاتے ہیں۔ انھوں نے 23 ہندوستانی مصنّفین اور ادبا کے عربی ترجمہ اور تصنیفات کی سرپرستی کی ہے، جس میں نوبل ایوارڈ یافتہ امرتیہ سین کی اہم کتاب شامل ہے۔ وہ ثقافۃ الہند نامی ایک پندرہ روزہ میگزین کے مدیر بھی ہیں۔ انھوں نے اس موقعے پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ ہمارے لیے مزید حوصلہ بخش ثابت ہوگا اور ہم ہندوعرب ثقافت اور عربی زبان وادب کے فروغ کے لیے مزید کوششیں جاری رکھیں گے۔ شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سابق صدر اور بیدل انٹرنیشنل فاؤنڈیشن کی جنرل سکریٹری قمر غفار فارسی کی معروف ادیبہ ہیں۔ انھوں نے 19 سالوں تک شعبہ فارسی میں صدارت کے فرائض انجام دیے ہیں۔ ان کی چھ مشہور کتابوں میں 'ابوریحان البیرونی' مثنوی عاشق و معشوق، اڑائے کچھ ورق، شکر ہند ہیں۔ انھوں نے کئی پروجیکٹ پر کام بھی کیا، جس میں خدا بخش لائبریری پٹنہ سے 'حیرت نامہ سفرا' اور یوجی سی کے پروجیکٹ غزالی مشہدی کی کلیات کا پروجیکٹ نمایاں کام کیا ہے۔ ان کی زیرنگرانی اب تک 13 ریسرچ اسکالرز نے پی ایچ ڈی کیے ہیں۔ انھیں ایران کلچر ہاؤس کی طرف سے البیرونی اور فارسی ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 18 اگست 2013

تقی عابدی کو اعجاز حسین ایوارڈ

الہ آباد: ادب وتحقیق پر مشتمل 37 کتابوں کے مصنف مجاہد ادب ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے 'پروفیسر اعجاز حسین' کے اعزاز یہ تقریب میں تقریباً 60 منٹ فیض احمد فیض کی شاعری اور شخصیت پر یادگاری خطبہ دیا۔ ہوٹل ولاس سول لائنس میں اراکین ادبی انجمن کارواں کی جانب سے منعقد پروگرام کی صدارت خواجہ معین الدین چشتی لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر انیس انصاری نے کی۔ خصوصی مہمان کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر تقی عابدی (کناڈا) نے اپنے بلیغ خطاب میں کہا کہ فیض 21ویں صدی کے سب سے بڑے شاعر تھے، ان کا لہجہ سب سے منفرد تھا، انھوں نے اپنی شاعری میں جس لہجے کا استعمال

الہ آباد: ڈاکٹر تقی عابدی کو پروفیسر اعجاز حسین ایوارڈ 2013 سے نوازتے ہوئے

کیا ہے اسے آپ جدید لب و لہجے کا نام دے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر تقی نے کہا جیسے غالب کے قد سے سارے شاعر نیچے تھے ویسے ہی فیض کے قد سے بھی عہد نو میں سارے شاعر نیچے ہیں۔ فیض نے گنگا سے اپنی شاعری کی زمین کو زرخیز کیا ہے۔ انھوں نے اس موقعے پر ترقی پسندی کے حوالے سے بھی گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسندی ختم ہوچکی ہے لیکن تحریک ابھی باقی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر تقی عابدی کو پروفیسر اعجاز حسین ایوارڈ 2013 سے بھی نوازا گیا۔ صدارتی کلمات میں ڈاکٹر انیس انصاری نے کہا کہ ہندوستان کے ہر اس شعر پر بات ہونی چاہیے جنھوں نے ہندوستانی زبان میں کام کیا ہے انھوں نے کہا بیشک اردو کو عروج بام تک پہنچانے میں فیض کا بڑا ہاتھ تھا بیشک فیض ایک بڑے انسان تھے ان کا کردار بہت بڑا تھا لیکن ان کے ساتھ ملک محمد جائسی اور کبیر داس کو یاد بھی کرنا ہمارا فرض ہے۔ اردو کے حوالے سے انھوں نے کہا اردو کی ترقی تبھی ممکن ہے جب ہم اردو کو ٹکنالوجی سے جوڑیں گے۔ اس موقعے پر پروفیسر سید محمد عقیل رضوی، پروفیسر جعفر رضا، پروفیسر علی احمد فاطمی، کامریڈ ضیاء الحق، پروفیسر نوشابہ سردار، پروفیسر صالحہ رشید، ڈاکٹر علی حیدر، ڈاکٹر فخر الکریم، چودھری ابن نصیر، ڈاکٹر قمر عابدی، سبط حسن، سید امین اختر، ڈاکٹر شہنواز عالم اور ڈاکٹر فاضل ہاشمی موجود تھے۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 ستمبر 2013

عالمی یوم اردو ایوارڈ کا اعلان

نئی دہلی: یونائیٹڈ مسلم آف انڈیا (یوایم آئی) اور اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن (یوڈی او) کے زیراہتمام 9 نومبر 2013 عالمی یوم اردو تقریبات کے سلسلے میں ایک میٹنگ سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی اور ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق کے زیرصدارت دہلی میں منعقد ہوئی۔ میٹنگ میں عالمی یوم اردو ایوارڈ 2013 کا اعلان بھی کیا گیا۔ عالمی یوم اردو ایوارڈز کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر جن لوگوں کو ایوارڈ دیے جائیں گے اُن میں محمد عتیق (سکریٹری، مسلم مارواڑ ایجوکیشنل سوسائٹی، جودھپور) کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ، ڈاکٹر سید صادق علی ٹونکی (ایوسی ایٹ پروفیسر، گورنمنٹ کالج ٹونک) کو علامہ اقبال ایوارڈ برائے تحقیق ادب، مسعود الحسن عثمانی (سکریٹری، دینی تعلیمی کونسل اترپردیش لکھنؤ) کو قاضی عدیل عباسی ایوارڈ برائے ملی خدمات، معصوم مرادآبادی (ایڈیٹر روزنامہ جدید خبر) کو محفوظ الرحمٰن ایوارڈ برائے صحافت، زاہد آزاد جھنڈانگری (معروف شاعر اور سوشل ایکٹیوسٹ، نیپال) کو حفیظ میرٹھی ایوارڈ برائے شعری ادب شامل ہیں۔ میٹنگ میں یہ بھی طے پایا کہ یوایم آئی اور یوڈی او کے زیراہتمام اس سال 9 نومبر عالمی یوم اردو کی تقریب دہلی میں منعقد کی جائے گی، جس کا عنوان 'فروغ اردو میں طب یونانی کی خدمات' ہوگا اور حسب سابق عالمی یوم اردو یادگار مجلّہ بھی شائع کیا جائے گا۔ میٹنگ کے اختتام پر سبھی شرکا کا شکریہ عالمی یوم اردو منتظمہ کمیٹی کے کنوینر ڈاکٹر سید احمد خاں نے ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 25 اگست 2013

ڈاکٹر زماں آزردہ

مدراس: 22 اگست 2013 کو شعبہ عربی، فارسی واردو، مدراس یونی ورسٹی کے زیراہتمام ڈاکٹر زماں آزردہ، سابق ڈین فیکلٹی آف آرٹس، کشمیر یونی ورسٹی کے اعزاز میں ایک خصوصی اجلاس منعقد کیا گیا جس میں شہر کے مختلف کالجوں اور دیگر اداروں سے محققین، ادبا واساتذہ نے شرکت کی اور ڈاکٹر زماں آزردہ نے اپنے وسیع تدریسی وتحقیقی تجربات سے وہاں موجود طلبا وسامعین کو مستفید کیا۔ جلسے کی صدارت ڈاکٹر سید سجاد حسین صاحب صدر، شعبہ عربی، فارسی واردو، مدراس یونی ورسٹی نے کی۔ ڈاکٹر سید سجاد حسین صاحب نے مہمانوں کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر زماں آزردہ نے خصوصی خطاب فرمایا۔ اپنے خطاب کے دوران انھوں

نے تخلیقی ادب کی اہمیت واضح کرتے ہوئے کہا کہ تخلیق کار شتہ پہلے قاری سے استوار ہوتا ہے اور نقاد کی حیثیت ایک تیسرے آدمی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ڈاکٹر قدیر ناظم سرگروہ، سابق صدر شعبہ اردو، دھارواڑ یونیورسٹی اور جناب علیم صبا نویدی بطور مہمانان اعزازی شریک رہے۔ اس اجلاس میں ڈاکٹر سید سجاد حسین کی مرتب کردہ کتاب 'اسم محمدؐ'، جناب علیم صبا نویدی کی دو کتابیں 'اردو شاعری میں نئے تجربے' اور 'عرش غزل' کا اجرا ہوا۔ ڈاکٹر قاضی حبیب احمد صاحب، پروفیسر شعبہ عربی، فارسی و اردو نے نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔ بعد ازاں ایک شعری نشست بھی منعقد کی گئی۔

پریس ریلیز: امان اللہ ایم بی یونیورسٹی آف مدراس، چنئی، 6 ستمبر 2013

ساہتیہ اکادمی کے بال ساہتیہ ایوارڈ اور یوا ایوارڈ 2013 کے لیے ناموں کا اعلان

نئی دہلی: ساہتیہ اکادمی کے 'بال ساہتیہ ایوارڈ' اور 'یوا ایوارڈ 2013' کے لیے ناموں کا اعلان کر دیا گیا۔ ان ناموں کا اعلان چنئی میں ساہتیہ اکادمی کی ایگزیکیوٹو بورڈ کی میٹنگ میں کیا گیا جو ساہتیہ اکادمی کے صدر وشوناتھ پرساد تیواری کی صدارت میں منعقد کی گئی تھی۔ میٹنگ میں بچوں کے معروف افسانہ نگار اسد رضا کو ان کی کتاب 'ننھے منوں کی سرکار' (کہانیاں) پر ساہتیہ اکادمی کے 'بال ساہتیہ پرسکار 2013' کے لیے اور جواں سال نقاد معید رشیدی کو ان کی کتاب 'تخلیق، تخیل اور استعارہ' کے

لیے یوا ایوارڈ 2013' منتخب کیا گیا۔ میٹنگ کے بعد ساہتیہ اکادمی کے سکریٹری ڈاکٹر کے ایس راؤ نے ایک پریس کانفرنس میں ان ناموں کا اعلان کیا اور اکادمی کے پروگرام افسر ڈاکٹر مشتاق صدف نے دہلی میں یہ اطلاع دی۔ ذرائع کے مطابق ہندوستان کی 24 زبانوں کے ادیبوں کو ان کی مختلف گراں قدر تصنیفات پر 'بال ساہتیہ ایوارڈ' دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ یہ ایوارڈ ساہتیہ اکادمی کے امتیازی نشان اور 50 ہزار روپے پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ اس سال نومبر میں گوا میں منعقد ہونے والی اکادمی کی ایک پروقار تقریب میں دیے جائیں گے۔ دوسری جانب ساہتیہ اکادمی کی ایگزیکیوٹو بورڈ کی میٹنگ میں 23 ہندوستانی زبانوں کے یوا ایوارڈ 2013 کے لیے بھی ناموں کا اعلان کیا گیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 24 اگست 2013

فیس گروپ کا ایوارڈ ماجد دیوبندی کو

نئی دہلی: فیس گروپ کی جانب سے ہر سال ملک کی نامور شخصیات کو ان کی گراں قدر سماجی، ادبی اور علمی خدمات کے اعتراف میں اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ سال 2013 کے لیے انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر، لودھی روڈ میں ایوارڈ فنکشن کا اہتمام کیا گیا۔ اس تقریب کا اہتمام فیس گروپ کے چیئرمین ڈاکٹر مشتاق اور ان کے رفقا نے کیا تھا۔ اس موقعے پر ملک کے نامور شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی کو

نئی دہلی: شاعر ڈاکٹر ماجد دیوبندی 'ادبی خدمات' کا اعزاز ممبر پارلیمنٹ ظفر علی نقوی اور سراج قریشی سے حاصل کرتے ہوئے

ان کی ادبی اور شعری خدمات کے اعتراف میں سال 2013 کے اعزاز سے نوازا گیا۔ جن اہم شخصیات نے اس تقریب میں شرکت کی ان میں انڈیا اسلامک کلچرل سینٹر کے صدر سراج قریشی، دہلی اقلیتی کمیشن کے چیئرمین صفدر حسین خاں، دہلی کے لیفٹیننٹ گورنر کے او ایس ڈی اے جے چودھری، ممبر پارلیمنٹ ظفر علی نقوی، جسٹس فخر الدین احمد، ڈپٹی اسپیکر دہلی ودھان سبھا امریت سنگھ گوتم، کھادی گرام ادیوگ کے چیئرمین ویریندر سنگھ ڈھنگا وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 ستمبر 2013

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

پٹنہ: اردو کونسل ہند نے جواں سال صحافی، ناقد، محقق اور مولف ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی قابل قدر ادبی خدمات کے پیش نظر ان کے اعزاز میں 23 جون کو ایک پروقار 'محفل اعتراف' کا انعقاد کیا جس میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی بھرپور پذیرائی، قدردانی اور عزت افزائی کی گئی اور ان کی ادبی وصحافتی خدمات کا برملا اعتراف کیا گیا۔ اس محفل میں مرکزی وزیر زراعت جناب طارق انور نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ جواں سال شاعروں و ادیبوں کی عزت افزائی اور ان کی قدردانی کرنے کا جو فیصلہ اردو کونسل ہند

نے کیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ اس موقع پر وزیر موصوف نے ہمایوں اشرف کو 'اردو کونسل ایوارڈ' اور ایک 'سند اعتراف' سے نوازا۔ کونسل کے قومی ناظم اعلیٰ ڈاکٹر اسلم جاوداں نے کہا کہ ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی ادبی خدمات قابل قدر و منزلت ہیں۔ تحقیق، تنقید او رتالیف کے زمرے میں ان کی اب تک چوبیس (24) کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور چھ کتابیں تکمیل کے آخری مرحلے میں ہیں۔ 'محفل اعتراف' کا افتتاح کرتے ہوئے مشہور شاعر و ناقد پروفیسر علیم اللہ حالی نے اردو کونسل ہند کی تحسین کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایک صحت مند روایت کی شروعات ہے جس کو جاری رکھا جانا چاہیے۔ مہمان اعزازی کی حیثیت سے بولتے ہوئے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ فکشن نگار پروفیسر عبدالصمد نے کہا کہ نئے لکھنے والوں کو اردو کونسل کے ذریعہ سراہا جانا بڑی اچھی پہل ہے۔ معروف ناقد و محقق ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے 'ہمایوں اشرف کے ادبی کارناموں پر ایک نظر' کے عنوان سے ایک جامع مقالہ سنا کر انھیں خراج تحسین پیش کی۔ معروف شاعر حسن نواب حسن نے جناب طارق انور کی شان میں ایک معرکۃ الآرا نظم 'عرش سیاست کے ماہ منیر طارق انور' سنائی جب کہ ناشاد اورنگ آبادی نے اپنے قطعات سے محفل کا دل جیتا۔ نامور فکشن نویس شوکت حیات نے کہا کہ اردو کونسل نے جس حسین روایت کی ابتدا کی ہے اسے جاری رکھنا چاہیے۔ معروف صحافی اشرف استھانوی اور جواں سال ادیب و مقرر مولانا نور السلام ندوی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

پریس ریلیز، ہمایوں اشرف، پٹنہ، بہار 28 اگست 2013

اختر آزاد

جمشید پور: 19 ستمبر کو راج بھون (رانچی) میں نئی نسل کے اہم افسانہ نگار و ناول نگار ڈاکٹر اختر آزاد کی

فکشن میں نمایاں کارکردگی کو دیکھتے ہوئے جھارکھنڈ کے

گورنر عزت مآب عالی جناب ڈاکٹر سیّد احمد نے انھیں 'بیسٹ کریٹیو فکشن رائٹر' کے لیے گورنر مومنٹو سے نوازا۔ یہ پہلا موقع ہے جب جھارکھنڈ کے گورنر نے جمشید پور کے ادیب کی اس طرح سے حوصلہ افزائی کی ہے۔ اس موقعے پر اختر آزاد کا ناول 'لیمی نیٹیڈ گرل' (جھارکھنڈ کے قیام کے بعد یہ اردو کا پہلا ناول ہے) کی رسم رونمائی بھی ہوئی۔ اختر آزاد کو گورنر آف جھارکھنڈ سے اتنے بڑے اعزاز کے ملنے پر شہر کے ادب نوازوں میں خوشی کا ماحول ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محمد زکریا۔ پرنسپل کریم سٹی کالج، پروفیسر سیّد احمد شمیم، اسلم بدر، پروفیسر احمد بدر، پروفیسر افسر کاظمی، ڈاکٹر اسلم جمشید پوری، زین رامش، عبدالستار، تنویر اختر رومانی، اشرف علی اشرف، مہتاب انور، سعید فردوسی، ممتاز شارق، منظر کلیم، مہتاب عالم پرویز، نیاز اختر، ڈاکٹر آفاق اختر اصغر امام اشک اور شاکر عظیم آبادی نے اختر آزاد کو مبارک باد سے نوازا۔

رپورٹ: منظر کلیم، 20 اگست 2013

ڈاکٹر راشد اللہ خاں

نئی دھلی: آل انڈیا یونانی طبی کانگریس کے زیر اہتمام سنٹرل کونسل آف انڈین میڈیسن (سی سی آئی ایم) حکومت ہند کے صدر ڈاکٹر راشد اللہ خاں کو ایک شاندار استقبالیہ غالب اکادمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں دیا گیا۔ اس موقع پر اظہار خیال کرنے والوں نے متفقہ طور پر کہا کہ سی سی آئی ایم کے صدر کے منصب پر ایک فعال نوجوان یونانی گریجویٹ کا فائز ہونا طب یونانی کے لیے ہی نہیں تمام دیسی طبوں کے لیے ایک نیک شگون ہے اور ہم امید کرتے ہیں کہ حکیم راشد اللہ خاں کی سربراہی میں یہ ادارہ ملک وقوم کے لیے زیادہ مفید کردار ادا کرسکے گا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر مشتاق احمد، صدر شعبہ یونانی، کیپٹاؤن یونیورسٹی (ساؤتھ افریقہ) و کل ہند صدر آل انڈیا یونانی طبی کانگریس نے کی۔ جلسہ میں بڑی تعداد میں اطبا اور دانشوروں نے شرکت کی۔ خاص طور سے یونانی طبی کانفرنس نے بھی اپنے ادارے کی جانب سے راشد اللہ خان کو مبارکباد پیش کی۔ اس موقعے پر پروفیسر عبدالحق، سید منصور آغا، ڈاکٹر ڈی آر سنگھ نے اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر راشد اللہ خاں نے کہا کہ دیسی طبوں کے مسائل ان کے پیش نظر ہیں۔ حامد علی اختر، مدیر ماہنامہ صلاح کار نے جلسے کی نظامت کی۔ شکریہ حکیم سید احمد خاں (جنرل سکریٹری آل انڈیا یونانی طبی کانگریس) نے ادا کیا۔

پریس ریلیز: محمد عمران قنوجی، پریس سکریٹری، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس، نئی دہلی، 2 ستمبر 2013

غالب اور عہد غالب

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ حامد انصاری کی رہائش گاہ واقع مولانا آزاد روڈ پر غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام شاہد ماہلی، پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی اور رضا حیدر کی مدونہ کتاب 'غالب اور عہد غالب' کی تقریب رسم اجرا میں حامد انصاری نے عہد غالب کو اردو کے حوالے سے روشن دور اور تاریخی لحاظ سے نہایت دردناک ہندوستانی تاریخ کا اہم موڑ ہے بتاتے ہوئے کہا کہ اس دور کو یاد رکھا جانا بے حد ضروری ہے۔ انھوں نے غالب، عہد غالب اور اردو کے فروغ میں غالب انسٹی ٹیوٹ کی خدمات کو سراہا۔ پروگرام میں دہلی ہائی کورٹ کے قائم مقام چیف جسٹس بدر دریز احمد، گلزار دہلوی، سید شاہد مہدی،

نئی دہلی: کتاب کا اجرا کرتے ہوئے حامد انصاری، عزیز قریشی، ڈاکٹر پرویز احمد، شاہد ماہلی اور رضا حیدر

محسنہ قدوائی، اطہر صدیقی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے کارکنان کے علاوہ اہل اردو موجود تھے۔ قبل ازیں پروگرام کی نظامت کرتے ہوئے ڈاکٹر رضا حیدر نے کتاب کی خصوصیات و کمالات پر روشنی ڈالی۔ پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے تمام مہمانوں کا تعارف کرایا، غالب انسٹی ٹیوٹ کی غالبیاتی خدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اب تک انسٹی ٹیوٹ نے غالب کے علاوہ کلاسیکی ادب، تاریخ، ثقافت اور فارسی ادبیات پر تقریباً 300 کتابیں شائع کرچکا ہے۔ اتراکھنڈ کے گورنر عزیز قریشی نے اردو والوں کو بلا کسی خوف اور تردد کے اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کرنے کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا کہ جو تنظیم کوشاں رہتی ہے وہی اپنے حقوق حاصل کرپاتی ہے۔ انھوں نے غالب انسٹی ٹیوٹ کی پرانی یادوں کا تذکرہ کرتے ہوئے سابق صدر جمہوریہ فخر الدین علی، ان کی اہلیہ اور ان سے وابستہ افراد کو خراج تحسین پیش کیا۔ پروگرام کے اخیر میں شاہد ماہلی نے تمام شرکا اور مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی 24 اگست 2013

رسم اجرا:

'وسط ہند میں اردو ادب' کا اجرا

بھوپال: ادبی نقطہ نظر سے اردو زبان و ادب کے محاذ پر بھوپال کی خدمات کا بھرپور احاطہ کرنے والی کتاب 'وسط ہند میں اردو ادب' کا اجرا کرتے ہوئے قومی اردو کونسل کے سربراہ ڈاکٹر خواجہ اکرام نے کہا کہ یہ کتاب وقت کی

مہتاب عالم کی کتاب 'وسط ہند میں اردو ادب' کے اجرا کا منظر

اہم ضرورت تھی۔ انھوں نے ڈاکٹر مہتاب عالم کو ان کی اس کوشش پر مبارکباد پیش کی اور کہا کہ دو جلدوں پر مشتمل اس کتاب میں انھوں نے 11 سو سے زیادہ شاعروں کے چیدہ چیدہ کلام کو جمع کرکے ایک محنت طلب کام کو بڑے احسن طریقے سے انجام دیا ہے اور یہ پہلا موقع ہے کہ دکن اور شمال کے درمیان کی اردو دنیا کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ قومی اردو کونسل کے تعاون سے شائع اس کتاب کے عنوان کے تحت ہی سیمینار کا بھی 'ہم ایک ہیں' نامی تنظیم کے تحت اہتمام کیا گیا تھا۔ سیمینار میں ڈاکٹر ایس ایم شکیل، ضیا فاروقی، ڈاکٹر سیفی سرونجی، ڈاکٹر مختار شمیم اور ڈاکٹر کرشمہ پردھان نے مقالے پیش کیے۔ سیمینار کی صدارت پروفیسر آفاق احمد نے کی۔ تنظیم 'ہم ایک ہیں' کے چیئرمین منظر بھوپالی نے اس کوشش کو خوش آئند قرار دیا۔ اس موقعے پر مختلف شعبہ ہائے زندگی کے دس نمائندوں کو اعزازات سے بھی نوازا گیا۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 21 اگست 2013

اسرارِ کشف صوفیہ

رامپور: سید محمد کمال واسطی کی تصنیف اسرار یہ کشف صوفیہ کا رسم اجرا رامپور رضا لائبریری کے خیابانِ رضا میں پیر طریقت صوفی سید ساجد علی صابری کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ تقریب میں مہمان خصوصی کی حیثیت

سے پروفیسر سید عراق رضا زیدی صدر شعبہ فارسی جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی موجود تھے۔ اس موقعے پر قزاقستان سے تشریف لائی ہوئی اسکالر ڈاکٹر غالیہ نے کہا کہ یہ کتاب اہل صوفیا اور اہل ذوق کے علاوہ ان لوگوں کے لیے بھی اہم کتاب ہے جو تحقیق کے میدان میں کام کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ قزاقستان کے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ بھی اپنے دور کے جید صوفی مانے جاتے ہیں۔ رضا لائبریری کے ڈائرکٹر سید محمد عزیز ہمدانی نے اسرار یہ کشف صوفیہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے کہا 904 صفحات پر مشتمل یہ کتاب صوفیا کرام کی بایوگرافی ہے۔ انھوں نے اس کام کو محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے بعد اہم کارنامہ قرار دیا۔ کتاب کے مترجم ڈاکٹر مصباح احمد صدیقی نے کہا کہ تقریباً 10 سالوں سے میں اس پر کام کر رہا تھا۔ انھوں نے اس کتاب کی تیاری اور جدوجہد کے لیے نثار احمد فاروقی اور رضا لائبریری کے سابق او ایس ڈی وقار الحسن صدیقی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ مرحومین نے ذاتی کاوشوں کے سبب ہی میں اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں کامیاب ہو سکا ہوں۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 2 ستمبر 2013

عرفانیات

ٹانڈہ، امبیڈکر نگر: آغاز کوچنگ سینٹر کے تحت محلہ سکرول میں چوتھی سالانہ ادبی نشست امام عیدگاہ مولانا مختار احمد صابری کی صدارت اور شمشاد منظری کی نظامت میں ہوئی۔ اس موقعے پر اطہر عبداللہ ٹانڈوی کے نعتیہ مجموعہ کلام 'عرفانیات' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ سینٹر کے ڈائریکٹر اعظم ذکریا نے بتایا کہ غریب طلبا کو یہاں مقابلہ جاتی امتحان اور یونیورسٹی میں داخلہ امتحان کی تیاری مفت کرائی جاتی ہے۔ فروغ اردو کے تحت اردو کی تعلیم کے ساتھ ہر برس مقامی شعرا کی ایک ادبی نشست بھی ہوتی ہے۔ پروگرام کے اختتام پر انجینئر افروز انصاری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ شعری نشست میں عتیق ٹانڈوی، مختار منظری، شمساد منظری، اطہر ٹانڈوی، انصاف ٹانڈوی، صوفی ٹانڈوی، کوثر ٹانڈوی، شرافت ٹانڈوی، احمد شبل، انعام اللہ انعام، عامل اشرف، اختر عالم، سعید ٹانڈوی وغیرہ نے اپنا کلام پیش کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 16 اگست 2013

وفیات

اردو ہندی کے ادیب احمد ہمیش کا انتقال

کراچی: برصغیر کے ممتاز افسانہ نگار اور اعلیٰ درجے کے شاعر احمد ہمیش کا 8 ستمبر کی رات یہاں انتقال ہوگیا۔ وہ 76 برس کے تھے۔ انھیں جگر کے سرطان کا عارضہ لاحق

تھا۔ احمد ہمیش ایک سے زیادہ نثر اور منظوم کتابوں کے خالق تھے۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'مکھی' 1962 میں منظرعام پر آیا۔ اسی سال ان کی پہلی نظم بھی لاہور کے جریدے 'نصرت' میں شائع ہوئی تھی۔ نظم ونثر دونوں میں وہ ہمیشہ ماضی گرفتہ نظر آئے۔ 2005 میں اپنی تخلیق 'ہمیش نظمیں' کی اشاعت کے ذریعے انھوں نے خود کو پوری طرح منوالیا۔ 1998 میں 'کہانی مجھے لکھتی ہے' کے نام سے ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ سامنے آیا۔ انھوں نے اردو کے علاوہ ہندی میں بھی لکھا اور ان کی تحریریں ہندوستان کے ہندی پرچوں میں باقاعدگی سے شائع ہوتی رہیں۔ پاکستان میں وہ ہندی زبان کے واحد اردو ادیب تھے۔ مرحوم رابندر ناتھ ٹیگور کے اس قدر گرویدہ تھے کہ ایک موقعے پر انھوں نے نوبل انعام کے لیے ٹیگور کے انتخاب اور علامہ اقبال کو نظرانداز کیے جانے کا معاملہ یہ کہہ کر ختم کردیا تھا کہ ٹیگور کا کینوس بڑا تھا۔ غیر منقسم ہندوستان میں یکم جولائی 1937 کو اترپردیش کے بانس پور میں پیدا ہونے والے احمد ہمیش جب دس سال کے تھے تو ان کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا۔ سوتیلی ماں نے مبینہ طور پر اس قدر ستایا کہ وہ گھر سے فرار ہوکر 1955 میں لاہور (پاکستان) پہنچ گئے۔ احمد ہمیش نے اسکول کے زمانے سے ہی شاعری شروع کردی تھی۔ وہ نظم ونثر دونوں میں ہمیشہ ماضی گرفتہ نظر آئے۔

روزنامہ 'جدید خبر' دہلی، 10 ستمبر 2013

پروفیسر لطف الرحمان کا انتقال پر ملال

بھاگلپور: بہار کے سابق ریاستی وزیر اور اردو کے ممتاز شاعر نقاد پروفیسر لطف الرحمٰن کو 1 ستمبر 2013 بروز اتوار کی شام ہزاروں سوگواروں کی موجودگی میں

سپرد خاک کردیا گیا۔ ان کی نماز جنازہ بعد نماز مغرب تاتار پور مسجد کے قریب ادا کی گئی اور بھیکن پور قبرستان میں تدفین عمل میں آئی وزیراعلیٰ نتیش کمار اور قانون ساز کونسل کے ڈپٹی چیئرمین سلیم پرویز نے پروفیسر لطف الرحمٰن کے انتقال پر گہرے رنج وغم کا اظہار کیا ہے۔ اپنے تعزیتی پیغام میں انھوں نے کہا کہ وہ مشہور عوامی رہنما اور گہری بصیرت رکھنے والے سیاسی لیڈر تھے۔ ان کے انتقال سے نہ صرف سماجی بلکہ سیاسی حلقوں میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے۔ وزیراعلیٰ نے مصیبت کی اس گھڑی میں ان کے اہل خانہ کو تعزیت پیش کیا اور ان کی روح کی تسکین کے لیے دعا کی ہے۔ پروفیسر لطف الرحمٰن کا ہفتہ کی شب انتقال ہوگیا۔ وہ 73 سال کے تھے۔ اطلاع کے مطابق 31 اگست 2013 کی شام چار بجے اچانک ان کی طبیعت خراب ہوگئی اور انھیں الٹی ہونے لگی، الٹی کے ساتھ خون دیکھ کر گھر والوں نے علاج کے لیے ڈاکٹر بی پی مشرا کو بلایا۔ ڈاکٹر نے انھیں میڈیکل کالج ریفر کردیا رات قریب دس بج کر 35 منٹ پر اسپتال لے جانے کے دوران وہ انتقال کرگئے۔ انتقال کی خبر سنتے ہی ادبی اور سیاسی حلقے میں مایوسی اور غم کی لہر دوڑ گئی۔ ان کے انتقال کی خبر سن کر سیاسی اور سماجی اور ادبی حلقے سے تعلق رکھنے والوں کی بھیڑ جمع ہوگئی۔ مرحوم پروفیسر لطف الرحمٰن کی پیدائش 1941 میں دربھنگہ ضلع کے جالے تھانہ میں ریونڈھا میں ہوئی تھی وہ بھاگل پور یونیورسٹی کے اردو کے شعبہ صدر بھی رہے تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 2 ستمبر 2013

شفیع عقیل

کراچی: پاکستان کے اردو اور پنجابی کے ممتاز ادیب، شاعر، نقاد اور دانشور شفیع عقیل 6 ستمبر کی شب کراچی میں انتقال کرگئے۔ شفیع عقیل کا اصلی نام محمد شفیع تھا اور وہ 1930

میں لاہور چھاؤنی کے ایک گاؤں تھینہ میں پیدا ہوئے تھے۔ 1950 میں وہ کراچی منتقل ہوگئے جہاں وہ روزنامہ جنگ سے وابستہ ہوئے اور پھر انھوں نے تمام عمر اسی ادارے میں گزاردی۔ وہ بچوں کے ماہنامے بھائی جان کے مدیر مقرر ہوئے جہاں انھوں نے بہت سے اہم لکھنے والوں کو متعارف کروایا۔ شفیع عقیل کی پہلی کتاب افسانوں کا مجموعہ 'بھوکے' تھا۔ اس کے علاوہ ان کی تصانیف میں طنز ومزاح کے مجموعے ایک آنسو ایک تبسم، ڈھل گئی رات، تیغ ستم، باقی سب خیریت ہے اور سرخ، سفید، سیاہ، پنجابی شاعری

کے مجموعے سوچاں دی زنجیر اور زہر پیالہ، عالمی اور پاکستانی لوک کہانیوں کے مجموعے جاپانی لوک حکایتیں، جرمن لوک کہانیاں، ایرانی لوک کہاناں، پاکستانی لوک کہانیاں اور پنجابی لوک داستانیں، سفرنامے سیر وسفر، پیرس تو پھر پیرس ہے اور زندگانی پھر کہاں کے نام شامل ہیں۔ شفیع عقیل مصوری کے اہم نقادوں میں شمار ہوتے تھے۔ اس موضوع پر ان کی تصانیف میں تصویر اور مصور، دو مصور اور پاکستان کے 7 مصور کے نام سرفہرست ہیں۔ انھوں نے مرزا غالب کے کلام اور جناح کے فرمودات کو بھی پنجابی میں منتقل کیا تھا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 8 ستمبر 2013

شاہ امیر اللہ نظامی

بنگلور: کرناٹک کے بزرگ صحافی اور ہفت روزہ نشیمن کے بانی اسسٹنٹ ایڈیٹر جناب شاہ امیر اللہ نظامی 4 ستمبر کو انتقال کر گئے۔ مرحوم کی عمر 83 سال تھی۔ نظامی صاحب مرحوم نے جناب عثمان اسد صاحب مرحوم کے ساتھ ہفت روزہ نشیمن کا آغاز 26 جنوری 1962 میں کیا تھا۔ نظامی صاحب فرد واحد ہیں جنھوں نے نشیمن کو روز اول سے اپنے قلم سے سنبھالا اور اس کی بلاناغہ اشاعت کو جاری رکھا۔ اردو زبان وادب کی ترقی وترویج میں آپ کا رول ناقابل فراموش ہے۔ نشیمن کے تجزیے بے مثال ہوا کرتے تھے۔ صحافتی دنیا میں آپ کو گھوسٹ ایڈیٹر کہا جاتا تھا۔ نظامی صاحب ہمیشہ تشہیر سے دور رہا کرتے تھے۔ کبھی آپ نے خودنمائی کو پسند نہیں کیا۔ ہفت روزہ نشیمن شروع کرنے سے پہلے آپ نے انگریزی اخبار دکن ہیرالڈ اور اردو روزنامہ آزاد کارواں میں بھی کام کیا۔ آپ کی منکسر المزاجی صحافتی دنیا میں مشہور ہے۔ نظامی صاحب کا انتقال صحافتی برادری کا بڑا نقصان ہے جس کو پر کرنا محال ہے۔ ہفت روزہ نشیمن کی اشاعت کی ذمے داری سنبھال رہے عثمان اسد کے فرزند عرفان ایم اے نے بتایا کہ نشیمن کا دوسرا چراغ بھی بجھ گیا۔ نظامی صاحب کا انتقال نشیمن کے لیے بہت بڑا دھکا ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی کہ نشیمن کی اشاعت کو باقی رکھنے کے لیے وہ متبادل راستے تلاش کرلیں گے۔

روزنامہ ’اخبار مشرق‘ دہلی، 5 ستمبر 2013

خراج عقیدت

ڈاکٹر عبدالباری کی یاد میں جلسہ

نئی دھلی: الحکمہ فاؤنڈیشن کے صدر دفتر ذاکر نگر میں ڈاکٹر سید عبدالباری کی رحلت پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا جس میں مختلف تنظیموں سے وابستہ سرکردہ افراد نے شرکت کی اور ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔

(دائیں سے) عبدالمنان، اے یو آصف، ڈاکٹر شکیب اور تابش مہدی

فاؤنڈیشن کے چیئرمین ڈاکٹر ضیاالدین ندوی نے مہمانوں کا استقبال کرنے کے بعد کہا کہ مرحوم ڈاکٹر سید عبدالباری الحکمہ فاؤنڈیشن سے روز اول سے ہی وابستہ تھے اور فاؤنڈیشن کی تعلیمی سرگرمیوں میں ان کی رہنمائی حاصل تھی۔ مرحوم ادارہ ادب اسلامی کے دیرینہ وابستگان میں سے تھے وہ دوام، دوام نو، نئی نسلیں اور پیش رفت جیسے ادبی ماہناموں کی ادارت سے جڑے رہے۔ انھوں نے تقریباً دو درجن کتابیں تصنیف کیں۔ ان کے دو شعری مجموعے فکر انگیز اور طرب خیز مقبولیت حاصل کرچکے ہیں۔ ملی اتحاد کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بسمل عارفی نے ان کی شخصیت پر اجمالی خاکہ پیش کیا۔ یونانی کونسل کے جوائنٹ ڈائرکٹر حکیم عبدالحنان نے کہا کہ وہ انتہائی نیک اور فعال انسان تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے استاد ڈاکٹر شکیل حبیبی نے بتایا کہ مشہور تعلیمی ادارہ جامعۃ الفلاح کا ترانہ مرحوم سید عبدالباری (شبنم سبحانی) نے ہی لکھا تھا۔ ماہنامہ صلاح کار کے ایڈیٹر حامد علی اختر نے کہا کہ مرحوم کے قول وفعل میں کوئی تضاد نہیں تھا۔ حکیم شفقت اعظمی نے کہا کہ اردو زبان و ادب پر مرحوم کو قدرت حاصل تھی۔ جماعت اسلامی کے نمائندہ ڈاکٹر رضی الاسلام ندوی نے کہا کہ مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا اس پر اپنی آخری سانس تک عمل کرتے رہے۔ مشہور شاعر ڈاکٹر تابش مہدی نے آبدیدہ ہوتے ہوئے کہا کہ مرحوم اقامت دین کے مسافر تھے۔ اس موقعے پر مرحوم کے بڑے بیٹے ڈاکٹر شکیب ارسلان نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ معروف صحافی اور الحکمہ فاؤنڈیشن کے وائس چیئرمین اے یو آصف نے اپنے صدارتی کلمات میں ان کی تصنیف اسمائے حسنیٰ اور انسان سازی کا خاص طور سے ذکر کرتے ہوئے اسے ایک معرکۃ الآرا کتاب بتایا۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 9 ستمبر 2013

فرمان فتح پوری

ساگر: مورخہ 22 اگست 2013 بروز جمعرات ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر، مدھیہ پردیش کے شعبۂ اردو میں اردو کے مشہور ادیب اور معروف عالم ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے سانحۂ ارتحال پر ایک تعزیتی نشست کا انعقاد کیا گیا۔ اس موقع پر پروفیسر فداء المصطفیٰ فدوی نے اپنے خطاب میں ان کی رحلت کو اردو کا ایک ناقابل تلافی نقصان قرار دیا اور ان کے علمی وادبی اور صحافتی کارناموں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مرحوم اردو کے ان گنے چنے ناقدوں میں سے تھے جنھوں نے اردو تحقیق وتنقید کے ذخیرے میں قابل قدر اضافہ کیا۔ شعبے کے دیگر اساتذہ ڈاکٹر محمد صفوان صفوی، ڈاکٹر وسیم انور اور ڈاکٹر افضل مصباحی نے بھی مرحوم سے اپنی عقیدتمندی کا اظہار کیا اور ان کی موت کو اردو والوں کے لیے سانحہ عظیم قرار دیا۔

منالال رجک، شعبہ اردو ڈاکٹر ہری سنگھ گور سنٹرل یونیورسٹی، ساگر 22 اگست 2013

شاہ عبدالسلام کی یاد میں تعزیتی جلسہ

لکھنؤ: شاہ عبدالسلام کی شکل میں اردو کا آخری محقق چلا گیا وہ چلتا پھرتا کتب خانہ اور لکھنؤ یونیورسٹی کے کتب خانے کی تاریخ تھے۔ ان خیالات کا اظہار مسیحا اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام یوپی پریس کلب میں پروفیسر شاہ عبدالسلام

مسیحا اردو سوسائٹی کے زیر اہتمام منعقدہ پروگرام کا ایک منظر

کی یاد میں منعد تعزیتی جلسے کے دوران علم و تحقیق سے وابستہ شخصیات اور شاہ عبدالسلام کے شاگردوں اور احباب نے کیا۔ ظفریاب جیلانی نے شاہ عبدالسلام کی اصول پسندی اور ان کے اوصاف حسنہ کا ذکر کیا۔ اس موقعے پر جھارکھنڈ کے گورنر ڈاکٹر سید احمد کا تعزیتی پیغام بھی موصول ہوا جنھوں نے اہل خانہ سے اپنے دیرینہ تعلق کی بنا پر رنج وغم اور ہمدردی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ ایک عظیم اسکالر تھے۔ تعزیتی جلسہ کی نظامت ڈاکٹر عمیر منظر نے کی جب کہ سوسائٹی کے سکریٹری ڈاکٹر مسیح الدین خاں مسیح نے شکریہ ادا کیا۔ پروفیسر انیس اشفاق نے کہا کہ شاہ صاحب کے جانے سے اردو تحقیق کا نقصان ہوا ہے۔ اس موقعے پر اکادمی کے سکریٹری ایس رضوان کا تعزیتی پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا۔ اطہر نبی نے کہا کہ شاہ عبدالسلام صاحب طالب علمی کے زمانے سے ہی سرگرم رہے ہیں۔ عبدالقدوس قادری نے انھیں بالغ نظر نقاد، شاعر اور اعلیٰ ظرف انسان قرار دیا۔ عامر صدیقی نے کہا کہ وہ اپنے چھوٹوں کا بھی بہت خیال کرتے تھے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 2 ستمبر 2013

■